سلسلۂ نصابات علمیہ جامعۂ عثمانیہ

حکایت فلسفہ

تصنیف

ول ڈوران، پی-ایچ-ڈی

ترجمہ

مولوی احسان احمد صاحب بی-اے

رکن سررشتۂ تالیف و ترجمہ جامعۂ عثمانیہ سرکار عالی

سنہ ۱۳۶۱ھ م سنہ ۱۳۵۱ف م سنہ ۱۹۴۲ء

دار الطبع جامعۂ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن

فہرست مضامین

حکایت فلسفہ

صفحات	مضمون	ابواب
۱ تا ۷	فلسفے کے فوائد	(مقدمہ)
۸ تا ۷۳	فلاطون	باب ۱
۷۴ تا ۱۲۹	ارسطو اور یونانی حکمت	باب ۲
۱۳۰ تا ۱۸۸	فرینسس بیکن: ارسطو سے احیائے علمی تک	باب ۳
۱۸۹ تا ۲۵۵	اسپی نوزا	باب ۴
۲۵۶ تا ۳۲۱	والٹیر اور فرانسیسی روشن خیالی	باب ۵
۳۳۲ تا ۳۸۰	ایمنیول کانٹ اور جرمن تصوریت	باب ۶
۳۸۱ تا ۴۴۲	شوپنہائر	باب ۷
۴۴۳ تا ۵۰۶	ہربرٹ اسپنسر	باب ۸
۵۰۷ تا ۵۶۸	فریڈرک نیٹشے	باب ۹
۵۶۹ تا ۶۱۹	معاصر یورپی فلاسفہ: برگساں، کروچے، برٹرانڈ رسل	باب ۱۰
۶۲۰ تا ۶۷۴ ختم	معاصر امریکی فلاسفہ	باب ۱۱
۱ تا ۲	فہرست اصطلاحات	

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حکایت فلسفہ

مقدمہ

فلسفے کے فوائد

فلسفے میں ایک لذت ہے، اور مابعد الطبیعیات کے سرابوں تک میں بھی ایک دل آویزی ہے جو ہر طالب علم کو اس وقت تک محسوس ہوتی ہے جب تک کہ جسمی زندگی کی ادنیٰ ضروریات اس کو فکر کی بلندیوں سے معاشی کشمکش و سود کے بازار میں کھینچ کر نہیں لے آتیں۔ ہم میں سے اکثر کو عنفوان شباب میں بعض ایسے زرین ایام کا تجربہ ہوتا ہے، جب فلسفہ درحقیقت بقول افلاطون "عزیز دلچسپی" کی حیثیت رکھتا تھا، شرم آگین اور گریز پا صداقت کی محبت جسمانی ہوا و ہوس اور دنیا کی گندگی کے مقابلے میں بہت زیادہ شاندار معلوم ہوتی تھی۔ حکمت کے اس ابتدائی عشق کی ہم میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ یادگار باقی رہتی ہے۔ براؤننگ کے ساتھ ہم یہ محسوس کرتے ہیں، کہ زندگی معنی رکھتی ہے" اس کے معنی کو دریافت کرنا ہی میرا کھانا اور پینا ہے"۔ ہماری زندگیوں کا اس قدر حصہ بے معنی یعنی بے صرفہ تذبذب اور بے کاری ہے۔ اپنے گرد و پیش اور اپنے اندر جو ابتری ہم پاتے ہیں، اس سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتے ہیں، مگر اس

اثنا میں ہم یہ یقین رکھتے ہیں کہ ہم میں کوئی شے اہم اور بامعنے ہے۔ کاش کہ ہم صرف اپنی روحوں کو پڑھ سکتے۔ ہم سمجھنا چاہتے ہیں۔ زندگی کے معنے ہمارے لیے ہر آن جو کچھ ہم ہوتے ہیں یا جس کسی شے سے ملتے ہیں، اس کو روشنی اور شعلے کے اندر بدلنے کے ہیں[۱]۔ ہماری حالت "دی برادرس کرمازوف" کی مٹیا کی سی ہوتی ہے، یعنے ہم ان لوگوں میں سے ہوتے ہیں جو لکھوکھا روپے نہیں، بلکہ صرف اپنے سوالات کے جواب چاہتے ہیں ہم گزرنے والی چیزوں کے معنے اور تناظر کو سمجھنا اور اس طرح سے اپنے آپ کو روزمرہ کے حالات کے گرداب سے نکالنا چاہتے ہیں۔ ہم اس کے پہلے کہ بہت دیر ہو یہ جاننا چاہتے ہیں کہ چھوٹی چیزیں چھوٹی ہیں، اور بڑی چیزیں بڑی ہیں، ہم اشیاء کو اس وقت اس طرح سے دیکھنا چاہتے ہیں، جیسی کہ یہ ہمیشہ ہمیشہ نظر آئیں گی ——— یعنے ہم ان کو ابد کی روشنی میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم یہ سیکھنا چاہتے ہیں، کہ جس شے کا وقوع اٹل ہو، اس کے سامنے کیونکر ہنستے ہیں، موت جو دور سے بہت بھیانک معلوم ہوتی ہے، اس پر کیونکر ۲
مسکراتے ہیں۔ ہم کل بننا چاہتے ہیں، اور اپنی خواہشوں پر نکتہ چینی کرکے اور ان میں ہمنوائی پیدا کرکے اپنی توانائیوں کی تنظیم کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ منظم توانائی اخلاقیات سیاسیات اور شاید منطق و مابعد الطبیعیات میں بھی آخری لفظ ہے تھورو (Thoreau) نے کہا ہے، کہ فلسفی ہونے کے معنے محض افکار لطیف رکھنے کے نہیں ہیں، اور نہ کسی مذہب کے بانی ہونے کے ہیں، بلکہ فلسفی ہونے کے معنے حکمت کو اس طرح سے عزیز رکھنے کے ہیں، کہ اس کے احکام کے مطابق سادگی، آزادی بلند حوصلگی اور اعتماد کی زندگی گزاری جائے۔ ہم کو یہ یقین رکھنا چاہئے، کہ اگر ہم حکمت کو حاصل کر سکیں، تو اور تمام چیزیں اس کے ساتھ جمع ہو جائیں گی۔ لیکن ہمیں نصیحت کرتا ہے کہ "پہلے تم ذہنی محاسن حاصل کرو اور باقی یا تو ان کے ساتھ آجائیں گے، یا ان کی

[۱] نیٹشے حکمت مسرور، دیباچہ۔

کمی محسوس نہ ہو گی۔[1] صداقت ہم کو دولت مند تو نہ بنائے گی، مگر یہ ہم کو آزاد ضرور بنا دے گی۔

ممکن ہے کہ کوئی سخت مزاج پڑھنے والا ہم کو یہاں پر روکے اور کہے کہ فلسفہ ایسا ہی بے کار ہے، جیسی کہ شطرنج اور اسی قدر تاریک ہے جیسی کہ جہالت، اور اتنا ہی جامد ہے، جتنی کہ قناعت۔ سسرو نے کہا ہے کہ "ایسی مہمل بات کوئی نہیں ہے، جو فلاسفہ کی کتابوں میں نہ مل سکتی ہو۔" اس میں شک نہیں کہ بعض فلاسفہ عقل سلیم کے علاوہ اور ہر قسم کی حکمت رکھتے تھے۔ اور بہت سی پروازیں محض لطیف ہوائی بلند کن قوت پر مبنی رہی ہیں۔ ہمیں اپنے اس سفر کے متعلق یہ طے کر لینا چاہئے، کہ ہم صرف روشن بندرگاہوں میں اتریں گے، اور مابعد الطبیعیات کے گدلے چشموں اور مذہبی مناقشے کے پرشور سمندروں سے دور رہیں گے۔ لیکن کیا فلسفہ ساکن ہے۔ حکمت ہمیشہ بڑھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، برخلاف اس کے فلسفہ ہمیشہ پیچھے ہٹتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ فلسفہ ایسے مسائل پر بحث کرنے کے دشوار اور پرخطر کام کو اپنے ذمے لے لیتا ہے، جو ہنوز حکمت کے طریقوں کی گرفت سے باہر ہیں، مثلاً خیر و شر، حسن و قبح، جبر و قدر، حیات و موت۔ جیسے ہی ایک میدان تحقیق میں ایسا علم دستیاب ہوتا ہے جس کو قطعی طور پر مدون کر سکتے ہیں، یہ حکمت کہلانے لگتا ہے۔ ہر حکمت کا آغاز فلسفے کی حیثیت سے ہوتا ہے، اور انجام فن کی حیثیت سے۔ یہ مفروضے کے اندر عالم وجود میں آتی ہے، اور عمل میں یہ نکلتی ہے۔ فلسفہ نامعلوم (جیسے کہ مابعد الطبیعیات ہے) یا نامکمل معلوم کی (جیسے کہ اخلاقیات یا سیاسی فلسفہ ہیں) ایک افتراضی تعبیر ہے۔ صداقت کے محاصرے کی یہ سامنے کی خندق ہے۔ حکمت تو وہ علاقہ ہے، جس پر قبضہ ہو چکا ہے۔ اس کے عقب میں وہ

---

[1] De Augmentis Scientiarum viii,2.

محفوظ علاقے ہیں، جن میں علم و فن ہماری غیر مکمل مگر ناقص دنیا تعمیر کرتے ہیں۔
۳ فلسفہ ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ خاموش اور پریشان کھڑا ہے۔ مگر اس کی وجہ صرف یہ ہے، کہ یہ اپنی فتح کے ثمرات اپنی بیٹیوں یعنے حکمتوں کو دے کر ایسے شخص کی طرح سے جس کے مقدر ہی میں غیر مطمئن رہنا لکھا ہو، غیر یقینی اور غیر تحقیق شدہ کی طرف بڑھ جاتا ہے۔

کیا ہم زیادہ اصطلاحی گفتگو کریں گے؟ حکمت تحلیلی بیان ہے۔ فلسفہ ترکیبی تعمیر ہے۔ حکمت کل کو اجزا میں تحویل کرنا چاہتی ہے، عضویہ کو اعضا میں نامعلوم کو معلوم میں۔ یہ اشیاء کی قیمتوں اور ان کے تصوری امکانات کے متعلق، تحقیق نہیں کرتی، اور نہ یہ ان کے کامل اور آخری معنے کی تحقیق کرتی ہے۔ یہ ان کی موجودہ واقعیت اور عمل کے ظاہر کرنے پر قناعت کرتی ہے۔ یہ دیدہٗ دانستہ اپنی نظر کو محدود کرکے صرف فطرت اور عمل اشیاء کو (جیسے کہ یہ ہیں) دیکھتی ہے۔ حکیم اتنا ہی غیر جانب دار ہوتا ہے جتنا کہ (Turgenev) کی نظم میں فطرت کو غیر جانب دار قرار دیا گیا ہے۔ اس کو پسو کی ٹانگ سے اتنی ہی دلچسپی ہوتی ہے، جتنی کہ ایک طباع کے تخلیقی کرب سے۔ لیکن فلسفی واقعے کے بیان کرنے پر قناعت نہیں کرتا۔ وہ یہ تحقیق کرنا چاہتا ہے کہ اس کا عام طور پر تجربے سے کیا تعلق ہے، اور اس طرح سے وہ اس کے معنے اور اس کی قدر و قیمت تک پہنچنا چاہتا ہے۔ وہ اشیاء کو تعبیری ترکیب میں مربوط کرنا چاہتا ہے۔ وہ کائنات کی اس عظیم الشان گھڑی کو پہلے سے بہتر طریق پر جوڑنا چاہتا ہے، جس کو متجسس حکیم نے تحلیلی طور پر علٰحدہ علٰحدہ کردیا ہے۔ حکمت ہم کو اچھا کرنا اور مارنا سکھاتی ہے۔ یہ ایک ایک کرکے موت کی شرح کو کم کرتی ہے اور جنگ میں ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں مار ڈالتی ہے۔ لیکن صرف فراست (یعنے کل تجربے کی روشنی میں مرتب خواہش) ہم کو بتا سکتی ہے کہ کس وقت اچھا کیا جائے اور کس وقت مارا جائے۔ اعمال کا مشاہدہ کرنا، اور وسائل کا مہیا کرنا حکمت ہے، جانچنا اور غایات کو مرتب کرنا

وسائل و آلات ہمارے
فلسفہ ہے۔ اور چونکہ ان دنوں میں ہمارے وسائل و آلات ہمارے
نصب العینوں اور غایات کی تعبیر و ترکیب کے مقابلے میں بہت زیادہ
بڑھ گئے ہیں اس لیے ہماری زندگی ایسے جوش و خروش سے بھری ہوتی
ہے جس کے کچھ بھی معنے نہیں ہیں۔ کیونکہ ایک واقعہ خواہش کی نسبت کے بغیر
کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ ایک منشاء اور ایک کل کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ حکمت فلسفے
کے بغیر واقعات تناظر اور پرکھ کے بغیر ہم کو تباہی اور مایوسی سے نہیں بچا سکتے۔
حکمت ہم کو علم دے سکتی ہے، لیکن فراست و دانائی صرف فلسفے سے حاصل
ہو سکتی ہے۔

خصوصیت کے ساتھ فلسفے کے معنے پانچ قسم کی بحثوں کے ہیں اور
۴ اس کے اندر پانچ علوم کا مطالعہ داخل ہے۔ منطق جمالیات اخلاقیات سیاسیات
اور ما بعد الطبیعیات۔ منطق فکر و تحقیق کے معیاری طریقے کا مطالعہ ہے مشاہدہ
اور تامل استخراج و استقراء اور مفروضہ اور اختبار تحلیل و ترکیب یہ انسانی
فعلیت کی وہ صورتیں ہیں جن سے منطق سمجھنے اور رہبری کرنے کی کوشش
کرتی ہے۔ یہ ہم میں سے اکثر کے لیئے ایک غیر دلچسپ مطالعہ ہوتا ہے،
مگر تاریخ فکر میں وہ اصلاحیں بہت بلند مرتبہ رکھتی ہیں، جو انسانوں نے
اپنے فکر و تحقیق کے طریقوں میں کی ہیں۔ جمالیات معیاری صورت و شکل یا
حسن کا مطالعہ ہے۔ یہ فلسفۂ صناعت ہے۔ اخلاقیات معیاری کردار کا
مطالعہ ہے۔ سقراط نے کہا تھا کہ بلند ترین علم خیر و شر یا حکمت زندگی کا علم
ہے۔ سیاسیات معیاری معاشری تنظیم کا علم ہے۔ (یہ عہدے حاصل کرنے اور
اس کے باقی رکھنے کا علم نہیں جیسا کہ کوئی فرض کر سکتا ہے) بادشاہی حکومت
امرا جمہوریت اشتراکیت نراج، اور حکومت نسواں یہ سیاسی فلسفے کے
اشخاص تمثیل ہیں۔ سب سے آخر میں ما بعد الطبیعیات ہے (جس کو بہت کچھ
دشواری اٹھانی پڑتی ہے کیونکہ یہ فلسفے کی دوسری شکلوں کی طرح سے
یعنے حقیقی کو معیاری کی روشنی میں مرتب کرنے کی کوشش نہیں ہے۔)
یہ تمام چیزوں میں حقیقت اصلی کے مطالعہ کرنے کا علم ہے۔ مادے کی

حقیقی اور اصلی ماہیت کا علم (وجودیات) ذہن کی حقیقت اصلی معلوم کرنے کا علم
(فلسفی نفسیات) اور ذہن و مادّے کے باہمی تعلق کا علم جو ادراک اور علم
کے اعمال میں ہوتا ہے (علمیات)۔

یہ فلسفے کے حصے ہیں لیکن اس طرح سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اس کا
حسن اور اس کی دلچسپی زائل ہو جاتی ہے۔ ہم اس کو اس کی سکڑی ہوئی تجرید
میں یا اس کو جسم بے لباس میں تلاش نہیں کریں گے۔ بلکہ ہم اس کا
ملبوس حالت میں اور ایک جیتے جاگتے طباع کی شکل میں مطالعہ کریں گے
یعنے ہم محض فلسفوں ہی کا مطالعہ نہ کریں گے، بلکہ فلاسفہ کا بھی مطالعہ کریں گے۔
ہم اپنا وقت فکر کے اولیا اور شہدا کے ساتھ گزاریں گے۔ ہم ان کی
شگفتہ روحوں کو اپنے گرد و پیش جولانیاں دکھلانے دیں گے یہاں تک
ہم بھی بہ الفاظ لیونارڈو اس شریف ترین لذت یعنے لذت فہم میں
شریک ہو جائیں گے۔ ان فلاسفہ میں سے ہر ایک اگر اس تک
مناسب طور سے پہنچیں ہم کو ایک درس دیتا ہے۔ ایمرسن کہتا ہے کیا
تم جانتے ہو کہ حقیقی طالب علم کا راز کیا ہے۔ ہر شخص کے اندر کچھ نہ کچھ
بات ہوتی ہے، جو میں اس سے حاصل کر سکتا ہوں، اور اس بات میں
اس کا شاگرد ہو جاتا ہوں، یہ انداز ہم تاریخ کے اکابر اذہان کے متعلق
اپنے غرور کو مجروح کیے بغیر یقیناً اختیار کر سکتے ہیں۔ اور ہم ایمرسن کے ۵
دوسرے خیال سے بھی اپنے دل کو خوش کر سکتے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ جب
ایک طباع ہم سے ہم کلام ہوتا ہے تو ہم کو ایک دھندلی سی یاد اس امر
کی آتی ہے کہ بہت عرصہ ہوا اپنے عالم جوانی میں، ہم نے بھی اسی خیال کو
محسوس کیا تھا جس کا طباع اب ذکر کرتا ہے، لیکن جس کو صورت اور
الفاظ کا جامہ پہنانے کا نہ تو ہم میں ہنر تھا اور نہ جرأت تھی۔ اور اس
میں شک نہیں کہ بڑے آدمی ہم سے صرف اس حد تک بولتے ہیں جس
حد تک ہم ان کے سننے کے لیے کان اور روح رکھتے ہیں۔ صرف اس حد تک
جس حد تک ہم میں کم از کم اس چیز کی جڑیں ہوتی ہیں، جو ان میں پھولتی

ہے، ہم کو بھی وہی تجربات ہو چکے ہیں، جو ان کو ہوئے ہیں۔ لیکن ہم نے ان تجربات سے ان کے مخفی اور باریک معنے کو کلیتہً چوس نہیں لیا تھا۔ ہم کو حقیقت کی ان زائد سریتوں کی حس نہ تھی، جو ہمارے گرد و پیش بج رہی تھیں۔ طباع زائد سریتوں اور سیاروں کے نغموں کو سنتا ہے۔ طباع جانتا ہے کہ فیثاغورث کی اس وقت کیا مراد تھی، جب اس نے یہ کہا تھا کہ فلسفہ سب سے اعلیٰ درجے کا نغمہ ہے۔

پس آؤ ان لوگوں کی باتیں سنیں اور ان کی اتفاقی لغزشوں سے چشم پوشی کرنے پر تیار رہیں، اور ذوق شوق کے ساتھ ان اسباق کو حاصل کریں، جن کی تعلیم دینے کے لیے وہ بھی بے حد مشتاق ہیں۔ بوڑھے سقراط نے کراٹیلو سے کہا تھا کہ "تم معقول بن جاؤ، اور اس امر کی پروا نہ کرو کہ فلسفے کے معلم اچھے ہیں یا برے، بلکہ خود فلسفے کا خیال کرو۔ اس کو خوب غور سے دیکھو، اگر وہ برا ہو تو اس امر کی کوشش کرو، کہ جو لوگ اس کی طرف آرہے ہیں، وہ واپس ہو جائیں۔ لیکن اگر وہ ایسا ہو، جیسا کہ میں اس کو سمجھتا ہوں" تو اس پر عمل کرو اس کی خدمت کرو، اور دل کو مضبوط رکھو"!

باب ۱

فلاطون

۱۔ سباق فلاطون

اگر تم یورپ کے نقشے پر نظر ڈالو تو تم دیکھو گے، کہ یونان کی شکل ایک انسانی ڈھانچے کے ہاتھ کی سی ہے، جس نے اپنی مڑی ہوئی انگلیاں بحیرۂ روم میں پھیلا رکھی ہیں۔ اس کے جنوب میں ایک بڑا جزیرہ کریٹ ہے۔ اسی سے ان انگلیوں نے مسیحؑ سے دو ہزار سال پہلے تہذیب و تمدن کے مبادی کو تسخیر کیا تھا۔ مشرق کی طرف بحیرۂ مارمورا کے پار ایشیائے کوچک ہے، جس پر اس وقت سکون و جمود طاری ہے، مگر جس میں فلاطون سے پیشتر کے زمانے میں صنعت و حرفت تجارت اور علم کی ہل چل تھی۔ مغرب کی طرف بحر ایڈریاٹک کے پار اٹلی ایک جھکے ہوئے مینارے کی طرح سے سمندر میں واقع ہے، اور سسلی اور اسپین بھی یہ سب اس زمانے میں یونانیوں کی مرفہ الحال نو آبادیاں تھیں۔ آخر میں ہرقل کے ستون ہیں (جس کو اب ہم جبل الطارق کہتے ہیں) یہ وہ مہیب پھاٹک ہے جس میں سے

قدیم زمانے کے بہت کم جہاز راں گزرنے کی جرأت کر سکتے تھے۔ اور شمال کی طرف وہ غیر مانوس اور نیم وحشی علاقے ہیں جن کا اس وقت تھسلی ایپرس اور مقدونیہ نام تھا جہاں سے یا جہاں سے ہو کر وہ طاقتور جماعتیں آئی تھیں جن میں ہومر اور پریکلیز کے زمانے کے یونان کے آبا تھے۔

پھر نقشے پر نظر ڈالو۔ تم ساحل میں بے شمار کٹاؤ اور ابھار پاؤگے۔ ہر جگہ خلیجیں اور کھاڑیاں ہیں، ہر جگہ سمندر ساحل میں مداخلت کر رہا ہے۔ خشکی اور تری کے ان قدرتی مواقع کی بنا پر یونان الگ الگ ٹکڑوں میں منقسم ہو گیا تھا۔ اس وقت کے مقابلے میں اس زمانے میں سفر اور آمد و رفت کے ذرایع بہت دشوار اور خطرناک تھے۔ لہذا ہر وادی میں اپنی مستقل بالذات معاشری زندگی اپنی علیحدہ فرمانروائی، اپنے ادارے اپنی زبان، اپنا مذہب و تمدن پیدا ہو گئے تھے۔ ہر ریاست میں ایک یا دو شہر تھے، اور ان کے گرد پہاڑوں کی ڈھلانوں پر کاشت ہوتی تھی۔ یوبیا یوکرس ایٹولیا فوکس بیوٹیا ایکیا ارکوس ایلس ارکیڈیا میسینیا لاکونیا مع اپنے اسپارٹا کے اور ایٹیکا مع اپنے ایتھنز کے ایسی ہی شہری ریاستیں تھیں۔

نقشے کی طرف ایک بار پھر دیکھو۔ اور ایتھنز کے محل وقوع پر نظر ڈالو یہ یونان کے شہروں میں سب سے زیادہ مشرق میں واقع ہے۔ یہ اس دروازے کے اعتبار سے اچھی جگہ پر واقع تھا جس میں سے یونانی ایشیائے کوچک کے بقیہ کاروباری شہروں کی طرف جاتے تھے، اور جس میں سے وہ نسبتہً مسن شہر اپنا سامان تعیش اور تمدن نوجوان یونان کو بھیجتے تھے۔ یہ ایک عمدہ بندرگاہ رکھتا تھا جس کا نام پائی رے اس تھا جہاں بے شمار جہازوں کو سمندر کی طوفانی موجوں سے پناہ مل سکتی تھی۔ اور یہ ایک زبردست بیڑہ بھی رکھتا تھا۔

۴۹۰ - ۴۷۰ ق م میں اسپارٹا اور ایتھنز نے اپنی رقابتوں کو فراموش کر کے اپنے لشکروں کو متحد کیا اور ایرانیوں کو جو دارا اور زرکسیز

کی قیادت میں یونان کو ایشیائی سلطنت کی ایک نوآبادی کے اندر بدلنے کے لیے آئے تھے بھگا دیا۔ کمسن یورپ اور مسن مشرق کی اس کشمکش میں اسپارٹا نے فوج مہیا کی اور ایتھنز نے بیڑا۔ جنگ کے ختم ہونے کے بعد اسپارٹا نے اپنی فوج کو منتشر کر دیا، اور اس کی وجہ سے وہاں وہ معاشرتی اختلالات پیدا ہوئے، جو ایسے عمل کا قدرتی نتیجہ ہوتے ہیں۔ برخلاف اس کے ایتھنز نے اپنے جنگی بیڑے کو تجارتی بیڑے میں منتقل کر دیا اور قدیم دنیا کا سب سے بڑا تجارتی شہر ہو گیا۔ اسپارٹا پھر زراعتی مقام ہو کر دنیا سے الگ تھلگ اور جامد ہو گیا۔ مگر ایتھنز ایک سرگرم منڈی اور بندرگاہ بن گیا جہاں انسانوں کی بہت سی نسلیں مختلف مذاہب اور رواجات ملتے تھے، جن کے اتصال و رقابت سے مقابلہ تحلیل اور فکر کی نوبت آتی تھی۔

ایسے مرکزوں میں جہاں اس طرح کے مختلف عناصر یکجا ہوتے ہوں، روایات و اعتقادات ایک دوسرے سے متصادم ہو کر بہت خفیف ہو جاتے ہیں۔ جس جگہ پر ہزارہا مذہب رائج ہوں وہاں ہمارے ان سب پر شک کرنے کا بہت زیادہ قرینہ ہوتا ہے۔ غالباً تاجر سب سے پہلے ارتیابی تھے۔ انھوں نے اس قدر دیکھا تھا کہ وہ اس سب پر یقین نہ رکھ سکتے تھے۔ اور نتیجوں کے اس عام رجحان نے کہ تمام آدمیوں کو بدمعاشوں اور احمقوں میں تقسیم کر دیا جائے، انھیں اس جانب مائل کیا کہ ہر مذہب پر شک کریں۔ رفتہ رفتہ ان میں حکمت ترقی کر رہی تھی۔ ریاضیات تبادلہ روز افزوں پیچیدگی کی بنا پر اور ہئیت جہازرانی کی روز افزوں جرأت کی بدولت عالم وجود میں آئے۔

دولت کی ترقی سے فرصت و اطمینان میسر ہوئے جو تحقیق و تفلسف کے لیے شرط ہیں۔ اب انسانوں نے ستاروں سے صرف سمندروں پر رہنمائی کے لیے نہیں بلکہ کائنات کے عقدوں کے حل کے لیے بھی مشورہ کرنا شروع کیا۔ پہلے یونانی فلسفی ہئیتی تھے۔ ارسطو کہتا ہے کہ اپنی کامیابیوں کے غرور میں لوگوں نے ۹

ایرانی لڑائیوں کے بعد اولوالعزمیاں آئیں ۔ انھوں نے ہر قسم کے علم کو اپنے حلقے کے اندر داخل کیا، اور ہمیشہ وسیع تر مطالعوں کی تلاش کی۔ انسانوں میں اس قدر جرأت پیدا ہوگئی کہ وہ ایسے اعمال و واقعات کی طبعی توجیہات تلاش کرنے لگے، جن کو پہلے فوق الفطری عوامل اور قوتوں سے منسوب کیا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ سحر اور مذہبی رسوم حکمت اور ضبط سے مغلوب ہوئے ۔ اور فلسفے کا آغاز ہوگیا۔

ابتداءً یہ فلسفہ طبعی تھا ۔ یہ مادی عالم پر نظر ڈالتا اور یہ دریافت کرتا تھا کہ اشیاء کا آخری اور ناقابل تحلیل جزو کیا ہے ۔ اس راہ فکر کا قدرتی انجام دیما قریطوس کی مادیت تھا (۴۶۰ - ۳۶۰ ق م) "در حقیقت سالمات اور خلا کے علاوہ کچھ بھی نہیں"۔ یہ یونانی فلسفے کے اصل چشموں میں سے ایک ہے ۔ افلاطون کے زمانے میں یہ کچھ روز کے لیے دب گیا تھا، مگر ابیقورس نے (۳۴۲ - ۲۷۰) اس کو پھر زندہ کیا اور لیوکریشس میں (۹۸ - ۵۵ ق م) فصاحت کا ایک سیلاب بن گیا۔ مگر یونانی فلسفے کا سب سے مخصوص اور نتیجہ خیز نشو ونما سوفسطائیہ سے ہوا ہے، جو حکمت کے سفری معلم تھے جو اپنے سے باہر دنیا اور اس کی چیزوں کے بجائے اپنے فکر اور فطرت پر نظر ڈالتے تھے، یہ سب ہوشیار آدمی تھے (مثلاً گارجیاس اور ہپیاس) اور ان میں بہت سے فاضل لوگ بھی تھے (مثلاً پروٹاگورس اور پروڈی کس) ہمارے مروجہ فلسفۂ ذہن و کردار میں مشکل ہی سے کوئی ایسا مسئلہ یا حل ہوگا، جس کو انھوں نے محسوس نہ کیا ہو، یا جس پر انھوں نے بحث نہ کی ہو۔ وہ ہر شے کے متعلق سوالات کرتے تھے، اور مذہبی اور سیاسی ممنوعات کا نڈر ہو کر مقابلہ کرتے تھے اور ہر مذہب اور ہر معبد کو جرأت کے ساتھ عقل کی عدالت میں طلب کرتے تھے۔ سیاسیات میں وہ دو جماعتوں میں منقسم تھے۔ ایک روسو کی طرح سے یہ کہتی تھی کہ فطرت خیر ہے اور تمدن شر ہے۔ فطرۃً تمام انسان مساوی ہیں، مگر جماعتوں کے بنائے ہوئے معابد کی بدولت غیر مساوی بنتے جا رہے ہیں۔ قانون کمزوروں کو مقید و محکوم

۱۰ رکھنے کے لیے طاقتوروں کی ایجاد ہے دوسری جماعت نیٹشے کی طرح سے اس بات کی مدعی تھی کہ فطرت خیر و شر سے ماوراء ہے۔ فطرةً تمام انسان غیر مساوی ہیں۔ اخلاق کمزوروں کی اختراع ہے، طاقتوروں کو محدود اور باز رکھنے کے لیے قوت سب سے بڑی فضیلت اور انسان کی سب سے بڑی خواہش ہے۔ حکومت کی تمام صورتوں میں سے اشرافیہ سب سے زیادہ مبنی بر حکمت اور قرین فطرت ہے۔

اس میں شک نہیں جمہوریت پر جو یہ حملہ کیا گیا ہے، اس کے اندر ایتھنز میں ایک دولت مند اقلیت کے عالم وجود میں آنے کی جھلک نظر آتی ہے، جو اپنے آپ کو عدیدیہ جماعت کہتی تھی۔ اور عمومیہ کو نا اہل اور ڈھکوسلا کہتی تھی۔ ایک معنے میں کوئی عمومیہ تھی بھی نہیں، جس کی مذمت کی جاتی۔ کیونکہ ایتھنز کی چار لاکھ کی آبادی میں ڈھائی لاکھ تو غلام ہی تھے، جن کو کسی قسم کا سیاسی حق حاصل نہ تھا۔ اور ڈیڑھ لاکھ آزاد آدمیوں یا شہریوں میں سے صرف تھوڑی سی تعداد میں اکلیزیا اس عام مجلس میں شریک ہوتے تھے جس میں مملکت کے معاملات پر بحث ہوتی تھی اور ان کا تصفیہ ہوتا تھا۔ لیکن جو کچھ عمومیہ وہ رکھتے تھے، وہ اس قدر مکمل تھی کہ اس کے بعد سے اس قدر مکمل کبھی نہیں ہوئی۔ مجلس عام سب سے اعلیٰ قوت تھی۔ اور سب سے بڑی سرکاری جماعت ڈکاسٹریا یعنے عدالت عالیہ ایک ہزار سے زائد ارکان پر مشتمل تھی (تاکہ رشوت بہت ہی گراں ہو جائے) جس کو حروف تہجی کے اعتبار سے تمام شہریوں میں سے منتخب کر لیا جاتا تھا۔ کوئی ادارہ اس سے زیادہ عمومی نہیں ہو سکتا تھا اور نہ (جیسا کہ اس کے مخالف کہتے تھے) اس سے زیادہ مہمل۔

جنگ پیلا پونیشیا کے دوران میں (۴۳۰-۴۰۴ ق م) جس میں اسپارٹا کی بری قوت نے ایتھنز کی بحری قوت سے لڑکر آخر کار اس کو شکست دیدی، ایتھنز کی عدیدی جماعت نے کرائٹاس کی قیادت میں

اس بنا پر عمومیہ کے ترک کر دینے کی تحریک کی کہ یہ حالت جنگ میں مفید نہیں ہے اور مخفی طور پر اسپارٹا کی اشرافیہ کی تعریف کی۔ بہت سے عدیدی قائد جلاوطن کیے گئے، لیکن آخر کار جب ایتھنز مغلوب ہوا تو جو شرائط صلح اسپارٹا کی حکومت نے عائد کی تھیں، ان میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ ان جلاوطن اشرافیوں کو واپس بلا لیا جائے۔ یہ لوگ واپس آئے ہی تھے کہ انھوں نے کرائیٹیاس کی قیادت میں عمومی جماعت کے خلاف جو تباہ کن جنگ کے زمانے میں برسر حکومت تھی، دولت مندوں کے انقلاب کا اعلان کر دیا۔ انقلاب ناکام رہا۔ اور کرائٹیاس میدان جنگ میں مارا گیا۔

کرائٹیاس سقراط کا شاگرد اور فلاطوں کا چچا تھا۔

۲۔ سقراط

11 اگر ہم اس مجسمے کی بنا پر رائے قائم کریں جو قدیم سنگ تراشی کے آثار میں سے ہم تک پہنچا ہے، تو ہم کو یہ کہنا پڑتا ہے کہ سقراط میں اتنا حسن صورت بھی نہ تھا جتنا کہ ایک فلسفی میں ہو سکتا ہے۔ صاف سر، بڑا گول چہرا، اندر کو دھنسی ہوئی تیز آنکھیں، چوڑی پھولدار ناک، جو بہت سی شراب کی دعوتوں کی شہادت دیتی تھی ——— یہ سر تو کسی حمال کا ہوگا نہ کہ دنیا کے سب سے مشہور فلسفی کا۔ لیکن اگر ہم ایک بار پھر دیکھیں تو ہم کو پتھر کی سختی میں اس انسانی مہربانی اور بے تصنع سادگی کی جھلک نظر آئے گی جس نے اس سادہ مفکر کو ایتھنز کے بہترین نوجوانوں کا محبوب ترین معلم بنا دیا تھا۔ ہم اس کے متعلق بہت کم واقفیت رکھتے ہیں، اور اس کے باوجود ہم اس کو اشرافی

فلاطون، اور خاموش عالمانہ شان والے ارسطو کی نسبت اس کو بہت زیادہ قریبی طور پر جانتے ہیں۔ تیئیس سو برس کے فصل پر ہم اب بھی اس کی بھدی شکل کو ہمیشہ ایک ہی شکنوں پڑے ہوئے لبادے میں ملبوس دیکھ سکتے ہیں، جو خراماں خراماں Agora منڈی میں سے سیاسیات کے پاگل خانے سے غیر متاثر، اپنے شکار کو روکتا ہوا، اور نوجوانوں اور عالموں کو اپنے گرد جمع کرتا ہوا جاتا ہے اور ان کو پھسلا کر مندر کے برآمدے کے کسی سایہ دار گوشے میں لاتا ہے، اور ان سے ان کی اصطلاحات کی تعریف کرنے کی فرمائش کرتا ہے۔

وہ نوجوان جو اس کے گرد جمع ہوتے اور فلسفۂ یورپ کے عالم وجود میں لانے میں اس کی مدد کرتے تھے مختلف قسم کے تھے۔ ان میں دولت مند نوجوان آدمی بھی تھے، مثلاً فلاطون اور السی بائیڈیز جو اس کی ایتھنز کی عمومیہ کی ہجو آمیز تحلیل کے مزے لیتے تھے، ان میں اینٹی ستھینیز کے مثل اشتراکی تھے، جو استاد کے بے پروا فقر کو عزیز رکھتے تھے۔ اور جنھوں نے اس کو مذہب بنایا تھا، ان میں ایک یا دو ارسٹی پس کی طرح سے نراجی بھی تھے، جو ایسی دنیا کی تمنا رکھتے تھے جس میں غلام و آقا نہ ہوں اور سب کے سب سقراط کی طرح سے بے غل وغش آزاد ہوں۔ وہ تمام مسائل جو انسانی معاشرے کے اندر آج تلاطم برپا کرتے اور نوجوانوں کی لامتناہی بحث کے لیے مواد فراہم کرتے ہیں، وہ مفکرین اور مباحثین کی اس چھوٹی جماعت اور ان کے استاد کے لیے بھی ہیجان آفریں تھے، جو یہ محسوس کرتا تھا کہ بحث و گفتگو کے بغیر زندگی انسان کے شایان شان نہ ہو گی معاشری فکر کا ہر مذہب وہاں پر اپنا نمایندہ اور شاید اپنی اصل و ابتدا رکھتا تھا۔

استاد اپنی زندگی کس طرح سے بسر کرتا ہے، اس بات کو مشکل ہی سے

کوئی جانتا تھا۔ وہ کبھی کام نہیں کرتا تھا، اور اس نے کل کی بھی پروا نہیں کی۔ وہ ١٤
اس وقت کھاتا تھا، جب اس کے شاگرد اس بات کی درخواست کرتے تھے کہ
وہ ان کے دستر خوان کو عزت بخشے۔ وہ ضرور اس کی صحبت کو پسند کرتے ہوں گے،
کیونکہ جسمی خوشحالی کی تمام علامات اس سے ظاہر تھیں۔ گھر پہ اس کو اچھی طرح
سے نہیں لیا جاتا تھا، کیونکہ وہ اپنی بیوی اور بچوں کی پروا نہ کرتا تھا،
اور زینتھیپی کے نقطۂ نظر سے تو وہ ایک بیکار محض نِٹھلو اتھا، جو اپنے خاندان
کے لیے روٹی کی نسبت رسوائی زیادہ لاتا تھا۔ زینتھیپی کو باتیں کرنے کا
اتنا ہی شوق تھا، جتنا کہ سقراط کو۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مابین بھی
کچھ مکالمات ہوئے ہیں، جن کو فلاطون درج کرنے سے قاصر رہا ہے۔ لیکن وہ بھی
اس سے محبت کرتی تھی، اور ستر سال کے بعد بھی اس کے مرنے کو صبر سے
نہیں دیکھ سکی۔

اس کے شاگرد اس کا اس قدر کیوں احترام کرتے تھے؟ شاید اس کی
وجہ یہ بھی کہ وہ انسان اور فلسفی دونوں تھا۔ اس نے بڑے خطرے میں پڑ کر السی بائڈیز
کی لڑائی میں جان بچائی تھی، اور وہ ایک شریف آدمی کی طرح سے شراب پی سکتا تھا۔
یعنی بغیر خوف اور بغیر افراط کے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ وہ اس کے اندر سب
سے زیادہ اس کی حکمت کی انکساری کو پسند کرتے تھے۔ وہ صاحبِ حکمت ہونے کا
مدعی نہ تھا، بلکہ وہ اس کی محبت کے ساتھ تلاش کرنے کا مدعی تھا۔ وہ غیر پیشہ ور
طالبِ حکمت تھا، نہ کہ پیشہ ور۔ یہ کہا جاتا تھا، کہ ہاتف ڈلفی نے غیر معمولی سمجھ
سے کام لے کر اس کو سب سے زیادہ عقلمند یونانی قرار دیا تھا، اس نے اس کی
اس طرح سے تعبیر کی کہ یہ اس کی لا ادریت کا اثبات ہے، جو اس کے فلسفے کا نقطۂ آغاز
تھا۔ "میں صرف ایک چیز جانتا ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتا" فلسفہ
اسی وقت شروع ہوتا ہے جب انسان شک کرنا سیکھ جاتا ہے۔ خصوصاً اپنے
عزیز یقینات اپنے اعتقادات اور اپنے کلیات پر، کون جانتا ہے کہ یہ عزیز
یقینات ہمارے لیے کس طرح سے قطعیات بنے ہیں، کیا کسی مخفی طلب نے
تو ان کو چپکے سے پیدا نہیں کر دیا ہے، جس نے خواہش کو فکر کا جامہ پہنا دیا ہو۔

حقیقی فلسفہ اس وقت نہیں پیدا ہوتا جب تک ذہن خود اپنی طرف مڑ کر اپنی جانچ نہ کرے۔ سقراط کہتا تھا (Gnothi Seauton) خود کو جان۔

اس میں شک نہیں کہ اس سے پہلے فلسفی گزرے ہیں۔ زبردست آدمی طالیس اور ہرقلیطوس جیسے باریک بین آدمی پرینڈیر اور زینو ساکن ایلیا جیسے، دانا اور حکیم فیثاغورث اور ایمپیڈوکلیز جیسے۔ لیکن زیادہ تر وہ طبیعی فلسفی تھے۔ ان کو خارجی اشیا کی ماہیت یا طبیعت کی۔ اور مادی اور قابل پیمائش دنیا کے قوانین کی تلاش تھی۔ سقراط کہتا تھا کہ یہ بالکل ٹھیک ہے، مگر فلاسفہ کے لیے ایک موضوع درختوں پتھروں حتیٰ کہ ستاروں سے بھی ۱۳ زیادہ قابل قدر ہے، یہ انسان کا ذہن ہے۔ انسان کیا ہے اور کیا ہو سکتا ہے۔

پس وہ روح انسانی میں اس کے مسلمات کو کھولتا اور اس کے یقینیات کو معرض بحث میں لاتا ہوا تجسس کرتا رہا، اگر لوگ عدالت کے متعلق بہت زیادہ باتیں کرتے تو وہ خاموشی سے پوچھتا (To ti) یہ کیا ہے۔ تم ان مجرد الفاظ سے کیا معنے سمجھتے ہو، جن سے تم ایسے مسائل کا آسانی کے ساتھ تصفیہ کر دیتے ہو جن پر موت وحیات کا مدار ہوتا ہے۔ عزت نیکی اخلاق اور حب الوطنی کے کیا معنے ہیں۔ تم خود اپنے کیا معنے سمجھتے ہو۔ اس قسم کے اخلاقی اور نفسیاتی مسائل پر بحث کرنے کا سقراط کو شوق تھا۔ بعض لوگ جو اس سقراطی طریقے، یعنے صحیح تعریفات واضح فکر اور قطعی تحلیل کے مطالبے کا شکار ہوتے تھے، یہ اعتراض کرتے تھے کہ وہ جواب دینے کے مقابلے میں سوال زیادہ کرتا ہے، اور انسان کے ذہن کو پہلے سے بھی زیادہ شک کی حالت میں چھوڑ دیتا ہے۔ بایں ہمہ اس نے فلسفے کو مسائل میں سے دو نہایت ہی دشوار مسئلوں کے نہایت ہی قطعی جواب درشے میں دیے ہیں، اور وہ یہ کہ فضیلت کے کیا معنے ہیں؟ اور بہترین مملکت کیسی ہوتی ہے۔

اس نسل کے نوجوان ایتھنزیوں کے لیے ان سے زیادہ اہم مسائل اور نہ ہو سکتے تھے۔ یہ نوجوان آلمپس کے دیوتاؤں اور دیویوں اور اس اخلاقی ضابطے کے متعلق جو عقیدہ رکھتے تھے، جس کو اپنا موجب زیادہ تر

اس خوف سے حاصل ہوتا تھا، جو لوگوں کے دلوں میں ان پر ہر جگہ موجود رہنے والے لاتعداد معبودوں کا تھا وہ سوفسطائیوں نے تباہ کر دیا تھا۔ بظاہر اب اس کی کوئی وجہ معلوم نہ ہوتی تھی کہ آدمی جب تک قانون کی حد میں رہے اس کا جو جی چاہے وہ نہ کرے۔ پراگندہ کن انفرادیت نے ایتھنز ی کی سیرت کو کمزور کر دیا تھا، اور آخر کار شہر کو سخت تربیت یافتہ اسپارٹیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ اور ریاست کے متعلق یہ تھا کہ اس عوام کی قیادت والی اور پامال جذبات عمومیہ اس انجمن مباحثہ کی حکومت سپہ سالاروں کے اس مستعجلانہ انتخاب عزل و قتل، حروف ہجی کے اعتبار سے سادہ لوح کسانوں اور تاجروں کے انتخاب ہونے اور ملک کی سب سے بڑی عدالت کے ارکان بننے سے زیادہ کونسی شئے مضحکہ خیز ہو سکتی تھی۔ ایتھنز میں ایک نیا اور قدرتی اخلاق کیونکر پیدا ہو سکتا تھا اور مملکت کو کس طرح سے بچایا جا سکتا تھا۔

14 انھیں سوالات کا جواب سقراط کی موت اور اس کی حیات جاودانی کا باعث ہوا ہے۔ اگر اس نے قدیم بت پرستانہ مذہب کے زندہ کرنے کی کوشش کی ہوتی، اگر وہ اپنے آزاد نوجوانوں کی جماعت کو مندروں اور مقدس جھنڈوں میں لے گیا ہوتا، اور اس نے ان کو اپنے آبا کے معبودوں کے سامنے قربانی کرنے کا حکم دیا ہوتا، تو سن رسیدہ شہریوں نے اس کی عزت کی ہوتی مگر اس نے محسوس کیا کہ یہ بے کار اور تباہ کن پالیسی اور ترقی معکوس ہے، یعنے "مقبروں کے اوپر جانے کے بجائے مقبروں کے اندر جانے کے مساوی ہے۔ وہ اپنا علٰحدہ مذہبی عقیدہ رکھتا تھا۔ وہ ایک خدا پر ایمان رکھتا تھا، اور اپنے منکسرانہ انداز میں یہ امید کرتا تھا کہ موت اس کو بالکل فنا نہ کر دے گی[1] لیکن وہ یہ جانتا تھا کہ ایک پائدار اخلاقی ضابطہ

[1] والٹیر کی کہانی دو ایتھنزیوں کے متعلق جو سقراط کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔ "جو شخص یہ کہتا ہے کہ صرف ایک خدا ہے وہ تو ملحد ہے" فلوسافیکل ڈکشنری آرٹ "سقراط"۔

ایسی غیر یقینی دینیات پر قائم نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی شخص ایسا نظام اخلاق بنا سکتا، جس کو مذہبی تعلیم سے تعلق ہوتا اور جو ملحد کو بھی اسی قدر صحیح معلوم ہوتا، جس قدر سب سے زیادہ خدا رسیدہ کو تو مذہب اس اخلاقی گرفت کو ڈھیلا کئے بغیر بدل سکتے تھے، جو خود سر افراد کو ایک قوم کے صلح پسند شہری بناتی ہے۔

مثلاً اگر اچھے کے معنے عاقل کے اور نیکی کے معنے حکمت کے ہوتے، اگر آدمیوں کو اپنے حقیقی مفاد کو واضح طور پر دیکھنا اور اپنے افعال کے بعیدی نتائج کو محسوس کرنا اپنی خواہشوں کو باہم خبط کر دینے والی ابتری سے نکال کر ایک بامقصد اور تخلیقی ہمنوائی بنانا، اور ان پر نکتہ چینی کرنا اور ان کو صحیح طور پر مرتب کرنا سکھایا جا سکتا، تو شاید اس سے تعلیم یافتہ آدمی کو وہ اخلاق بہم پہنچ جاتا جس کے لیے جاہل اور ان پڑھ کی صورت میں خارجی اقتدار اور ان احکام و نصائح پر بھروسا کرنا پڑتا ہے، جن کا بار بار اعادہ ہوتا ہے۔ شاید جتنے بھی گناہ ہیں وہ سب غلطی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ انسان واقعات کو پوری طرح سے نہیں دیکھتا، اور حماقت کا مرتکب ہوتا ہے۔ عاقل کے اندر بھی وہی شدید اور غیر معاشری تسویقات ہو سکتی ہیں، جو جاہل میں ہوتی ہیں، لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ ان پر غیر عاقل سے زیادہ قابو رکھے گا اور وہ کم تر حیوانوں کے سے افعال میں مبتلا ہوگا۔ اور جس معاشرے کا انتظام عاقلانہ ہوگا یعنے ایسے معاشرے میں جو فرد سے محدود آزادی سلب کرنے کے بجائے اس کو وسیع تر قوتیں عطا کرتا ہے ہر شخص کو فائدہ معاشری اور فادارانہ کردار ہی میں نظر آئے گا، اور امن و انتظام اور نیک نیتی کے لیے صرف واضح نظر کی ضرورت ہوگی۔

لیکن اگر خود حکومت ایک ابتری اور لغویت ہو، اگر یہ بغیر مدد
۱۵ کئے ہوئے حکومت کرے، اور بغیر رہنمائی کے حکم دے تو ایسی مملکت میں ہم فرد کو قوانین کے ماننے اور اپنی خود غرضی اور خود طلبی کو مجموعی خیر کے حلقے کے اندر رکھنے پر کس طرح آمادہ کر سکتے ہیں؟ اگر ایسی مملکت میں جو قابلیت

کو مشتبہ نظروں سے دیکھتی ہو، اور تعداد کا علم سے زیادہ احترام کرتی ہو، کوئی ایسی بائڈیز اس کے خلاف ہو جائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ بلاشبہہ جہاں فکر نہیں ہوتا، وہاں ابتری ہوتی ہے، اور مجمع عوام جلدی اور جہالت میں فیصلہ کر دیتا ہے، جس پر فرصت میں وہ متاسف ہوتا ہے۔ کیا یہ ادنیٰ قسم کی ضعیف الاعتقادی نہیں ہے، کہ محض تعداد سے حکمت پیدا ہو جائے گی۔ اس کے برعکس کیا عام طور پر یہ نہیں دیکھا جاتا کہ مجمعوں کے اندر آدمی اس سے زیادہ بیوقوف زیادہ تشدد پسند اور زیادہ بے رحم ہوتے ہیں، جتنے کہ وہ علیحدہ اور تنہائی میں ہوتے ہیں۔ کیا یہ بات شرمناک نہیں ہے کہ انسانوں پر خطیب حکومت کریں، جو لمبی تقریروں سے اس طرح سے گونجتے رہتے ہیں، جس طرح سے پیتل کے برتن جو ضرب لگنے کے بعد اس وقت تک گونجتے رہتے ہیں، جب تک ان پر کوئی ہاتھ نہیں رکھ دیتا۔[1] بالیقین انصرام مملکت ایسا معاملہ ہے، جس کے لیے انسان جتنا بھی عاقل ہو اتنا ہی بہتر ہے۔ یہ ایسا معاملہ ہے جس کے لیے بہترین اذہان کے غیر پابند فکر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک معاشرہ سوائے اس صورت کے کس طرح سے بچایا یا مضبوط بنایا جا سکتا ہے، کہ اس کی قیادت سب سے عقلمند انسانوں کے ہاتھ میں ہو۔

اس اشرافی تعلیم کی تلقین پر ایسے زمانے میں جب کہ جنگ ہر قسم کی نکتہ چینی کے خاموش کر دینے کی طالب تھی، اور جس وقت دولت مند اور تعلیم یافتہ اقلیت ایک انقلاب کی سازش کر رہے تھے، ایتھنز کی عمومی جماعت پر کیا اثر ہوا ہو گا اس کا تصور کرو۔ اینٹس عمومی جماعت کے قائد کے محسوسات پر غور کرو جس کا بیٹا سقراط کا شاگرد ہو کر اپنے باپ کے معبودوں کے خلاف ہو گیا تھا، اور اپنے باپ کے سامنے ان کا مضحکہ کرتا تھا۔ کیا ارسٹوفینیز نے ٹھیک یہی پیشین گوئی نہیں کی تھی، کہ غیر معاشری عقل کو

---

[1] ۔ فلاطون پروٹاگورس۔

قدیم فضائل کی جگہ دینے سے یہ نتیجہ نکلے گا۔[1]

اس کے بعد انقلاب ہوا، اور لوگ اس کی حمایت میں اور اس کے
۱۶ خلاف کٹ کٹ کر لڑے۔ جب عمومیہ کو کامیابی ہوئی تو سقراط کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ وہ باغی جماعت کا عقلی سرغنہ تھا، اگرچہ وہ خود کتنا ہی پر امن کیوں نہ رہا ہو۔ وہ قابل نفرت اشرافی فلسفے کا منبع تھا۔ وہ نوجوانوں کا مخرب تھا جو مباحثہ سے مخمور ہو گئے تھے۔ اینٹس اور میلیٹس نے کہا کہ سقراط کا مرنا بہتر ہوگا۔

باقی قصہ ساری دنیا کو معلوم ہے، کیونکہ فلاطون نے اس کو ایسی نثر میں لکھا ہے جو نظم سے زیادہ حسین ہے۔ ہم اس سادہ اور بہادرانہ معذرت یا جواب کو خود پڑھ سکتے ہیں جس میں فلسفے کے پہلے شہید نے آزاد فکر کے حقوق اور ضرورت کا اعلان کیا ہے، اور اپنی قدر و منزلت کو مملکت کے سامنے برقرار رکھا ہے، اور اس مجمع یا انبوہ سے رحم کی التجا کرنے سے انکار کر دیا ہے، جس کو وہ ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھا کرتا تھا۔ وہ اس کو معاف کر دینے کا اقتدار رکھتے تھے مگر اس نے مرافعہ کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ اس کے نظریوں کی عجیب و غریب تصدیق تھی، کہ جج تو اس کو چھوڑنا چاہتے تھے،

[1] (The Clouds) میں ارسٹوفینیز نے سقراط اور اس کی ''دکان فکر'' جہاں کہ ایک شخص خواہ وہ کتنا ہی برسرخطا ہو، اپنے آپ کو برسرحق ثابت کرنے کا فن سیکھتا تھا، بہت مذاق اڑایا ہے۔ فذیپیز اپنے باپ کو اس بنا پر مارتا ہے کہ اس کا باپ اس کو مارا کرتا تھا، اور ہر قرض ادا ہونا چاہئے۔ یہ ہجو غالباً عناد پر مبنی نہ تھی، کیونکہ ہم ارسٹوفینیز کو اکثر سقراط کے ساتھ پاتے ہیں، وہ اور سقراط عمومیہ سے نفرت رکھنے میں متفق ہو گئے تھے، اور فلاطون نے (The Clouds) کے دیو نی سس سے پڑھنے کی سفارش کی تھی۔ چونکہ یہ ڈراما سقراط پر مقدمہ چلنے سے چوبیس سال پہلے شائع ہو چکا تھا، اس لیے اس کا فلسفی کی زندگی کے افسوسناک انجام میں کوئی زیادہ حصہ نہیں ہو سکتا۔

مگر غضب ناک انبوہ نے اس کی موت کی رائے دی۔ اگر اس نے دیوتاؤں سے انکار کیا ہوتا؟ افسوس ہے اس شخص پر جو لوگوں کو اس سے زیادہ تیزی سے تعلیم دیتا ہے جتنا کہ وہ سیکھ سکتے ہیں۔

اس لیے انھوں فیصلہ کیا کہ اسے شوکران کا پیالا پلایا جائے۔ اس کے دوست قید خانے میں آئے اور آسانی کے ساتھ بھاگ جانے کا موقع اس کے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے ان تمام عہدہ داروں کو رشوت دیدی تھی، جو اس کے اور آزادی کے درمیان حائل تھے۔ اس نے انکار کردیا۔ اس نے کہا کہ میری عمر اب ستر سال کی ہوچکی ہے، اور شاید یہ میرے مرنے ہی کا وقت ہے۔ پھر میں کبھی اسس قدر مفید طور پر نہ مر سکوں گا۔ اس نے اپنے اندوہگیں احباب سے کہا ملول نہ ہو، اور کہو کہ تم صرف میرے جسم کو دفن کر رہے ہو۔ فلاطون ادب عالم کے ایک شہرۂ آفاق ٹکڑے میں کہتا ہے کہ "جب وہ یہ لفظ کہہ چکا تو

"وہ اٹھا اور کرائٹو کے ساتھ غسل خانے میں گیا، جس نے ہم سے انتظار کرنے کو کہا، ہم باتیں کرتے ہوئے، اور اپنے غم و الم کی اہمیت کا خیال کرتے ہوئے ٹھیرے رہے۔ وہ ہمارے باپ کے مانند تھا جس سے ہم جدا کئے جا رہے تھے، اور ہمیں اپنی باقی زندگی یتیموں کی حیثیت سے گزارنی تھی۔ اب غروب کا وقت قریب آ رہا تھا۔ کیونکہ اتنے وہ اندر رہے بہت سا ۱۷
وقت گزر چکا تھا۔ جب وہ باہر آیا تو وہ پھر ہمارے ساتھ بیٹھ گیا۔ لیکن کچھ بہت زیادہ بات چیت نہیں ہوئی۔ جلد ہی محافظ مجبس آیا۔ اور اس کے پاس یہ کہہ کر کھڑا ہو گیا کہ اے سقراط تمھیں میں جانتا ہوں کہ تم ان لوگوں میں جو یہاں آئے ہیں سب سے شریف اور سب سے سلیم الطبع اور سب سے بہتر ہو۔ میں تم سے دوسرے لوگوں کے سے پر غضب احساسات منسوب نہ کروں گا جو مجھ پر ہر وقت بگڑتے اور غصہ ہوتے ہیں، جب کہ میں ان کو ارباب اقتدار کی تعمیل حکم میں زہر کے پینے کا حکم دیتا ہوں۔ بے شک مجھے یقین ہے کہ تم مجھ پر ناراض نہ ہوگے کیونکہ تم خود واقف ہو کہ اس کا

مجرم میں نہیں بلکہ دوسرے ہیں۔ پس اچھی طرح سے رہو، اور جو کچھ بھگتنا ہے اس کو ہلکے دل سے برداشت کرنے کی کوشش کرو۔ تم جانتے ہو، کہ میں جس غرض سے آیا ہوں۔ پھر وہ شخص پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، اور مڑ کر باہر چلا گیا۔

سقراط نے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ تم بھی اچھی طرح سے رہو، میں جیسا کہ تم حکم دیتے ویسا ہی کروں گا۔ پھر ہماری طرف مخاطب ہو کر کہا کہ یہ شخص کس قدر اچھا ہے، جب سے میں قید خانے میں ہوں وہ ہمیشہ مجھ سے ملنے کے لیے آتا ہے، اور اب دیکھو وہ کس قدر فیاضی سے میرے لیے متاسف ہے۔ لیکن کرائٹو جو وہ کہتا ہے وہ ہم کو کرنا چاہئے۔ اگر زہر تیار ہے تو پیالا آنا چاہئے، اگر نہیں تو خادم سے تیار کرنے کے لیے کہو۔"

کرائٹو نے کہا "مگر ابھی تو سورج پہاڑ کی چوٹیوں پر ہے، اور بہت سے لوگ تو دیر میں پیتے ہیں، اطلاع کے بعد وہ کھاتے پیتے اور شہوانی لذات میں مصروف ہوتے ہیں۔ اس لیے جلدی نہ کرو۔ ابھی وقت ہے۔"

سقراط نے کہا "ہاں کرائٹو وہ لوگ جن کا تم ذکر کرتے ہو ایسا کرنے میں حق بجانب ہیں کیونکہ وہ خیال کرتے ہیں کہ تاخیر سے ان کو فائدہ ہوتا ہے۔ لیکن میں ایسا نہ کرنے میں حق بجانب ہوں، کیونکہ میرے خیال میں ذرا دیر سے زہر پینے سے مجھے کچھ نفع نہ ہوگا۔ میں ایسی زندگی کو مہلت دوں گا اور ایسی جان بچاؤں گا جو ختم ہو چکی ہے۔ ایسی حرکت پر میں اپنے اوپر صرف ہنس سکتا ہوں۔ لہذا مہربانی کر کے جیسا میں کہتا ہوں کرو، اور جو کچھ میں کہتا ہوں اس سے انکار نہ کرو۔

کرائٹو نے جب یہ بات سنی تو خادم کو اشارہ کیا۔ خادم اندر گیا اور کچھ دیر اندر رہا۔ سقراط نے کہا کہ اے میرے اچھے دوست تمھیں ان معاملات میں تجربہ ہے، مہربانی کر کے بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ اس آدمی نے جواب دیا تمھیں اتنی دیر تک صرف ٹہلنے کی ضرورت ہے، جب تک کہ

تمھاری ٹانگیں بھاری ہوں۔ پھر تم لیٹ جانا، اور زہر اپنا کام کرے گا۔" اس کے ساتھ ہی اس نے سقراط کو پیالا دیا، جس نے اس کو نہایت ہی خندہ پیشانی ۱۸ اور بغیر کسی خوف یا "تبدیل رنگ یا خدوخال کے لیا۔ اور اس آدمی کی طرف پوری طرح سے دیکھتے ہوئے، جیسا کہ اس کا قاعدہ تھا، کہا، اس پیالے میں سے کچھ تھوڑا سا کسی دیوتا کے نام نذر کر دینے کے متعلق تمھاری کیا رائے ہے، کیا میں ایسا کر سکتا ہوں یا نہیں؟ اس شخص نے جواب دیا کہ "سقراط ہم صرف اس قدر تیار کرتے ہیں جتنا کہ ایک شخص کے لیے کافی ہوتا ہے" اس نے کہا کہ میں سمجھا، مگر مجھے دیوتاؤں سے دعا تو ضرور کرنی چاہیئے کہ وہ اس عالم سے اس عالم کی طرف میرے سفر کو کامیاب بنائیں کاش میری یہ دعا قبول ہو جائے" پھر پیالا اپنے ہونٹوں سے لگا کر اس نے خوشی خوشی زہر پی لیا۔

اب تک ہم میں سے اکثر اپنے رنج وغم کو ضبط کیے ہوئے تھے مگر اب جب ہم نے اس کو پیتے ہوئے دیکھا، اور یہ دیکھا کہ وہ اس کو ختم بھی کر چکا ہے، تو ہم سے ضبط نہ ہو سکا۔ باوجود ضبط کے میرے آنسو بہنے لگے۔ میں نے اپنا چہرہ ڈھک لیا اور اپنے اوپر آنسو بہانے لگا کیونکہ میں یقیناً اس کے اوپر نہیں رو رہا تھا، بلکہ اپنی مصیبت کے خیال پر رو رہا تھا کہ مجھ سے ایسا رفیق جدا ہو رہا ہے۔ میں نے ہی اس بارے میں پہل نہ کی تھی بلکہ کرائٹو جب اپنے آنسوؤں کو ضبط نہ کر سکا تو وہ ذرا ہٹ گیا اور میں اس کے پیچھے چلا، اور اس لمحے میں اپالوڈورس جو اب تک روتا رہا تھا چیخ چیخ کر رونے لگا، اور ہم سب کو بزدل بنا دیا۔ صرف سقراط نے اپنی خاموشی برقرار رکھی۔ اس نے کہا کہ "یہ شور پکار کیسا ہے"؟ میں نے عورتوں کو محض اسی لیے بھیج دیا تھا کہ وہ اس طرح سے پریشانی کا باعث نہ ہوں کیونکہ میں نے سنا ہے کہ ایک شخص کو خاموشی اور سکون کے ساتھ مرنا چاہیئے۔ لہذا خاموش رہو اور صبر کرو"۔ جب ہم نے یہ سنا تو ہم کو شرم آئی اور ہم نے اپنے آنسو ضبط کیے۔ وہ ٹہلتا رہا یہاں تک کہ اس نے کہا کہ میری ٹانگیں اب کام نہیں دیتیں، اور پھر وہ ہدایات کے مطابق پیٹھ کے بل لیٹ گیا اور جس شخص نے اس کو

زہر دیا تھا، وہ بار بار اس کی ٹانگوں اور پیروں کی طرف دیکھتا تھا، تھوڑی دیر کے بعد اس نے اس کے پاؤں کو زور سے دبایا اور کہا کیا تم کو احساس ہوتا ہے اس نے کہا کہ نہیں، پھر ٹانگوں کی یہی کیفیت ہوئی اور یہ سلسلہ اوپر کی طرف چلا اور ہم کو معلوم ہوا کہ وہ ٹھنڈا اور سخت ہوتا جارہا ہے۔ پھر سقراط نے خود محسوس کیا، اور کہا کہ جب زہر قلب تک پہنچ جائے گا تو یہ آخر ہوگا۔" وہ کنج ران کے قریب سے ٹھنڈا ہو رہا تھا کہ اس نے اپنا چہرہ کھولا اور کہا (اور یہ اس کے آخری لفظ تھے) کراٹو میرے ذمے اسکلیپس کا ایک مرغ ہے کیا تم اس قرض کی ادائی کو یاد رکھوگے۔ کراٹو نے کہا "قرض ادا کر دیا جائے گا۔" "کیا اور کوئی چیز ہے۔" اس سوال کا کوئی جواب نہ ملا۔ لیکن ایک یا دو منٹ میں ایک حرکت کی آواز سنائی دی اور خادم نے اس کے چہرے کو کھول دیا۔ اس کی آنکھیں جمی ہوئی تھیں اور کراٹو نے اس کی آنکھیں اور اس کا منہ بند کر دیا۔ ۱۹

اس طرح سے ہمارے دوست کا انجام ہوا، جس کو میں صحیح معنے میں ان سب انسانوں سے زیادہ عقلمند زیادہ عادل اور بہتر سمجھتا ہوں جن سے میں کبھی واقف ہوا ہوں۔

فلاطون کی تیاری

سقراط کی ملاقات نے فلاطون کی زندگی میں کایا پلٹ کر ڈالی۔ اس کی پرورش آسائش اور شاید دولت میں ہوئی تھی۔ وہ ایک خوبصورت اور طاقتور نوجوان تھا اور مشہور ہے کہ اپنے کندھوں کی چوڑائی کی وجہ سے فلاطون کہلاتا تھا سپاہی کی حیثیت سے وہ باکمال تھا، اور دو مرتبہ خاکنائے کے کھیلوں میں انعام حاصل کر چکا تھا۔ ایسے عنفوان میں فلسفی پیدا

نہیں ہوا کرتے۔ لیکن فلاطون کی لطیف روح نے سقراط کے جدلی کھیل میں ایک نئی خوشی پائی تھی۔ یہ دیکھکر مسرت ہوتی تھی کہ استاد کس طرح سے اعتقادات اور مسلمات کو اپنے تیز سوالوں کی نوک سے سکیڑ کر رکھدیتا ہے۔ فلاطون اس کھیل میں بھی اسی طرح سے داخل ہو گیا جس طرح سے کہ وہ معمولی قسم کی کشتی میں داخل ہوا تھا۔ اور بوڑھے (Gad fly) کی رہبری میں (جیسا کہ سقراط اپنے آپ کو کہا کرتا تھا) وہ محض مباحثے سے محتاط تحلیل اور بارآور گفتگو تک پہنچ گیا۔ وہ حکمت اور اپنے استاد کا نہایت ہی سچا عاشق ہو گیا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں وحشی نہیں بلکہ یونانی غلام نہیں بلکہ آزاد اور عورت نہیں بلکہ مرد پیدا ہوا مگر سب سے بڑا شکر اس کا اس بات پر ہے کہ میں سقراط کے زمانے میں پیدا ہوا۔

جب استاد کا انتقال ہوا، تو اس کی عمر اٹھائیس سال کی تھی۔ اور ایک خاموش زندگی کے اس المناک انجام نے شاگرد کی زندگی کے ہر پہلو پر اپنا نشان چھوڑا، اس سے اس کے دل میں عمومیہ کی طرف سے ایسی حقارت اور مجمع عوام کی طرف سے ایسی نفرت پیدا ہو گئی جو اس کے اشرافی نسب اور تربیت سے بھی مشکل ہی سے پیدا ہوتی تھی۔ اس کی بدولت کیٹو جیا عزم کر لیا کہ عمومیہ کا تباہ کرنا نہایت ہی ضروری ہے، اور اس کی جگہ سب سے عقلمند اور سب سے بہتر لوگوں کی حکومت کو دینا چاہئے۔ یہ اس کی زندگی کا سب سے پرشغف مسئلہ بن گیا کہ ایسا طریقہ کس طرح سے معلوم ہو، جس سے سب سے عقلمند اور سب سے بہتر دریافت ہو سکیں، اور پھر ان کو حکومت کرنے کا موقع مل سکے اور وہ اس پر آمادہ کئے جا سکیں۔

اس نے سقراط کے بچانے کی جو کوششیں کی تھیں ان کی بدولت وہ عمومیہ کے قائدوں کی نظروں میں مشتبہ ہو گیا۔ اس کے دوستوں نے بہ اصرار اس سے کہا کہ ایتھنز اس کے لیے محفوظ مقام نہیں ہے، اور یہ وقت اس کے لیے عالم کی سیر کے واسطے نہایت ہی موزوں ہے، اس لیے اسی سال ۳۹۹ق م میں وہ روانہ ۲۰ ہوا یہ کہ وہ کہاں گیا اس کو وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتے۔ اہل علم میں

اس کے راستے کے ہر موڑ پر اچھی خاصی جنگ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے وہ مصر گیا، اور اس کو اہل مذہب کی جماعت سے جو اس ملک پر حکمراں تھی، یہ سن کر سخت حیرت ہوئی کہ مملکت یونان ہنوز عالم طفلی میں ہے نہ اس کی مستقل روایات ہیں، اور نہ کوئی بلند پایہ تہذیب ہے، اس لیے ابھی اس کو نیل کے یہ ابوالہولی پنڈت کچھ اہمیت نہیں دیتے۔ لیکن اس قسم کے حیرت زا دھکے سے زیادہ اور کوئی شے ہمارے لیے معلم کا کام نہیں کرتی۔ اس عالم طبقے کی یاد جو ایک ساکن زرعی قوم پر نظری طور پر حکومت کرتے تھے، فلاطون کے فکر میں تازہ رہی اور ٹوپیا لکھتے وقت اس نے اپنا کام کیا۔ پھر وہاں سے وہ سسلی اور اٹلی کو گیا، وہاں پر کچھ عرصے کے لیے اس مدرسے یا مذہب میں شریک ہو گیا، جس کی فیثاغورث نے بنا ڈالی تھی۔ اور اس کے اثر پذیر ذہن پر ایک بار پھر ایک ایسی چھوٹی جماعت کا نقش قائم ہوا، جو علم و حکومت کے لیے علیحدہ کر لی گئی ہو، اور جو باوجود قوت کے سادہ زندگی بسر کرے۔ بارہ سال تک اس نے جہاں گردی کی، اور ہر چشمے سے حکمت کو حاصل کیا، ہر عبادت گاہ میں بیٹھا، اور ہر مذہب کا ذائقہ چکھا۔ بعض تو یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ ارض یہودہ تک بھی گیا اور کچھ عرصے کے لیے تقریباً اشتراکی انبیا کی روایت سے متاثر ہوا، اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ گنگا کے کناروں تک بھی پہنچا، اور ہندوؤں کے صوفیانہ مراقبوں کی تعلیم حاصل کی۔ مگر ہم نہیں جانتے۔

وہ ایتھنز ۳۸۷ ق م میں لوٹا۔ اب اس کی عمر چالیس سال تھی، اور مختلف قوموں اور مختلف ملکوں کی حکمت حاصل کر کے وہ بالکل پختہ ہو گیا تھا۔ نوجوانی کا جوش و خروش تو کسی قدر کم ہو گیا تھا، مگر اس کو ایسا تناظر فکر حاصل ہو گیا تھا، جس میں ہر انتہائی صورت نصف حقیقت معلوم ہوتی تھی، اور ہر مسئلے کے بہت سے پہلو مل کر صداقت کے ہر رخ کا پورا پورا حق ادا کرتے تھے۔ اس کے پاس علم اور فن دونوں تھے۔ ایک دفعہ کے لیے فلسفی اور شاعر دونوں ایک روح میں بہم ہو گئے تھے۔ اور اس نے اپنے لیے ایسا انداز بیان اختراع کیا تھا، جس میں حسن اور صداقت دونوں کی

گنجائش تھی یعنے مکالمہ۔ غالباً اس سے پہلے کبھی فلسفے نے ایسا شاندار لباس
نہیں پہنا تھا، اور اس کے بعد تو یقیناً نہیں پہنا۔ ترجموں تک میں یہ انداز اپنی چمک ۲۱
او ر تابش دکھاتا ہے۔ فلاطون کے شیدائیوں میں سے ایک یعنے شیلی کہتا ہے کہ
"فلاطون کے اندر دقیق ولطیف منطق اور پاشتھی جوش شاعری کا وہ امتزاج
ظاہر ہوتا ہے، جو اس کے جملوں کی شوکت وہمنوائی سے گھل کر موسیقی ارتسامات
کا ایک ایسا بے پناہ دریا بن جاتا ہے، جو دلائل وبراہین کو اس تیزی سے آگے
بڑھاتا ہے، گویا کہ وہ سرپٹ جا رہی ہوں[۱]"۔ نوجوان فلسفی نے تمثیل نگاری سے
جو ابتدا کی تھی تو وہ بیکار نہ رہی تھی۔

فلاطون کے سمجھنے میں دشواری صرف فلسفہ وشاعری وعلم وفن کے ایسے
مست کن امتزاج کی بنا پر ہوتی ہے۔ ہم ہمیشہ یہ نہیں بتا سکتے کہ مکالمے کی کس
سیرت میں مصنف بول رہا ہے، اور نہ یہ بتا سکتے ہیں کہ کس صورت میں بول رہا ہے،
آیا جو کچھ وہ کہہ رہا ہے وہی اس کی مراد ہے یا اس کا بیان استعاری ہے،
وہ خوش طبیعی یا مزاح کر رہا ہے، یا اس کی وہی مراد بھی ہے، جو وہ کہہ رہا ہے
اس کا مزاح طعن اور تمثیل کا شوق کبھی کبھی ہم کو پریشان کر دیتا ہے۔ ہم اس کے
متعلق تقریباً یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ استعاروں ہی میں تعلیم دیتا ہے۔ اس کا پروٹاگورس
دریافت کرتا ہے کہ "کیا میں ایک سن رسیدہ شخص کی حیثیت سے تمثیل یا کہانی میں
گفتگو کروں[۲]؟ کہا جاتا ہے کہ یہ مکالمات فلاطون نے اپنے زمانے کے عام تعلیم یافتہ
لوگوں کے لئے لکھے تھے۔ اپنے بول چال کے طریقے اپنے موافق ومخالف کی دلچسپ
جدل، اپنے تدریجاً استدلال کے تکمل کرنے اور اہم استدلال کو بار بار دہرانے
کی بنا پر یہ مکالمے ایسے شخص کے فہم کے لیے نہایت موزوں تھے جسے فلسفے کا اتفاقی
تعیش کی حیثیت سے مزا لینا ہو، اور جو زندگی کے مختصر ہونے کی بنا پر اس شخص کی
طرح سے پڑھنے پر مجبور ہو، جو بھاگتے ہوئے پڑھتا جاتا ہے۔ لہذا ہمیں ان

---

[۱] مقتبسۂ بارکر (Gree Political Theory) مطبوعۂ لندن ۱۹۱۸ء۔

[۲] پروٹاگورس ۳۲۰۔

مکالمات کے اندر ایسی بہت سی چیزیں پانے کے لیے تیار رہنا چاہئے جو مزاحی اور استعاری ہیں، اور نیز ایسی بھی جن کو صرف ایسے اہل علم سمجھ سکتے ہیں، جو فلاطون کے زمانے کے معاشری اور ادبی حالات سے واقف ہیں، یعنے ایسی بہت سی باتیں جو اس زمانے میں ممکن ہے کہ غیر متعلق اور خیالی معلوم ہوں مگر جنھوں نے فکر کی ثقیل غذا کو ایسے اذہان کے لیے جو فلسفی کھانوں کے عادی نہ ہوں، زود ہضم بنانے کے لیے چٹنی اور گرم مسالے کا کام دیا ہو۔

ہمیں یہ بھی اعتراف کرنا چاہئے، کہ فلاطون بھی بہ کثرت وہ اوصاف رکھتا تھا جن کی وہ مذمت کرتا ہے۔ وہ شاعروں اور خرافاتی افسانوں کی مذمت کرتا ہے، مگر شاعروں میں ایک، اور خرافاتی افسانوں میں سیکڑوں کا اضافہ کرتا ہے۔ وہ اہل مذہب کی شکایت کرتا ہے (جو ادھر ادھر وعظ کہتے اور دوزخ سے ڈراتے پھرتے ہیں، اور معاوضہ لے کر اسے نجات کی امید دلاتے ہیں (دیکھو جمہوریہ ۳۶۴) مگر وہ خود اہل مذہب میں سے بھی ہے فقیہ بھی ہے، واعظ بھی ہے، فوق الاخلاقی بھی ہے، اور مصلح مذہب بھی ہے جو صناعت کی مذمت کرتا ہے، اور بے سود چیزوں کو نذر آتش کر دینا چاہتا ہے۔ وہ شکسپیر کی طرح سے اس بات کو تسلیم کرتا ہے، کہ موازنے لغزش کا موجب ہوتے ہیں (سوفسطائی ۲۳۱) مگر وہ موازنے پر موازنہ کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ سوفسطائیہ کو الفاظ ترکیبات کے بیوپاری بحث باز کہتا ہے، لیکن وہ خود طالب علموں کے مانند منطق تراشنے سے بالاتر نہیں ہے۔ فیگویٹ ازراہ تمسخر اس کی نقل کرتا ہے "کل جزو سے بڑا ہوتا ہے، یقیناً ــــ اور جزو کل سے چھوٹا ہوتا ہے؟ ــــ ہاں ــــ ... لہذا ظاہر ہے کہ فلاسفہ کو مملکت پر حکومت کرنی چاہئے"[1]

لیکن یہ بدترین بات ہے جو ہم اس کے متعلق کہہ سکتے ہیں، اور یہ کہنے کے بعد بھی مکالمات دنیا کے انمول خزانوں میں سے ہیں[2]۔ ان میں سب سے بہتر جمہوریہ ہے

---

[1] (Pour Qu on lise Platon, Paris) طبع ۱۹۰۵ء صفحہ ۴

[2] مکالمات میں سب سے اہم حسب ذیل ہیں "سقراط کی معذرت" "کرائٹو" "فیڈو" "دی سمپوزیم"

جو بجائے خود ایک مکمل تعلیم ہے، جس کو فلاطون نے ایک کتاب کے اندر بھر دیا ہے۔ اس کے اندر ہم اس کی مابعد الطبیعیات اس کی دینیات اس کی اخلاقیات اس کی نفسیات اس کی تدریسیات اس کی سیاسیات اور اس کا نظریہ صناعت پاتے ہیں۔ اس کے اندر ہم کو ایسے مسائل ملیں گے جن میں دور جدید کی بو اور عصر حاضر کا ذائقہ محسوس ہوتا ہے، اشتمالیت اشتراکیت نسوانیت ضبط تولید اصلاح نسل نشئوی مسائل اخلاق و امارو سو کے مسائل عدد الی الفطرت اور قدری تعلیم برگسان کی قوت حیات اور فرائیڈ کی نفسی تحلیل سب یہاں موجود ہے۔ یہ منتخب اشخاص کے لیے سامان ضیافت ہے، جس کو ایک فیاض میزبان نے چنا ہے۔ ایمرسن کہتا ہے کہ فلاطون فلسفہ ہے اور فلسفہ فلاطون ہے،[۱] اور جمہوریت کے حق میں وہ لفظ کہتا ہے جو عمرؓ نے قرآن کے متعلق کہے تھے، کہ "دنیا کے کتب خانوں کو جلا دو کیونکہ ان کے اندر جتنی کام کی باتیں ہیں وہ سب اس کتاب میں موجود ہیں"۔

آؤ جمہوریہ کا مطالعہ کریں۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ فیڈرس گارجیاس پرمینڈیز اور دی ایسٹیمین ہیں۔ جمہوریہ کے سب اہم حصے (حوالہ ان فصول کا ہے جن کے حاشیے پر ہندسے لگے ہوئے ہیں نہ صفحات کا) ۳۲۷ تا ۳۳۲ —۔ ۳۳۶ تا ۳۷۵ - ۳۸۴ تا ۳۸۵ - ۳۹۲ تا ۴۲۶ و ۴۳۳ - ۴۳۴ تا ۴۳۵ - ۴۴۱ تا ۴۷۶ - ۴۸۱ تا ۴۸۳ - ۵۱۲ تا ۵۲۰ - ۵۷۲ تا ۵۹۴ - سب سے بہتر ایڈیشن جویٹ کا ہے، اور سب سے سبک ایوری مین سیریز کا ہے حوالے جمہوریہ ہی کے ہیں سوائے ان مقامات کے جہاں بیان کر دیا گیا ہے۔

[۱] (Representative Men) صفحہ ۴۱۔

۴۔ اخلاقیاتی مسئلہ ۲۳

گفتگو ایک دولت مند اشرافی سیفیلس کے مکان پر ہوتی ہے۔ مجمع میں فلاطون کے بھائی گلاکن اور ایڈیمانٹس ہیں اور تھرا ئی سی میکس ایک چڑچڑا اور بدمزاج سوفسطائی ہے، سقراط جو فلاطون کی طرف سے بول رہا ہے سیفیلس سے سوال کرتا ہے۔

تمھارے نزدیک وہ سب سے بڑی برکت کونسی ہے جو تم کو دولت سے حاصل ہوئی ہے؟

سیفیلس اس کا یہ جواب دیتا ہے کہ دولت زیادہ تر اس اعتبار سے میرے لیے باعث رحمت ثابت ہوئی ہے کہ یہ مجھے فیاض دیانت دار اور عادل ہونے کے قابل بناتی ہے۔ سقراط اپنے قدیم انداز کے مطابق اس سے پوچھتا ہے کہ عدالت سے ٹھیک تمھاری کیا مراد ہے اور اس طرح سے فلسفیانہ مجادلے کے کتوں کو چھوڑ دیتا ہے۔ کیونکہ تعریف سے زیادہ دشوار کوئی بات نہیں اور نہ ذکاوت ومہارت کا اس سے زیادہ کوئی سخت امتحان ہو سکتا ہے۔ جتنی تعریفیں کی جاتی ہیں ان کو سقراط یکے بعد دیگر نہایت آسانی کے ساتھ توڑ دیتا ہے، یہاں تک کہ آخرکار تھرا ئی سی میکس، جو اوروں کے مقابلے میں زیادہ بے صبر ہے چلا اٹھتا ہے۔

"تم پر کیا حماقت سوار ہے، سقراط؟ اور باقی سب لوگ ایک دوسرے کے پاؤں پر اس قدر احمقانہ طریق پر کیوں گر گر رہے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ عدالت کیا چیز ہے، تو تمھیں سوال نہیں کرنا چاہیے بلکہ جواب دینا چاہئے، اور دوسروں کی تردید کرنے پر فخر نہ کرنا چاہئے۔" (۳۳۶)۔

اس پر سقراط ڈرتا نہیں، بلکہ جواب دینے کے بجائے سوال کرتا رہتا ہے اور چند منٹ کے داؤں پیچ کے بعد وہ بے خبر تھرائی سی میکس کو ایک تعریف کا پابند بنا دیتا ہے۔

"تو سنو" غضب ناک سوفسطائی کہتا ہے کہ "میں اعلان کرتا ہوں کہ طاقت حق ہے، اور عدالت طاقتور کے فائدے کا نام ہے........ حکومت کی مختلف صورتیں یعنی عمومی اشرافی استبدادی اپنے اپنے مفاد کے لیے قوانین وضع کرتی ہیں، اور ان قوانین کو جنھیں وہ اپنے اغراض و مفاد کی خاطر وضع کرتی ہیں وہ ۲۴
اپنی رعایا کو عدالت کے طور پر حوالے کر دیتی ہیں اور جو کوئی ان کی خلاف ورزی کرتا ہے، اس کو سزا دیتی ہیں........ میں بڑے پیمانے پر بے انصافی کا ذکر کر رہا ہوں، اور میری مراد سب سے واضح طور پر استبدادی حکومت میں ظاہر ہوتی ہے جو دھوکے اور جبر سے دوسروں کا مال لیتی ہے، اور چھوٹے پیمانے پر نہیں بلکہ بڑے پیمانے پر لیتی ہے جب ایک شخص شہریوں کا روپیہ لے کر ان کو غلام بنا چکتا ہے، تو دھوکے باز اور ڈاکو کہلانے کے بجائے وہ بامسرت اور بارحمت کہلاتا ہے۔ کیونکہ ظلم و بے انصافی پر اس لیے ملامت کی جاتی ہے، کہ جو لوگ اس پر ملامت کرتے وہ اس لیے ملامت نہیں کرتے کہ انھیں خود ظلم و بے انصافی کرنے میں باک ہوتا ہے بلکہ اس لیے ملامت کرتے ہیں کہ وہ بے انصافی کا شکار ہونے سے ڈرتے ہیں (۳۳۸ — ۳۴۴)۔

بے شک یہ وہ تعلیم ہے جو کم و بیش صحت کے ساتھ نیٹشے کے نام سے منسوب کی جاتی ہے۔ "درحقیقت میں کئی بار ان کمزوروں پر ہنسا ہوں جو اپنے آپ کو اس بنا پر اچھا خیال کرتے تھے کہ ان کے پیروں میں لنگ تھا۔ اسٹرنر نے جب یہ کہا کہ "ایک مٹھی بھر طاقت ایک تھیلے بھر حق سے بہتر ہے" تو اس نے اسی خیال کو مختصر طور پر بیان کیا تھا۔ شاید تاریخ فلسفہ میں اس نظریے کو اس سے بہتر کہیں بیان نہیں کیا گیا ہے، جیسا کہ خود فلاطون نے ایک دوسرے مکالمے گارجیاس (۴۸۳ ف) میں بیان کیا ہے، جہاں سوفسطائی کیلی کلس اخلاق کی مذمت کرتا ہے، اور یہ کہتا ہے کہ یہ طاقتوروں کی طاقت کے باطل

کرنے کے لیے کمزوروں کا اختراع ہے۔

وہ تحسین و ملامت کو اپنی اغراض کے لحاظ سے تقسیم کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بد دیانتی شرمناک اور ظلم ہے ـــــ اور ان کی مراد بد دیانتی سے اپنے ہمسایوں سے زیادہ حاصل کرنے سے ہے۔ کیونکہ وہ اپنی پستی سے واقف ہوتے ہیں اس لیے ان کے واسطے مساوات ہی بہت کچھ ہوتی ہے .... لیکن اگر ایسا آدمی ہو، جس کے پاس کافی طاقت ہو (فوق الانسان کو داخل کرلو) تو وہ ان تمام پابندیوں سے اپنا پیچھا چھڑائے گا، اور ان کو توڑ کر بھاگ نکلے گا، وہ ہمارے تمام ضابطوں اور تمام افسونوں اور ہمارے تمام قوانین کو جو فطرت کی خلاف ورزی کرتے ہیں، پامال کردے گا........ جو شخص صحیح معنی میں زندہ رہنا چاہتا ہے اسے اپنی خواہشوں کو انتہا درجے تک بڑھنے دینا چاہیئے، اور جب وہ انتہا درجے تک بڑھ جائیں تو اس کے اندر ان کے پورا کرنے کی عقل و جراءت ہونی چاہیئے۔ اسی کو میں فطری عدالت و شرافت کہتا ہوں۔ مگر بہت سے لوگ ایسا نہیں کرسکتے، اس لیے وہ ایسے لوگوں پر الزام دھرتے ہیں، کیونکہ وہ اپنی ناقابلیت پر شرمسار ہوتے ہیں جس کو وہ چھپانا چاہتے ہیں، لہذا وہ بے اعتدالی دنائت کہتے ہیں .... وہ اپنے سے زیادہ شریف فطرتوں کو غلام بنالیتے ہیں، اور وہ عدالت کی صرف اس لیے تعریف کرتے ہیں کہ وہ بزدل ہوتے ہیں۔ ۲۵

یہ عدالت انسانوں کے لیے نہیں بلکہ پیادوں کے لیے اخلاق ہے (Oudegar andros all andrapodontions) یہ غلامانہ اخلاق ہے، بطلی اخلاق نہیں ہے۔ انسان کی حقیقی فضیلتیں شجاعت (andceia) اور عقل (Phronesis) ہیں[۱]۔

شاید یہ سخت "بد اخلاقیت" ایتھنز کی خارجی پالیسی میں ملوکیت کے نشو و نما اور کمزور ریاستوں کے ساتھ ظالمانہ برتاو کا پتا دے رہی ہے۔ پرنکلیز

۱۔ گارجیاس ۴۹۱۔ دیکھو مشیو لی کی نیکی کی تعریف کہ یہ عقل جمع طاقت ہے۔

اس تقریر میں جو تھوسی ڈائڈیز اس کے لیے تصنیف کرتا ہے[۱] کہتا ہے کہ تمھاری سلطنت تمھاری رعایا کی خیر اندیشی پر نہیں بلکہ تمھاری قوت بازو پر قائم ہے" یہی مورخ اس واقعے کی خبر دیتا ہے کہ ایتھنز کے سفیر میلوسس کو اسپارٹا کے خلاف ایتھنز کا ساتھ دینے پر اس طرح سے مجبور کرتے ہیں" تم بھی جانتے ہو اور ہم بھی جانتے ہیں کہ دنیا کا دستور یہ ہے کہ حق کا سوال صرف مساوی قوتوں میں ہوتا ہے، ورنہ قوی جو کر سکتے ہیں، کرتے ہیں، اور کمزوروں پر جو کچھ پڑتی ہے، اس کو برداشت ہی کرنا پڑتا ہے"[۲] یہاں ہم اخلاقیات کا اساسی مسئلہ پاتے ہیں، جو کردار اخلاقی کے نظریے کا مغز ہے۔ عدالت کیا ہے ؟ ہم حق پرستی کے لیے کوشش کریں یا قوت کے لیے۔ نیک ہونا بہتر ہے یا طاقتور ہونا۔

سقراط یعنی فلاطون اس نظریے کی مبازرت کا کس طرح مقابلہ کرتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ عدالت افراد کے مابین ایک رشتہ ہوتا ہے جو معاشری تنظیم پر مبنی ہے۔ لہذا اس کا مطالعہ شخصی کردار کی صفت کی نسبت ایک جماعت کی ساخت کے جزو کی حیثیت سے بہتر طریق پر ہو سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ہم ایک عادل مملکت کی تصویر کھینچ سکیں تو ہم ایک عادل فرد کو زیادہ اچھی طرح سے بیان کر سکیں گے۔ فلاطون اپنے بحث سے ہٹ جانے کا یہ عذر پیش کرتا ہے، کہ ایک شخص کی نظر کا امتحان کرتے وقت تم اس سے پہلے موٹے حروف پڑھواتے ہیں، اور پھیر باریک اسی طرح سے عدالت کی تحلیل کرتے وقت فرد کے انفرادی عمل 26
کے بجائے اگر معاشرے کے عمل کو لیا جائے، تو مقابلتہً سہولت ہو گی۔ مگر ہم کو دھوکا نہ کھانا چاہئے۔ دراصل وہ دو کتابوں کو ایک ساتھ جوڑ رہا ہے، اور اس دلیل کو جوڑ کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔ وہ صرف شخصی اخلاق کے مسائل ہی سے بحث نہیں کرنا چاہتا بلکہ معاشری اور سیاسی تعمیر جدید سے بھی بحث کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی آستین میں ایک یوٹوپیا رکھتا ہے، اور اس کے

۱۔ بارکر صفحہ ۷۳۔
۲۔ پی لا پونیسی جنگ کی تاریخ صفحہ ۱۰۵

پیدا کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ اس کو معاف کر دینے میں کچھ دشواری نہیں، کیونکہ یہ گریز ہی اس کی کتاب کا مغز اور اس کی اصل قیمت ہے۔

ف۔ سیاسی مسئلہ

فلاطون کہتا ہے اگر آدمی سادہ ہوں، تو عدالت سادہ معاملہ ہو گی، ایک نراجی اشتراکیت کافی ہو گی۔ ایک لمحے کے لیے وہ اپنے تخیل کو جولانی کا موقع دیتا ہے۔

پہلے ہم کو اس امر پر غور کرنا چاہیئے کہ ان کا طریق زندگی کیا ہو گا...... کیا وہ غلہ شراب لباس جوتے پیدا نہ کریں گے۔ کیا وہ اپنے لیے مکان تعمیر نہ کریں گے۔ اور مکانوں میں رہنے کے بعد وہ گرمی میں معمولی طور پر لباس اتار کر اور برہنہ پا لیکن سردی میں اچھی طرح سے کپڑے اور جوتے پہن کر کام کریں گے۔ جو اور گندم ان کی غذا ہو گی، اور وہ گیہوں کو پکا لیں گے اور آٹے کو گوندھیں گے، اور اس سے عمدہ حلوے اور ڈبل روٹیاں تیار کریں گے ان کو وہ سرکنڈوں کی چٹائی یا صاف پتوں پر چنیں گے اور خود پلنگوں پر یا خنا کی شاخوں سے سہارا لے کر بیٹھ جائیں گے، اور وہ اور ان کے بچے کھائیں گے اور اپنی بنائی ہوئی شراب پئیں گے، ان کے سروں پر پھولوں کے گجرے ہوں گے اور لبوں پر معبودوں کی ثنا و صفت ہو گی۔ وہ دلچسپ صحبت میں زندگی بسر کریں گے، اور اسراف کا خیال رکھیں گے، کہ ان کے خاندان ان کے وسائل سے متجاوز نہ ہوں، کیونکہ افلاس اور جنگ پر ان کی نظر رہے گی ...... بے شک ان کو ذائقہ دار چیزوں کی بھی ضرورت ہو گی۔ نمک زیتون پنیر اور پیاز بند گوبھیاں یا دوسرے قسم کے ساگ پات جو ابالنے کے لیے موزوں ہوں اور ہم ان کو کھانے کے لیے انجیر دالیں سیم ببیر اور کسیرو دیں گے جن کو وہ آگ میں بھون لیں گے،

اور شراب اعتدال کے ساتھ پئیں گے۔ اس قسم کی غذا سے امید کی جاتی ہے کہ وہ سکون کے ساتھ کافی بڑھاپے تک زندہ رہیں گے اور اپنے بعد ایسی ہی زندگی اپنے بچوں کو ورثے میں دیں گے۔ (۳۷۲)

دیکھو کہ یہاں پر آبادی کے قابو میں رکھنے کا بھی ضمناً تذکرہ آگیا ہے (غالباً قتل اطفال کے ذریعے سے) سبزی خوری اور عود الی الفطرت ۲۷
اور ابتدائی سادگی کا بھی جس کی عبرانی روایت باغ عدن میں تصویر قائم کرتی ہے، حوالہ آگیا ہے۔ کل سے دیوجانسن کلبی کا انداز ٹپکتا ہے، جس کا جیسا کہ نام بتاتا ہے یہ خیال تھا کہ ہم کو حیوان بن جانا اور حیوانوں کے ساتھ رہنا چاہیئے، کیونکہ وہ بہت صابر و شاکر ہوتے ہیں، اور ایک سمجھنے کے لیے ہم افلاطون کو سینٹ سائمن اور فوریئے اور ولیم مارس اور ٹالسٹائی کی صف میں کھڑا کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ ان آدمیوں کے مقابلے میں ذرا کچھ زیادہ ارتیابی ہے۔ وہ نہایت خاموشی کے ساتھ اس سوال پر آجاتا ہے کہ ایسی سادہ بہشت جیسی کہ اس نے بیان کی معرض وجود میں کیوں نہیں آجاتی۔ یہ یوٹوپیا نقشے کے اوپر کیوں نہیں آجاتا؟

اس کا جواب وہ یہ دیتا ہے، کہ حرص اور تعیش کی وجہ سے، لوگ سادہ زندگی پر قانع نہیں ہوتے۔ ان میں طمع حرص مقابلہ اور حسد کا مادہ ہوتا ہے۔ جو کچھ وہ رکھتے ہیں اس سے بہت ہی جلد بیزار ہو جاتے ہیں، اور جو کچھ ان کے پاس نہیں ہوتا اس کی آرزو میں مرنے لگتے ہیں۔ اور وہ بہت کم کسی شے کی خواہش کرتے ہیں جب تک کہ یہ کسی دوسرے کی ملکیت نہ ہو۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک جماعت دوسرے کے علاقے پر دست درازی کرتی ہے، اور وسائل زمین کی خاطر جماعتوں میں رقابت ہوتی ہے اور پھر جنگ ہوتی ہے۔ تجارت اور مالیہ ترقی کرتے ہیں اور طبقات قائم کر دیتے ہیں۔ درحقیقت ہر معمولی شہر دو شہروں پر مشتمل ہوتا ہے، ایک غربا کا شہر ہوتا ہے اور ایک امرا کا جن میں سے ہر ایک دوسرے سے برسرپیکار ہوتا ہے۔ تاجروں کا ایک درمیانی طبقہ پیدا ہو جاتا ہے، جس کے افراد معاشری وجاہت دولت اور

نام و نمود کے کاموں سے حاصل کرنا چاہتے ہیں یعنے وُہ اپنی بیویوں پر بڑی بڑی رقمیں صرف کر دیتے ہیں" (۵۴۸)۔ تقسیم دولت کے یہ تغیرات سیاسی تغیرات پیدا کرتے ہیں۔ جب تاجر کی دولت زمیندار کی دولت سے بڑھ جاتی ہے تو اشرافیہ کی جگہ دولت مندی عدیدیہ لے لیتی ہے یعنے دولت مند تاجر اور ساہوکار مملکت پر فرمانروائی کرتے ہیں۔ پھر تدبر کی جگہ جو معاشری قوتوں کی تنظیم اور نشو و نما کے لحاظ سے پالیسی کا تطابق ہے، سیاسیات لے لیتی ہے۔ جو جماعت کی چالبازی غنائم جاہ و منصب کی حرص ہے۔

حکومت کی ہر صورت اپنے بنیادی اصول کی افراط سے فنا ہو جاتی ہے۔ اشرافیہ اس حلقے کو بہت ہی محدود کر کے، جس کے اندر قوت محدود ہوتی ہے۔ خود کو تباہ کر لیتی ہے۔ عدیدیہ کی تباہی کا باعث یہ ہوتا ہے کہ یہ نادانی سے قریبی دولت کے سمیٹنے کی کوشش کرتی ہے۔ ہر دو صورتوں میں انجام کار انقلاب ہوتا ہے۔ جب انقلاب ہو جاتا ہے تو ممکن ہے یہ معلوم ہو کہ یہ چھوٹے چھوٹے اسباب اور ادنی درجے کے اوہام کے باعث ہوا ہے۔ لیکن اگرچہ
یہ خفیف واقعات سے پیدا ہو، مگر اس کا اصل باعث شدید اور مجموعی زیادتیاں ۲۸۰
ہوتی ہیں۔ جب ایک جسم امراض سے غفلت برتنے کی بناء پر کمزور ہو جاتا ہے، تو محض باہر نکلنے سے شدید مرض لاحق ہو سکتا ہے (۵۵۶)۔ پھر عمومیہ آتی ہے، غربا اپنے حریفوں پر غالب آجاتے ہیں، ان میں سے وہ کچھ کو قتل اور کچھ کو جلاوطن کر دیتے ہیں، اور لوگوں کو آزادی اور قوت کا مساوی حصہ دیتے ہیں (۵۵۷)۔

لیکن عمومیہ بھی عمومیت کی افراط سے اپنے کو تباہ کر لیتی ہے۔ اس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ عہدے کے حاصل کرنے اور اجتماعی سیاست کے متعین کرنے میں سب کا حق مساوی ہے۔ بادی النظر میں یہ ایک دلچسپ انتظام ہے۔ مگر یہ اصول مہلک بن جاتا ہے کیونکہ عوام بہترین حکمران کے انتخاب اور سب سے دانشمندانہ طرق عمل کے اختیار کرنے کے لیے ضروری تعلیم سے مسلح نہیں ہوتے (۵۵۸)" عوام کے متعلق یہ ہے کہ وہ کوئی فہم

نہیں رکھتے، اور صرف اس کو دہراتے ہیں جو ان کے حکمران ان سے کہہ دیتے ہیں"(پروٹاگورس ، ۳۱۷) کسی نظریے کو قبول یا رد کرنے کے لیے یہ کافی ہوتا ہے کہ کسی مقبول عام تمثیل میں اس کی تعریف یا مذمت کرادی جائے (بلاشبہہ یہ اشارہ ارسٹوفینیز کی طرف ہے جس کے طربیے تقریباً ہر نئے تصور پر حملہ کرتے تھے) حکومت عوام جہاز مملکت کے لیے ایک طوفانی سمندر ہے۔ خطابت کا ہر طوفان اس کو ہلا کر راستے سے ہٹا دیتا ہے۔ اس قسم کی عمومیہ کا نتیجہ استبدادیت یا شخصی حکومت ہوتی ہے۔ مجمع عوام خوشامد کو اس قدر پسند کرتا ہے اور یہ دوشہد کا اس قدر بھوکا ہوتا ہے" کہ آخر کار سب سے بدمعاش اور سب سے بد دیانت خوشامدی اپنے آپ کو لوگوں کا محافظ کہہ کر" اعلیٰ اقتدار حاصل کرلیتا ہے (۵۶۵)۔(تاریخ روم پر غور کرو)

عوام کے وہم و حماقت پر سیاسی عہدہ داروں کے انتخاب کو چھوڑ دینے پر جتنا ہی فلاطون زیادہ غور کرتا ہے، اتنی ہی اس کو زیادہ حیرت ہوتی ہے، چہ جائیکہ اس کو ان سایہ صفت اور دولت پرست چالبازوں کے سپرد کردینا، جو عمومی اکھاڑے کے پیچھے سے عدیدی تار کھینچتے ہیں۔ فلاطون کہتا ہے کہ بہت سادہ معاملات (مثلاً جوتا بنانا) میں ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ صرف خاص طور پر تربیت یافتہ شخص ہماری غرض کو پورا کرسکتا ہے۔ مگر
29 سیاسیات میں ہم نے یہ فرض کر رکھا ہے کہ ہر وہ شخص جو یہ جانتا ہے کہ رائیں کس طرح سے حاصل کی جاسکتی ہیں، وہ ایک شہر یا مملکت کے انتظام سے بھی واقف ہوتا ہے۔ جب ہم بیمار ہوتے ہیں تو ہم ایک تربیت یافتہ طبیب کو بلاتے ہیں، جس کی سند اس کی خاص تیاری اور فنی قابلیت کی ضمانت ہوتی ہے۔ ہم سب سے خوبصورت طبیب کو یا سب سے زباں آور طبیب کو نہیں بلاتے۔ اچھا جب کل مملکت علیل ہو تو کیا ہم کو سب سے عقلمند اور سب سے بہتر شخص کی خدمت اور رہبری کی جستجو نہ کرنی چاہیے؟ نالائق اور بدمعاش آدمیوں کو سرکاری عہدے پر پہنچنے سے روکنا اور عام خیر و فلاح کی خاطر بہترین اشخاص کو انتخاب کرکے حکومت کے لیے تیار کرنا

سیاسی فلسفے کا مسئلہ ہے۔

ف ۶۔ نفسیاتی مسئلہ

لیکن ان سیاسیاتی مسائل کی تہ میں فطرت انسانی ہوتی ہے، سیاسیات کے سمجھنے کے لیے ہمیں بد قسمتی سے نفسیات کو سمجھنا پڑتا ہے۔ "انسان اور مملکت میں مشابہت ہے (۵۷۵)" حکومتوں میں بھی ایسا ہی فرق ہوتا ہے، جیسا کہ انسان کی سیرتوں میں فرق ہوتا ہے .... مملکت فطرت انسانی کی بنی ہوئی ہوتی ہے جو اس کے اندر ہوتی ہیں" (۵۴۴)۔ اس لیے ہم اس وقت تک بہتر مملکتوں کی توقع نہیں کر سکتے"، جب تک کہ ہمارے پاس بہتر آدمی نہ ہوں۔ اس وقت تک تمام تغیرات ہر اہم چیز کو غیر متغیر رکھیں گے۔ "کیسے دلچسپ وہ لوگ ہوتے ہیں، جو ہمیشہ علاج کرتے اور اپنی تکلیفوں کو بڑھاتے اور پیچیدہ بناتے چلے جاتے ہیں، اور یہ خیال کرتے ہیں، کہ کہیں سے کوئی عطائی نسخہ ہاتھ آجائے گا، اور وہ اچھے ہو جائیں گے، مگر ان کی حالت ہمیشہ بد سے بدتر ہوتی چلی جاتی ہے...... کیا ان لوگوں کا عمل کھیل کے مساوی نہیں ہے، جو اپنا ہاتھ قانون سازی پر صاف کرنا چاہتے ہیں، اور یہ خیال کرتے ہیں کہ اصلاحات کے ذریعے سے وہ بنی نوع انسان کی بد دیانتیوں اور بدمعاشیوں کا خاتمہ کر دیں گے اور ان کو یہ علم نہیں ہے، کہ وہ درحقیقت ایک ہائڈرا[لہ] کا سر کاٹ رہے ہیں؛" (۴۲۵)

آؤ پہلے ایک لمحے کے لیے انسانی مواد پر غور کریں جس پر فلسفۂ سیاسی کو

لہ۔ یونانی ضمیات میں ہائڈرا اس سانپ کو کہتے ہیں جس کے ایک سر کے کاٹنے کے ساتھ بہت سے سر پیدا ہو جائیں۔ مترجم

بحث کرنی پڑتی ہے۔ ۰ صفحہ

فلاطون کہتا ہے کہ انسانی عمل کے اصل باعث تین ہوتے ہیں، خواہش، جذبہ اور علم۔ خواہش، اشتہا، تسویق، جبلت یہ سب ایک ہیں۔ جذبہ، جوش، حرص، شجاعت، یہ سب ایک ہیں۔ علم، فکر، عقل، فہمی اور عقل استدلالی یہ سب ایک ہیں۔ خواہش کا مرکز کولے ہوتے ہیں۔ یہ توانائی کا ابلتا ہوا سرچشمہ ہے، اور اساسی طور پر صنفی ہوتا ہے۔ جذبے کا مرکز قلب ہوتا ہے، یعنی خون کی روانی اور اس کی قوت، یہ تجربہ اور خواہش کی عضوی گونج ہے۔ علم کا مرکز سر ہے، یہ خواہش کی آنکھ ہے اور روح کا رہبر بن سکتا ہے۔

یہ قوتیں اور اوصاف سب کے سب انسانوں میں ہوتے ہیں، مگر مختلف مدارج میں بعض لوگ خواہش کے مجسمہ ہوتے ہیں۔ ان کی روحیں بے چین اور حریص ہوتی ہیں۔ یہ لوگ مادی تلاشوں اور جھگڑوں میں منہمک رہتے ہیں، عیش و نمائش کی آرزو پر مرتے ہیں۔ یہ اپنے اکتسابات کو اپنے ہمیشہ پیچھے ہٹ جانے والے مقاصد کے مقابلے میں ہیچ بتاتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو صنعت و حرفت پر قابض و متصرف ہوتے ہیں، لیکن اور لوگ ایسے ہوتے ہیں، جو احساس اور شجاعت کے مرکز ہیں، جن کو اس کی کچھ بہت زیادہ پروا نہیں ہوتی کہ وہ کس شے کے لیے لڑ رہے ہیں، بلکہ خود فتح کی پروا ہوتی ہے۔ یہ لوگ اس قدر اکتسابی نہیں ہوتے جتنے کہ لڑاکو ہوتے ہیں، ان کو فخر قبضے پر نہیں بلکہ قبضہ کر لینے کی طاقت پر ہوتا ہے، ان کو خوشی بازار میں نہیں بلکہ کارزار میں ہوتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں، جن سے دنیا کی بری اور بحری فوجیں تیار ہوتی ہیں۔ اور سب سے آخر میں وہ چند لوگ ہوتے ہیں، جن کو صرف تفکر و فہم سے دلچسپی ہوتی ہے۔ ان لوگوں کو مال و متاع یا فتح و کامرانی کی نہیں، بلکہ علم کی آرزو ہوتی ہے۔ یہ لوگ بازار اور کارزار دونوں کو تفکر کے گوشۂ عافیت کی خاطر چھوڑ دیتے ہیں، ان کا ارادہ نار نہیں بلکہ نور ہوتا ہے، جن کی جنت طاقت نہیں بلکہ صداقت ہوتی ہے۔ یہ لوگ صاحب حکمت ہوتے ہیں جو الگ تھلگ کھڑے رہتے ہیں اور جن سے دنیا کام نہیں لیتی۔

اب جس طرح سے موثر انفرادی عمل سے یہ مترشح ہوتا ہے، کہ خواہش
کو اگرچہ جذبے نے گرما دیا ہے، مگر علم اُس کی رہبری کر رہا ہے، اسی طرح
سے کامل مملکت کے اندر صنعتی قوتیں اگرچہ پیدا کریں گی مگر وہ حکومت
نہ کریں گی فوجی قوتیں حفاظت کریں گی مگر وہ فرمانروائی نہ کریں گی علم و حکمت
اور فلسفے کی قوتوں کو تقویت پہنچائی جائے گی اور وہ حکومت کریں گی علم کی
رہبری کے بغیر لوگ ایک ہجوم ہوتے ہیں جس میں کوئی ترتیب نہیں ہوتی،
جس طرح سے کہ پریشان خواہش ہوتی ہے۔ لوگوں کو فلاسفہ کی اسی طرح
سے رہبری کی ضرورت ہوتی ہے جس طرح سے خواہشوں کو علم کی روشنی کی
ضرورت ہوتی ہے۔ "تباہی اس وقت آتی ہے جب ایک تاجر کا دل دولت
۳۱ کی فراوانی سے بلند پروازی کرتا ہے، اور وہ فرمانروا ہو جاتا ہے" (۴۳۴)
یا جب ایک سردار اپنی فوج کو ایک فوجی آمریت کے قائم کرنے کے لیے استعمال
کرتا ہے۔ صناع اور کاشتکار اپنے معاشی حلقے میں سب سے بہتر ہوتا ہے،
سپاہی میدان جنگ میں سب سے زیادہ موزوں ہوتا ہے، مگر یہ دونوں سرکاری
عہدے پر بدترین ہوتے ہیں، اور ان کے ناتجربے کار ہاتھوں میں سیاسیات و
تدبر کا بیڑا غرق ہو جاتا ہے۔ کیونکہ تدبر ایک حکمت اور صناعت ہے۔ ایک
شخص کو اس کے لیے اپنی زندگی گزارنی چاہیے، اور ایک عرصے سے اس
میں مشاق ہونا چاہیے، صرف ایک فلسفی بادشاہ قوم کی رہبری کے لیے مناسب
ہوتا ہے "جب تک فلاسفہ بادشاہ نہ ہوں گے یا بادشاہ ہوں اور شاہزادوں
میں فلسفے کی روح اور قوت نہ ہوگی، اور حکمت اور سیاسی سرداری ایک ہی
شخص میں جمع نہ ہوں گی .... اس وقت تک شہر اور نسل انسانی شر
سے بری نہیں ہو سکتے" (۴۷۳)۔

فلاطون کے فکر کی ڈاٹ کا یہ کلیدی پتھر ہے۔

ف۔ نفسیاتی حل

اچھا تو پھر کیا کیا جائے؟
ہمیں یہ کرنا چاہیے، کہ شہر کے تمام اُن لوگوں کو جو دس سال سے زیادہ عمر کے
ہوں دیہات میں بھیج دینا چاہیے۔ اور بچوں پر قبضہ کر لینا چاہیے جو اس طرح
سے والدین کی عادات سے محفوظ رہ سکیں گے" (۵۴۰) ہم ایسے نوجوان لوگوں
سے اپنا یوٹوپیا نہیں بنا سکتے، جو ہر ہر موقع پر اپنے والدین کی مثال سے متاثر ہو کر
خراب ہوں۔ جہاں تک ممکن ہو ہمیں صفحۂ سادہ سے آغاز کرنا چاہیے۔ یہ بالکل
ممکن ہے "کہ کوئی روشن خیال فرمانروا اپنی قلمرو کے کسی حصے یا نو آبادی میں
ہمیں اس قسم کی ابتدا کرنے کی اجازت دیدے (آیندہ چل کر معلوم ہو گا کہ ایک
فرمانروا نے اس امر کی اجازت دیدی تھی) بہر صورت ہمیں ہر بچے کے لیے
شروع سے تعلیمی مواقع کی کامل مساوات کا انتظام کرنا چاہیے۔ یہ بات کسی طرح
سے نہیں کہی جا سکتی کہ عالی دماغی اور طباعی کی روشنی کہاں سے پھوٹ
نکلے گی۔ ہمیں اس کو غیر جانبداری سے ہر طبقے اور ہر نسل میں تلاش کرنا چاہیے۔
ہماری سڑک کا پہلا موڑ عام تعلیم ہے۔
زندگی کے ابتدائی دس سال میں تعلیم بیشتر جسمانی ہو گی۔ ہر مدرسے میں
ایک ورزش گاہ اور ایک کھیل کا میدان ہونا چاہیے۔ کھیل اور ورزشی تفریحات
ہی پر نصاب تعلیم مشتمل ہونا چاہیے اور پہلے دس سال میں ایسی صحت بن جائے گی،
جس کی وجہ سے ہر قسم کی طب غیر ضروری ہو جائے گی۔ "طبی امداد کا اس لیے ۳۲
طالب ہونا کہ کاہلی اور تعیش کی زندگی سے انسانوں نے خود کو گڑھوں کی طرح
سے پانی اور ہوا .... یعنی نفخ اور نزلے سے بھر لیا ہے ـــــ کیا یہ توہین
نہیں ہے؟ .... ہمارے موجودہ نظام طب کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے

کہ یہ بیماریوں کی تعلیم دیتا ہے" یعنے یہ ان کو اچھا کرنے کے بجائے ان کو طول دیتا ہے۔ مگر یہ کاہل امرا کی لغویت ہے۔ "جب ایک بڑھئی بیمار ہوتا ہے تو وہ طبیب سے کسی آسان اور زود اثر علاج کی فرمائش کرتا ہے ...... مثلاً استفراغ لانے والی یا مسہل دوا یا نشتر۔ لیکن اگر کوئی شخص اس سے یہ کہے کہ اس کو ایک عرصے تک خاص قسم کی غذا استعمال کرنی ہوگی، یا سر کو لپیٹنا سیٹنا پڑے گا، اور ایسی دوسری چیزیں کرنی ہوں گی، تو وہ فوراً جواب دیتا ہے کہ میرے پاس بیمار ہونے کے لیے وقت نہیں ہے، اور مجھے ایسی زندگی میں کوئی فائدہ دکھائی نہیں دیتا، جس میں اپنے معمولی پیشے کو چھوڑ کر بیماری کو پالنا پڑے۔ لہذا وہ اس قسم کے طبیبوں کو خدا حافظ کہہ کر اپنی معمولی غذا شروع کر دیتا ہے، اور یا تو اچھا ہو جاتا ہے اور زندہ رہ کر اپنا کاروبار انجام دیتا ہے۔ یا اگر اس کے جسم میں قوت مدافعت باقی نہیں رہتی تو وہ مر کر اس مرض کا خاتمہ کر دیتا ہے" (۴۰۵ ــــ ۴۰۶)۔ ہم کمزوروں اور مریضوں کی ایک قوم کو نہیں رکھ سکتے۔ یوٹوپیا کی ابتدا انسان کے جسم سے ہونی چاہیے۔

لیکن محض پہلوانی اور ورزش ایک آدمی کو ضرورت سے زیادہ یک رخہ بنا دیگی۔ "ہمیں ایسی طبع سلیم کہاں سے ملے گی، جس میں شجاعت بھی کثرت سے ہو۔ کیونکہ یہ تو ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتی ہیں" (۳۷۵)۔ ہمیں انعام کی خاطر لڑنے والوں اور وزن اٹھانے والوں کی قوم کی ضرورت نہیں ہے، شاید موسیقی سے ہماری دشواری رفع ہو جائے گی۔ موسیقی کے ذریعے سے روح ہمنوائی اور تال میل سیکھتی ہے۔ اور عدالت کا رجحان بھی۔ کیونکہ جس شخص کی ساخت میں ہمنوائی ہوگی، وہ کس طرح سے کبھی غیر عادل ہو سکتا ہے۔ گلاکن کیا ایسا نہیں ہے۔ موسیقی کی تعلیم اسی لئے اس قدر موثر و قوی ہوتی ہے، کہ اس طرح سے تال میل اور ہمنوائی کو روح کی خفیہ جگہوں میں راستہ مل جاتا ہے، جو ان کی حرکات میں دل آویزی پیدا کرتے ہیں، اور روح کو دل آویز بنا دیتے ہیں" (۴۰۱ ــــ پروٹاگورس ۳۲۶) موسیقی سیرت کو ڈھال دیتی ہے، اس لیے یہ معاشری اور سیاسی نتائج کے متعین کرنے میں حصہ رکھتی ہے"

"ڈیمن کہتا ہے اور مجھے اس کے کہنے پر بالکل یقین ہے، کہ جب موسیقی کی شکلیں بدلتی ہیں تو ان کے ساتھ مملکت کے اساسی قوانین بدل جاتے ہیں[1]"

۴۳ موسیقی صرف اسی لیے اہم نہیں ہے، کہ اس سے احساس اور سیرت میں پاکیزگی پیدا ہوتی ہے، بلکہ یہ اس لیے بھی ضروری ہے، کہ یہ صحت کو باقی رکھتی اور واپس لاتی ہے۔ بعض امراض ایسے ہیں جن کا علاج صرف ذہنی طریقے ہی سے ہو سکتا ہے (کارمیڈیز، ۱۵۷) اسی لیے کاری بینٹک پجاری ان عورتوں کا جن پر اختناق الرحم کا دورہ ہوتا تھا اس طرح سے علاج کرتا تھا کہ ان کے سامنے الغوزہ بجاتا تھا، جس کی وجہ سے وہ ناچنے لگتی تھیں، اور اتنا ناچتی تھیں کہ آخر کار تھک کر زمین پر گر پڑتی تھیں اور سو جاتی تھیں۔ جاگنے پر وہ صحت یاب ہو جاتی تھیں۔ اس قسم کے طریقوں سے فکر انسانی کے غیر شعوری ذرائع متاثر ہوتے اور سکون پاتے ہیں۔ اسی قسم کے عمل و احساس کی زمین طباعی میں اپنی جڑ گاڑتی ہے۔ شعوری حالت میں کوئی شخص صحیح یا الہامی وجدان تک نہیں پہنچتا بلکہ اس کو یہ حالت اس وقت نصیب ہوتی ہے، جب عقل کی قوت نیند یا بیماری یا خفیف العقلی سے مقید ہوتی ہے بنی Mantike یا طباع مجنون ؛ Manike کے مشابہ ہوتا ہے (فیڈرس ۲۴۴)۔

فلاطون سے یہاں نفسی تحلیل، کی نسبت حیرت انگیز قسم کی پیش دستی کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کا استدلال ہے کہ ہماری سیاسی نفسیات پریشان ہے کیونکہ ہم نے انسان کی مختلف اشتہادوں جبلتوں کا اچھی طرح سے مطالعہ نہیں کیا ہے، ان میں سے بعض دقیق اور نسبتاً زیادہ گریزاں رجحانات کا خوابوں سے پتا لگ سکتا ہے۔

بعض ضروری لذتیں اور جبلتیں ناجائز خیال کی جاتی ہیں۔ یہ بظاہر ہر شخص میں ہوتی ہیں، لیکن بعض اشخاص میں یہ قانون اور عقل کے

[1] مقابلہ کرو ڈینیئل او کافل کہتا ہے کہ "مجھے ایک قوم کے گیت لکھنے دو، اور اس کی مجھے پروا نہیں ہے کہ اس کے قوانین کون بناتا ہے۔"

تابع رہتی ہیں ("Sublimated") اور بہتر قسم کی خواہشیں ان پر غلبہ پالیتی ہیں، جس کی بنا پر یا تو یہ بالکل دب جاتی ہیں، یا طاقت اور تعداد میں کم ہوجاتی ہیں۔ ان کے مقابلے میں اور اشخاص میں یہ خواہشیں زیادہ قوی اور زیادہ کثرت سے ہوتی ہیں۔ میری مراد خصوصیت کے ساتھ ان خواہشوں سے ہے، جو اس وقت بیدار ہوتی ہیں، جب شخصیت کی استدلال کرنے مطیع کرنے اور حکومت کرنے والی ("مانع") قوت خفتہ ہوتی ہے۔ یہ ہماری فطرت کے اندر کا وحشی درندہ گوشت اور پانی ٹھونس کر اٹھتا ہے اور برہنہ ٹہلنے کے لیے نکلتا ہے، اور اپنے حسب منشا اس کو ہضم کرتا ہے۔ کوئی ایسی حماقت یا جرم نہیں ہوتا، کتنی ہی بے حیائی کا اور خلاف فطرت کیوں نہ ہو، جس سے زنا بالمحرمات اور قتل والدین تک مستثنے نہیں (Oedipus complex) جس کا اس قسم کی فطرت سے مرتکب ہو جانے کا امکان نہ ہو .... لیکن جب ایک انسان کی نبض صحت مند اور معتدل ہوتی ہے، اور وہ ٹھنڈا اور معقول ہو کر سونے جاتا ہے، اور اپنی اشتہاؤں کو نہ تو گرسنہ رکھتا ہے اور نہ حد سے زیادہ سیر کرتا ہے بلکہ ان کو صرف اس حد تک سیر کرتا ہے کہ ان کو سلا دیتا ہے، تو اس حالت میں اس کے خالی اور مجرمانہ خوابوں کے شکار ہونے کا بہت کم امکان ہوتا ہے .... ہم سب میں حتیٰ کہ نیک آدمیوں میں بھی ۴۷
ایسی وحشی فطرت مخفی ہوتی ہے، جو نیند کے عالم میں ظاہر ہوتی ہے (۵۷۲-۵۷۱)

موسیقی اور باقاعدگی سے روح اور جسم میں دل آویزی اور صحت پیدا ہوتی ہے۔ مگر حد سے زیادہ موسیقی اسی قدر خطرناک ہے جس قدر کہ حد سے زیادہ ورزش محض پہلوان ہونا تقریباً وحشی ہونے کے مساوی ہے۔ محض موسیقی داں ہونے کے معنے یہ ہیں کہ انسان ضرورت سے زیادہ نرم ہو جائے (۴۱۰) دونوں کو مرکب ہونا چاہیے اور سولہ سال کی عمر کے بعد انفرادی طور پر موسیقی کی مشق کو ترک کر دینا چاہیے، اگرچہ مل کر گانا قومی کھیلوں کی طرح سے تمام عمر جاری رہے گا۔ موسیقی کو محض موسیقی نہ رہنا چاہیے،

بلکہ اس سے یہ کام لینا چاہیے کہ یہ ریاضیات تاریخ اور حکمت کے بعض غیر دلچسپ اجزا کو دل پذیر صورت میں پیش کرے۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان مشکل مضامین کو بچوں کے لیے نظم کے ذریعے سے سہل اور نغمے کے ذریعے سے خوبصورت نہ بنایا جائے۔ اس حالت میں بھی ان مضامین کو ایسے شخص کو نہ پڑھایا جائے گا جس کو ان کا شوق نہ ہو، بعض حدود کے اندر اختیاری روح کار فرما رہنی چاہیے۔

تعلیم کے عناصر کو بچپن میں ذہن کے سامنے لانا چاہیے۔ مگر کسی جبر کے ساتھ نہیں کیونکہ آزاد آدمی تحصیل علم میں بھی آزاد رہنا چاہیے...... جو علم جبر کے ذریعے سے اکتساب کیا جاتا ہے، اس کا ذہن پر گہرا نقش نہیں ہوتا۔ لہذا جبر سے کام نہ لو بلکہ ابتدائی تعلیم کو ایک قسم کی تفریح بناؤ۔ اس سے تمھیں بچے کے قدرتی رجحان کا بہتر طور پر پتا چل جائے گا (۵۳۶)۔

ایسے ذہنوں کے ساتھ جن کا اس قدر آزادی کے ساتھ نشو و نما ہو رہا ہو، اور ایسے جسموں سے جو کھیل کود، ورزش، اور ہر قسم کی خارجی زندگی سے مضبوط ہو جائیں گے، ہماری معیاری مملکت کو مضبوط نفسیاتی اور عضویاتی بنیاد مل جائے گی جو ہر امکان اور ہر ترقی کے لیے کافی وسیع ہو گی۔ مگر اخلاقی بنیاد بھی ملنی چاہیے۔ جماعت کے افراد میں اتحاد ہونا چاہیے۔ ان کو سیکھنا چاہیے کہ وہ ایک دوسرے کے اعضا ہیں۔ اور ان کے ایک دوسرے پر حقوق و فرائض ہیں۔ اب چونکہ انسان فطرۃً حریص حاسد لڑاکو اور عاشق مزاج ہوتے ہیں، تو ہم انھیں کس طرح سے اپنا برتاؤ درست رکھنے پر آمادہ کریں گے۔ پولیس کے ہر جگہ موجود رہنے والے ڈنڈے کے ذریعے سے؟ مگر یہ بہیمانہ طریقہ ہے، اس میں صرف بھی زیادہ ہے، اور لوگوں کو ناگوار بھی ہو گا۔ اس سے ایک بہتر طریقہ ہے، اور وہ یہ کہ جماعت کی اخلاقی ضروریات کے لیے فوق العادت اقتدار سے موجب حاصل کیا جائے، یعنے ہمارے پاس ایک مذہب ہونا چاہیے۔

افلاطون کو یقین ہے کہ ایک قوم اس وقت تک مضبوط نہیں ہو سکتی،

جب تک کہ یہ خدا پر عقیدہ نہ رکھے۔ محض کائناتی قوت یا علت اولی یا جوشِ حیات، یعنے وہ شے جس میں شخصیت نہ ہو اس سے امید رکھنے، یا اس کی عبادت کرنے اور اس کے لیے ہر قربانی کرنے کا مشکل ہی سے خیال پیدا ہو سکتا ہے۔ اس سے مصیبت زدوں کو سکون اور لڑنے والوں کو شجاعت حاصل نہیں ہو سکتی۔ لیکن ایک زندہ خدا یہ سب کر سکتا ہے۔ وہ خود کام اشخاص کو متاثر اور خائف کر سکتا ہے جس سے ان کی حرص و آز میں کچھ اعتدال پیدا ہو جائے گا، اور ان کا جذبہ کسی حد تک قابو میں رہے گا۔ اس سے بھی زیادہ اس صورت میں ہو گا، اگر خدا کے عقیدے کے ساتھ شخصی لافنائیت کا عقیدہ بھی زیادہ کر دیا جائے۔ دوسری زندگی کی امید سے خود ہم میں جان دینے کی جراءت پیدا ہوتی ہے، اور اپنے عزیزوں کی موت پر ہم صبر کر سکتے ہیں۔ اگر ہم باایمان ہو کر لڑیں تو ہم دوگونہ مسلح ہوتے ہیں۔ فرض کرو کہ ان عقیدوں میں سے کسی ایک کو بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا، فرض کرو کہ خدا ہماری محبت اور امید کا ایک مجسم نصب العین ہے، اور روح بربط کے نغمے کی مانند ہے اور اس آلے کے ساتھ فنا ہو جاتی ہے، جو اس کو صورت بخشتا ہے، اس کے باوجود یقیناً (پیسکل کی طرح سے فیڈو کا استدلال اسی طرح سے ہے) اس پر عقیدہ رکھنے سے نقصان کوئی نہ ہو گا، اور ہم کو اور ہمارے بچوں کو اس سے بے حد فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

کیونکہ اگر ہم ان کے سادہ ذہنوں کے سامنے ہر شے کی توجیہ کرنے اور ہر بات کے سمجھانے کی کوشش کریں گے تو غالباً ہمیں اپنے ان بچوں سے دشواری کا سامنا ہو گا۔ جب وہ بیس سال کے ہوں گے تو ہم کو خاص طور پر دشواری کا سامنا ہو گا، اور ہم کو پہلی بار جانچنا ہو گا کہ مساوی تعلیم کے اس تمام زمانے میں انھوں نے کیا سیکھا ہے۔ پھر ایک سخت انتخاب ہو گا، ہم اس کو انتخابِ عظیم کہہ سکتے ہیں۔ وہ جانچ محض ایسی نہ ہو گی جیسے مدرسے میں امتحانات ہوتے ہیں۔ یہ امتحان علمی اور نظری دونوں قسم کا ہو گا۔ ان کے لیے محنتیں آلام اور مقابلے بھی تجویز کیے جائیں گے۔" (۴۱۳) ہر قسم کی

قابلیت کو خود کے ظاہر کرنے کا موقع ہوگا، اور ہر قسم کی حماقت کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر روشنی میں لایا جائے گا۔ جو لوگ ناکام رہیں گے، ان کے قوم کا معاشی کام سپرد ۳۰۶ کیا جائے گا۔ وہ کاروباری لوگ محرر کارخانے میں کام کرنے والے اور کاشتکار بنائے جائیں گے۔ جانچ غیر جانبدارانہ اور بے لوث ہوگی۔ یہ امر کہ ایک شخص کاشتکار ہوگا یا فلسفی اس کا تعین کسی طبقے کی اجارہ داری یا قرابتی پاس داری سے نہ ہوگا۔ یہ انتخاب جمہوریت سے بھی زیادہ جمہوری ہوگا۔

جو لوگ اس پہلی جانچ میں کامیاب ہو جائیں گے ان کو دس سال اور جسمی ذہنی اور سیرتی تعلیم و تربیت دی جائے گی۔ پھر ان کا دوسری مرتبہ امتحان ہوگا، جو پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ سخت ہوگا۔ اس امتحان کے اندر جو لوگ ناکام رہیں گے وہ معاون یا مملکت کے غیر فوجی عہدہ دار بنائے جائیں گے۔ اب ان عظیم الشان انتخابات ہی میں ہم کو اپنی لسانی کی پوری قوت سے کام لینا ہوگا، تاکہ وہ لوگ جو ناکام رہے ہیں اپنی تقدیر پر تہذیب و امن و امان کے ساتھ شاکر ہو جائیں۔ کیونکہ اس بڑی جماعت کو جو پہلے انتخاب میں خارج ہوگی، اور اس چھوٹی مگر زیادہ لائق اور طاقتور افراد کی جماعت کو جو دوسرے انتخاب میں ناکام ہوگی، اسلحہ لینے اور ہماری یوٹوپیا کو پارہ پارہ کر دینے سے کون باز رکھ سکتا ہے؟ ان کو اس امر سے کون شے باز رکھے گی کہ وہ اسی وقت ایسی دنیا قائم نہ کرلیں، جس میں محض تعداد یا محض قوت کی حکومت ہو، اور جھوٹی جمہوریت کا نفرت انگیز سوانگ پھر ہونے لگے۔ اس صورت میں مذہب و اعتقاد ہی سے ہم کو نجات مل سکتی ہے۔ ہم ان نوجوانوں سے کہیں گے ان کے اندر جو تقسیم ہوگئی ہے وہ خدا کی طرف سے ہے اور اٹل ہے۔ کتنا ہی وہ روئیں ان کے آنسوؤں سے اس کا ایک لفظ بھی نہ مٹے گا۔ ہم ان سے دھاتوں کا افسانہ بیان کریں گے۔

"اے شہریو! تم آپس میں بھائی بھائی ہو، مگر خدا نے تم کو ایک دوسرے سے مختلف بنایا ہے۔ تم میں سے بعض میں قیادت کی قوت ہے،

ان کو خدا نے سونے سے بنایا ہے۔ اسی لیے ان کو سب سے زیادہ عزت حاصل ہوتی ہے۔ بعض کی ساخت چاندی سے ہے، وہ معاون بننے کے لائق ہیں۔ بعض جو کاشتکار و صناع ہیں ان کو اس نے پیتل اور لوہے سے بنایا ہے۔ نوع عموماً اولادیں باقی رہے گی۔ مگر چونکہ تم دراصل ایک ہی خاندان کے ہو، اس لیے ممکن ہے کہ طلائی والدین کے نقرئی بیٹا ہو جائے، یا نقرئی والدین کے طلائی بیٹا ہو جائے۔ خدا کہتا ہے ...... کہ اگر طلائی یا نقرئی والدین کے لڑکے ہیں پیتل یا لوہے کی آمیزش ہو تو فطرت درجے کی تبدیلی کی طالب ہوتی ہے، اور فرمانروا کی آنکھ کو اپنے بیٹے کے لیے اس بنا پر رحم سے پر نہیں ہونا چاہیے کہ اس کو تنزل کرنا پڑتا ہے، اور کاشتکاری یا صنعت کو اختیار کرنا ہوتا ہے، کیونکہ اہل صنعت و حرفت کے لڑکے بھی ایسے ہو سکتے ہیں، جو عزت میں ترقی کر جائیں اور محافظ و معاون بن جائیں۔ کیونکہ ایک ہاتف کہتا ہے کہ جب وہ شخص جس کی ساخت پیتل یا لوہے سے ہو مملکت کا محافظ ہوتا ہے، تو یہ تباہ ہو جاتی ہے۔ (۴۱۵) ۴۷
شاید اس شاہانہ افسانے کے ذریعے سے ہم اپنی تجویز کے ترقی دینے کے لیے کم و بیش عام رضامندی حاصل کر لیں گے۔

لیکن ان کامیاب باقی رہنے والوں کا کیا ہوگا، جو انتخاب کی ان تدریجی لہروں پر سے تیر کر پار ہو جاتے ہیں؟

ان کو فلسفے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اب ان کا سن تیس سال کا ہو چکا ہے۔ ان کو اس عزیز مسرت کے ذائقے سے اس سے پہلے آشنا کرنا قرین مصلحت نہ ہوتا ...... کیونکہ نوجوان کے منہ جب پہلے پہل فلسفے کے ذائقے سے لطف اندوز ہوتے ہیں، تو وہ محض تفریح کی خاطر استدلال کرتے ہیں، اور ہمیشہ (کتے کے پلوں کی طرح جن کو ان سب چیزوں کے نوچنے اور پھاڑنے کا شوق ہوتا ہے، جو ان کے قریب آتی ہیں) نقض و تردید کرتے رہتے ہیں" (۵۳۹)۔ اس عزیز مسرت کے معنے زیادہ تر دو چیزوں کے ہیں۔ صاف طور پر خیال کرنا جو مابعد الطبیعیات

ہے۔ اور دانائی سے حکومت کرنا جو سیاسیات ہے۔ پس پہلے ہمارے نوجوان
منتخب شدگان کو صفائی کے ساتھ خیال کرنا چاہئے۔ اس غرض کے لیے ان کو
نظریۂ مثل کی تعلیم دی جائے۔

مگر یہ مشہور نظریۂ مثل فلاطون کے تخیل اور شاعری سے مرصع اور تاریک
ہو کر عصر جدید کے طالب علم کے لیے ایک ہمت شکن بھول بھلیاں بن گیا ہے،
اور یہ ان لوگوں کے لیے جو بہت سی چھان بینوں کے بعد باقی بچ رہے تھے،
ایک اور سخت آزمائش ہوتا۔ ایک شے کی مثال اس نوع کا عام تصور ہو سکتا
ہے، جس سے اس کا تعلق ہے (جان یا ڈک یا ہیری کی مثال انسان ہے)
یا اس سے مراد وہ قانون یا قوانین ہو سکتے ہیں، جن کے مطابق شے عمل
کرتی ہے (جان کی مثال اس کے تمام عمل کو "قوانین فطرت" میں تحویل
کرنے کے مسادی ہو گی۔ یا یہ مکمل مقصد یا نصب العین ہو سکتی ہے، جس
کی طرف شے اور اس کی نوع ترقی کر سکتی ہے (جان کی مثال یوٹوپیا کا جان
ہے)۔ غالباً مثال میں یہ سب چیزیں داخل ہیں —— یعنی تصور قانون اور
نصب العین۔ ہمارے حواس سطحی مظاہر اور جزئیات سے دوچار ہوتے
ہیں، ان کی تہ میں ایسی تعمیمات باقاعدگیاں اور ترقی کی جہتیں ہوتی ہیں،
جن کا حس کو ادراک نہیں ہوتا، مگر جن کا عقل و فکر تعقل کرتے ہیں۔ یہ تصورات
قوانین اور نصب العین، ان جزئی اشیا سے جن کا حواس سے ادراک
۳۸ ہوتا ہے، اور جن کے واسطے سے ہم ان کا تعقل و استنباط کرتے ہیں، زیادہ
مستقل اور لہذا زیادہ حقیقی ہوتے ہیں۔ انسان ٹام ڈک اور ہیری کے
مقابلے میں زیادہ مستقل ہے۔ یہ دائرہ میری پنسل کی حرکت سے پیدا ہوتا
ہے، اور میری ربڑ سے مٹ جاتا ہے، لیکن دائرے کا تعقل ہمیشہ باقی
رہتا ہے۔ یہ درخت کھڑا ہے، اور وہ درخت گر جاتا ہے، لیکن وہ قانون
جو اس امر کا تعین کرتا ہے، کہ کون سے اجسام گریں گے اور کب اور کیسے
گریں گے ازل سے ہیں اور ابد تک رہیں گے۔ اسپی نوزا کہے گا، کہ
اشیا کا ایک وہ عالم ہے، جس کا حواس سے ادراک ہوتا ہے، ایک عالم قوانین

کا ہے جو فکر سے مستنبط ہوتے ہیں۔ ہم مقلوب مربعوں کے قانون کو دیکھتے نہیں ہیں، مگر یہ موجود ہے اور ہر جگہ موجود ہے۔ یہ ہر چیز کے عالم وجود میں آنے سے پہلے موجود تھا، اور اس وقت تک باقی رہے گا، جب تمام عالم اشیا ایک افسانہ ماضی ہو جائے گا۔ یہاں پر ایک پل ہے۔ دیکھئے ہیں یہ ایک کروڑ ٹن لوہا اور کنکریٹ نظر آتی ہے۔ لیکن ایک عالم ریاضی اپنی ذہنی آنکھ سے اس انبار کی میکانک ریاضیات اور انجینیری کے قوانین سے جرائت آمیز ولطیف مطابقت کو دیکھتا ہے، وہ قوانین جن کے مطابق تمام اچھے پلوں کو بننا چاہیے۔ اگر ریاضیاتی شاعر بھی ہو تو وہ ان قوانین کو پل کو تھامے ہوئے دیکھے گا۔ اگر قوانین کی خلاف ورزی ہو گی، تو پل نیچے دریا میں جا پڑے گا۔ قوانین ہی خدا ہیں جو پل کو اپنے ہاتھ کے جوف میں تھامے رکھتا ہے۔ ارسطو کچھ اس قسم کی بات کی طرف اشارہ کرتا ہے، جب وہ کہتا ہے کہ فلاطون کی مراد مثل سے وہی تھی، جو فیثا غورث کی عدد سے تھی جب کہ وہ یہ تعلیم دیتا تھا کہ یہ دنیا عالم اعداد ہے (جس کے غالباً یہ معنے تھے کہ دنیا ریاضیاتی مستقل قدروں اور باقاعدگیوں کے تابع ہے)۔ پلوٹارک ہم سے کہتا ہے، کہ فلاطون کے نزدیک خدا ہمیشہ ہندسی کرتا ہے، یا جیسا کہ اسپے نوزا اسی خیال کو اس طرح سے بیان کرتا ہے کہ خدا اور ساخت اور عمل کے عام قوانین ایک ہی حقیقت ہیں۔ لہٰذا برٹرانڈ رسل کی طرح فلاطون کے نزدیک بھی ریاضیات فلسفہ ایک لازمی مقدمہ اور اس کی بلند ترین صورت ہے۔ اپنی درسگاہ کے دروازے پر فلاطون نے ڈانٹے کی طرح سے یہ لفظ آویزاں کر رکھے تھے کہ "جو شخص ہندسے سے ناواقف ہو وہ یہاں نہ آئے"[۲]

۱۔ نظریۂ مثل کی تعبیر جو یہاں پر کی گئی ہے، اس کی تفصیلات ڈی۔جی رٹشے کی کتاب Plato مطبوعہ ایڈنبرا ۱۹۰۲ء میں دیکھی جا سکتی ہیں، خصوصاً صفحات ۴۹ تا ۸۵ میں۔

ان مثل یعنے ان تعمیمات باقاعدگیوں اور نصب العینوں کے بغیر دنیا ۳۹
ہمارے لیے ایسی ہوگی جیسی کہ یہ بچے کی پہلے پہل کھلی ہوئی آنکھوں کو معلوم
ہونی چاہیئے۔ یعنے حس کی غیر مرتب اور بے معنے جزئیات کا انبار۔ کیونکہ
اشیا سے معنے صرف ان کو مرتب کرکے اور ان کی تعمیم کرکے ان کے وجود
کے قوانین معلوم کرکے اور ان کی فعلیت کے مقصد و منتہا کا پتا چلا کر منسوب
کیئے جا سکتے ہیں۔ مثل کے بغیر عالم کی حالت کتابوں کے ان ناموں کے
مانند ہوگی جو فہرست میں سے یوں ہی بلا کسی ترتیب کے نکل پڑے ہوں
بمقابلہ اس کے کہ وہ اپنے طبقوں سلسلوں اور اغراض کے اعتبار سے
مرتب ہوں۔ یا بغیر مثل کے عالم کو غار کے اندر کے سایوں کے مشابہ
کہا جا سکتا ہے، جن کے مقابلے میں تمام عالم مثل سورج سے منور حقائق کا عالم ہوتا ہے، جو اپنے
مضحکہ خیز اور پر فریب سایے اندر ڈالتی ہیں (۵۱۴)۔ لہذا اعلیٰ تعلیم کا اصل
جوہر مثل کی تحقیق ہے یعنے تعمیمات تسلسل کے قوانین اور ترقی کے نصب العینوں
کی۔ اشیا کی تہ میں ہم کو ان کے تعلق اور معنے کو دریافت کرنا چاہیئے ان کے
عمل کی صورت اور اس کے قانون کو معلوم کرنا چاہیئے، اس وظیفے یا نصب العین
کو معلوم کرنا چاہیئے، جس کو یہ پورا کرتی ہیں یا انجام دیتی ہیں۔ ہمیں اپنے
حسی تجربے کو قانون اور مقصد کی اصطلاحات میں ترتیب و تطبیق دینی
چاہیئے۔ ایک خفیف العقل کے اور قیصر کے ذہنوں میں یہی بات مابہ الامتیاز
ہوتی ہے۔

مثل کے اس ادق نظریے کی پانچ سال تک تعلیم حاصل کرنے
پانچ سال تک اہم صورتوں اور علی سلسلوں اور تصوری امکانات کو حس کی
ابتری میں ادراک کرنے کے فن میں مشق بہم پہنچانے، اور پانچ سال تک
اس اصول کو کردار انسانی اور انصرام مملکت پر منطبق کرنے کی تربیت
حاصل کرنے کے بعد، بچپن سے جوانی اور جوانی سے پینتیس ۳۵ سال کی پختہ عمر تک
اس طویل تیاری کے بعد یہ مکمل نتائج شاہانہ لباس زیب تن کرنے
اور اجتماعی زندگی کے اعلیٰ فرائض انجام دینے کے یقیناً قابل ہوگئے ہونگے۔

بلاشبہہ اب یہ آخر کار فلسفی بادشاہ ہو گئے ہوں گے جو بنی نوع انسان پر حکومت کریں گے اور اس کو آزادی سے بہرہ مند کریں گے ؟

افسوس ہے کہ ابھی نہیں۔ ان کی تعلیم ہنوز نامکمل ہے، کیونکہ یہ سب تو نظری ہی تعلیم ہوئی ہے۔ کسی اور چیز کی بھی ضرورت ہے۔ اب ان فاضلوں کو فلسفے کی بلندیوں سے انسان اور اشیا کے غار میں آنا چاہئے۔ تعمیمات و انتزاعات بے سود ہیں اگر ان کی جانچ اس مقرون عالم سے نہ ہو۔ ۴۰
ہمارے طالب علموں کو اس عالم میں اس طرح سے داخل ہونا چاہئے کہ ان کے ساتھ کوئی خاص رعایت ملحوظ نہ ہو۔ وہ کاروباری آدمیوں عملی اور معاملہ فہم خود طلبوں، طاقتوروں اور چالبازوں سے مقابلہ کریں، اس بازار کشمکش میں وہ خود کتاب زندگی سے سبق لیں، دنیا کے سخت حقائق پر اپنی انگلیوں اور پنڈلیوں کو زخمی کریں، اور اپنی ضروریات اپنی پیشانیوں سے پسینہ بہا کر پوری کریں۔ اور یہ آخری جانچ بلا کسی رعایت کے پندرہ برس تک جاری رہے گی۔ ہمارے کاملین میں سے بعض اس آخری جانچ میں جو اب دے جائیں گے، اور انتخاب کی اس آخری بڑی موج میں ڈوب جائیں گے۔ جو ہر قسم کے دھکے کھا کر پچاس سال کے سن کو پہنچیں گے، جن کو زندگی کے بے رحم چرکوں نے سنجیدہ اور اپنی ذات پر اعتماد رکھنے والا بنا دیا ہے، اور تدریسی غرور کو دماغ سے دور کر دیا ہے، اور جو اب اس تمام حکمت سے مسلح ہیں، جو روایت و تجربے اور تربیت و کشمکش سے مل کر پیدا ہو سکتی ہے —— اب یہ آدمی خود بخود مملکت کے فرمانروا ہو جائیں گے۔

۴۔ سیاسی حل

خود بخود —— یعنی رائے دہی و رائے شماری کے کسی فریب کے بغیر

جمہوریت موقع کی مکمل مساوات کا نام ہے، خصوصاً تعلیم کے بارے میں نہ کہ سرکاری خدمت پر ہر ٹام ڈک اور ہیری کی بار بار گردش۔ ہر شخص کو اپنے آپ کو انتظام مملکت کے لیے موزوں بنانے کے واسطے مساوی موقع ملے گا۔ مگر صرف وہ لوگ جو اپنے جوہر کو ثابت کر چکیں گے، اور تمام آزمائشوں سے ہنرمندی کا تمغہ حاصل کر کے نکلیں گے صرف وہی حکومت کرنے کے لیے منتخب ہو سکیں گے۔ سرکاری عہدہ دار آراء کے ذریعے سے منتخب نہ ہوں گے، اور نہ جمہوری فریب کے غیر مرئی تاروں کو کھینچ کر خفیہ جماعتیں کسی کو منتخب کر سکیں گی بلکہ یہ خود اپنی قابلیت سے منتخب ہوں گے، جس کا اظہار ایک مساوی حیثیت رکھنے والے افراد کی اساسی جمہوریت سے ہو گا۔ کوئی شخص کسی عہدے پر خاص تربیت حاصل کئے بغیر مقرر نہ کیا جائے گا۔ اور نہ کسی شخص کو اس وقت تک بڑا عہدہ ملے گا جب تک وہ چھوٹے عہدے پر نہ رہ چکے (گارجیاس۔ ۵۱۵۔ ۵۱۴)۔

کیا یہ اشرافیہ ہے۔ لیکن اگر وہ شے اچھی ہے، جس کی طرف یہ اشارہ کرتا ہے تو ہم کو لفظ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ الفاظ تو عاقل کے نزدیک نقلی سکے ہوتے ہیں جن کے اندر بذات خود کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ ان کو روپیہ صرف احمق اور سیاسی لوگ سمجھتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہم پر صرف بہترین لوگ حکومت کریں، اور اشرافیہ کے یہی معنے ہیں۔ کیا ہم نے کارلائل کی طرح اس امر کی آرزو اور دعا نہیں کی ہے کہ ہم پر بہترین افراد حکومت کریں۔ لیکن ہم نے اشرافیوں کو موروثی خیال کر لیا ہے۔ اس بات کو اچھی طرح پر سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ فلاطونی اشرافیہ اس قسم کی نہیں ہے، بلکہ اس کو تو جمہوری اشرافیہ کہنا چاہیئے۔ کیونکہ یہاں پر لوگ بجائے اس کے کہ دو برائیوں میں سے، جو کہ نامزد کرنے والی جماعتیں امیدواروں کی صورت میں پیش کرتی ہیں، کمتر برائی کے اختیار کرنے کے خود امیدوار ہوں گے۔ اور ان سب کو سرکاری خدمت کے لیے تعلیمی انتخاب کا مساوی موقع ملے گا۔ یہاں کسی ذات یا طبقے کا جھگڑا

نہیں ہے، اور نہ حیثیت یا استحقاق کی کوئی میراث ہے، نہ کسی ایسی ذہانت کے دب جانے کا موقع ہے، جس کے پیدائشی طور پر مالی حالات مساعد نہ ہوں۔ حاکم کی ابتدا اسی سطح سے ہوتی ہے، جس سطح سے کہ ایک موچی کے بیٹے کی ہوتی ہے۔ اگر حاکم کا بیٹا کودن ہو، تو وہ پہلے ہی انتخاب میں رہ جاتا ہے۔ اگر موچی کا بیٹا قابل ہو تو اس کے واسطے محافظ مملکت بن جانے کے لیے راستہ صاف ہے (۴۲۳) اہلیت و ذہانت جہاں کہیں بھی پیدا ہو اس کے لیے ترقی کا میدان کھلا ہوا ہوتا ہے۔ یہ جمہوریت مدارس کی ہے، جو انتخاب گھروں کی جمہوریت سے سیکڑوں درجے زیادہ ایماندارانہ اور موثر ہے۔

اور اس طرح "ہر کام کو چھوڑ کر" محافظین صرف مملکت کے اندر آزادی کے قیام سے بحث رکھیں گے۔ یہی ان کا پیشہ ہوگا، اور اس کے علاوہ ان کا کوئی ایسا مشغلہ نہ ہوگا جس کا اس غایت سے تعلق نہ ہو (۳۹۵)۔ وہی قانون ساز ہوں گے وہ قوانین کو نافذ کریں گے اور وہی عدالت کا کام انجام دیں گے۔ قوانین بھی متغیرہ حالات میں ان کو کسی مقررہ عمل کا پابند نہ بنائیں گے۔ محافظین کی حکومت میں عقلی لچک ہوگی اور یہ نظر کی پابند نہ ہوگی۔

لیکن پچاس برس کے انسانوں کی عقل لچکدار کیسے ہوسکتی ہے۔ کیا وہ روزمرہ کے عمل سے ذہنی طور پر ایک سانچے میں ڈھل جائیں گے۔ ایڈیمانٹس (بلاشبہہ فلاطون کے گھر پر کسی سرگرم برادرانہ مباحثے میں) اعتراض کرتا ہے، کہ فلسفی یا تو احمق ہوتے ہیں اور یا عیار، اس لیے ان کی حکومت یا تو احمقانہ ہوگی یا غرض مندانہ یا اس میں دونوں کی آمیزش ہوگی۔" فلسفے کے پرستار جو اس کا مطالعہ جوانی میں صرف تعلیم کی خاطر نہیں بلکہ اپنی آیندہ زندگی کے مشغلے کے طور پر کرتے ہیں، اگر کامل طور پر بدمعاش نہیں تو اکثر حالات میں عجیب و غریب قسم کے انسان تو ضرور بن جاتے ہیں۔ اور ان میں سے بہترین کے بارے میں ۴۸۷
اس فن کے مطالعے کا جن کی آپ اس قدر تعریف کرتے ہیں، یہ نتیجہ تو ضرور ہوگا، کہ وہ دنیا کے لیے بے کار ہو جائیں گے (۴۸۷)۔ اس زمانے کے بعض عینک باز فلسفیوں کا یہ خاصا منصفانہ خاکا ہے۔ لیکن فلاطوں جواب

دیتا ہے کہ میں نے اپنے فلسفیوں کو مدارس کی تعلیم کے علاوہ زندگی کی تربیت بھی دی ہے، اس لیے اس دشواری کا پہلے ہی سے سدباب ہو گیا ہے۔ اس لیے یہ لوگ محض سوچ بچار کرنے والے بھی نہ ہوں گے، بلکہ عمل کے مرد میدان ہوں گے، یہ لوگ تو ایسے ہوں گے، جن کو طویل تجربے اور آزمائش اعلیٰ مقاصد اور شریف مزاج کے لیے تیار کر دیں گے۔ فلسفے سے افلاطون ایک عملی تہذیب اور ایسی حکمت مراد لیتا ہے، جو زندگی کے حقیقی کاروبار کے ساتھ ملتی ہے۔ اس کے حجرہ نشین اور غیر عملی مابعد الطبیعیاتی مراد نہیں ہیں۔ فلاطوں ایسا آدمی ہے جو کانٹ سے سب سے کم مشابہت رکھتا ہے، جو (کانٹ کے احترام کے باوجود) ایک بڑی خوبی ہے۔

اب تک تو ناقابلیت کے تدارک سے بحث تھی۔ دغابازی کا تدارک اس طرح سے ہو سکتا ہے کہ محافظین میں ایک نظام اشتراکیت قائم کر دیا جائے۔ اول تو یہ کہ ان میں سے کسی کی نہایت ہی ضروری چیزوں کے علاوہ اور کوئی ذاتی ملکیت نہ ہونی چاہیے۔ نہ ان کا کوئی ذاتی مکان ہونا چاہیے، جو سلاخوں اور سنگینوں سے بند ہو، اور کوئی شخص جو داخل ہونا چاہتا ہو، داخل نہ ہو سکے۔ ان کی ضروریات کی چیزیں صرف وہ ہونی چاہییں جن کی تربیت یافتہ سپاہیوں کو ضرورت ہوتی ہے، جو باعفت اور باشجاعت لوگ ہوتے ہیں۔ ان کی قرارداد یہ ہونی چاہیے، کہ وہ شہریوں سے ایک مقررہ تنخواہ لیں گے۔ جو ان کے سال بھر کے مصارف کے لیے کافی ہو جائے گی، اور اس سے زیادہ نہیں۔ ان کا کھانا مشترکہ ہوگا، اور اس طرح سے ایک ساتھ رہیں گے جس طرح سے کہ سپاہی چھاؤنی میں رہتے ہیں، ہم ان سے کہیں گے کہ سونا چاندی تو وہ خدا کی طرف سے رکھتے ہیں، کیونکہ ان سے بیش قیمت جوہر تو خدا نے خود ان کے اندر رکھا ہے۔ اس لیے ان کو اس ارضی میل کی ضرورت نہیں جو سونا کہلاتا ہے، اور انھیں آسمانی جوہر کو زمینی آمیزش سے ناپاک نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ یہ ادنی قسم کی دھات بہت سے ناپاک کاموں کا باعث رہی ہے۔ مگر خود ان کی ذات کا سونا پاک و صاف ہے۔ تمام شہریوں میں سے

صرف ان کو چاندی سونے کو ہاتھ نہ لگانا چاہیے، نہ ان کو اس چھت کے نیچے رہنا چاہئے، جس میں سونا چاندی ہوں، نہ ان کو پہننا چاہئے اور نہ ان کے برتنوں میں پانی پینا چاہئے۔ اسی میں ان کی اور مملکت کی فلاح ہو گی۔ لیکن اگر وہ کبھی ذاتی مکانات یا زمین یا روپیہ پیسہ حاصل کریں تو وہ محافظین کے بجائے خانہ دار اور کاشتکار ہو جائیں گے۔ اور وہ دوسرے شہریوں کے مددگار ہونے کے بجائے، ان کے دشمن اور ستانے والے ہو جائیں گے۔ وہ دوسروں سے نفرت کریں گے اور دوسرے ان سے، وہ دوسروں کے خلاف سازش کریں گے اور دوسرے ان کے۔ ان کو خارجی دشمنوں کے مقابلے میں داخلی دشمنوں کا زیادہ خطرہ ہوگا۔ اور تباہی کی ساعت خود ان کے اور باقی مملکت کے لیے قریب ہو گی (۴۱۷-۴۱۶)۔ ۴۳

یہ انتظام محافظین کے لیے ایک جماعت کی حیثیت سے حکومت کرنے کو جو بہ حیثیت مجموعی کل قوم کی بھلائی کے لیے نہیں بلکہ اپنی خاص جماعت کی بھلائی کے لیے حکومت کرتی ہو، غیر سودمند اور خطرناک بنا دے گا۔ کیونکہ وہ احتیاج سے محفوظ ہوں گے۔ شریفانہ زندگی کی ضروریات اور معمولی تعیشات ان کو میسر ہوں گے، اور سکھا دینے اور جھریاں ڈال دینے والی معاشی پریشانیوں سے محفوظ و مامون۔ مگر اسی ذریعے سے ان کو طمع اور مالی حرص سے علیحدہ رکھا جائے گا، ان کو دنیا کی چیزوں کی صرف ایک مقررہ مقدار ملے گی، اور اس سے زیادہ نہیں۔ وہ ایسے طبیبوں کے مانند ہوں گے، جو قوم کے لیے ایک غذا مقرر کریں گے، خود بھی اس کو قبول کریں گے۔ وہ مقدس آدمیوں کی طرح سے ایک ساتھ کھائیں گے، اور ایسے سپاہیوں کی طرح سے جنھوں نے سادگی کا عہد کر رکھا ہو، ایک ساتھ بارکوں میں سوئیں گے۔ فیثاغورث کہا کرتا تھا کہ "دوستوں کی تمام چیزیں مشترک ہوتی ہیں" (لاز-۸۰۷)۔ اس طرح پر محافظوں کی حکومت بے ضرر بنا دی جائے گی، اور ان کی قوت سے زہر سلب کر لیا جائے گا۔ عزت اور قوم کی خدمت کا احساس ہی ان کا اجر ہوگا۔ اور یہ لوگ ایسے ہوں گے، جو

شروع ہی سے مادی اعتبار سے اس قدر محدود زندگی کو عمداً اختیار کر چکے
ہوں گے۔ اور اس قسم کے آدمی اپنی سخت تربیت کے ختم پر مدبر کی اعلیٰ شہرت کو
جاہ طلب سیاسیین یا معاشی انسان کے ادنیٰ معاوضوں سے بلند قیمت سمجھنا
سیکھ چکے ہوں گے۔ ان کے آنے کے بعد جماعتی سیاست کے قضیوں کا خاتمہ
ہو جائے گا۔

لیکن ان کی بیویاں اس سب پر کیا کہیں گی؟ کیا وہ زندگی کے
عیش و عشرت اور صرف میں نمود و نمائش کے ترک کر دینے پر راضی ہو جائیں گی؟
محافظین کے بیویاں نہ ہوں گی۔ ان کی اشتراکیت میں عورتیں اور مال و اسباب ۴۴
دونوں داخل ہیں۔ ان کو ذات کی انانیت ہی سے نہیں بلکہ خاندان کی انانیت
سے بھی آزاد کر دیا جائے گا۔ ان کو ایسے شوہر کی پریشان دنیا طلبی تک محدود
نہیں کر دینا چاہئے جس کے بیوی اپنے مطالبوں سے انکس چبھوتی رہتی ہو۔
ان کو ایک عورت کا نہیں بلکہ قوم کا خادم ہونا چاہئے۔ بچے تک بھی خاص طور پر
یا امتیاز کے ساتھ ان کے نہ ہوں گے۔ محافظین کے تمام بچے پیدائش کے بعد
اپنی ماؤں سے لے لیے جائیں گے، اور ان کی پرورش مشترکہ ہو گی، اس
ہنگامے میں یہ بات بھی فراموش ہو جائے گی، کہ ان کے ماں باپ کون ہیں
(۴۶۰)۔ تمام محافظ مائیں تمام محافظ بچوں کی نگہداشت کریں گی۔ ان
حدود کے اندر انسان کی اخوت بتدریج لفظوں سے گزر کر واقعے کی صورت
میں آجائے گی۔ ہر لڑکا دوسرے لڑکے کا بھائی، ہر لڑکی بہن، اور ہر مرد باپ
اور ہر عورت ماں ہو گی۔

مگر یہ عورتیں کہاں سے آئیں گی؟ اس میں شک نہیں کہ بعض کو تو
محافظین صنعتی یا فوجی طبقے سے اپنے لیے پسند کر لیں گے۔ اور بعض اپنے
حق کی بنا پر محافظین کی جماعت میں داخل ہوں گی۔ کیونکہ اس قوم میں
جنسی فرق کوئی مانع نہ ہو گا اور سب سے کم تعلیم میں۔ لڑکی کو علمی ترقی اور
مملکت میں بلند ترین مرتبوں پر پہنچنے کے وہی مواقع حاصل ہوں گے
جو لڑکے کو ہوں گے۔ جب گلاکن یہ اعتراض کرتا ہے کہ عورت اگر آزمائشوں میں

پوری اترے تو بھی اس کو سرکاری عہدے پر آنے دینے سے تقسیم عمل کے اصول میں خلل واقع ہوتا ہے، تو اس کو یہ دنداں شکن جواب دیا جاتا ہے، کہ تقسیم عمل رجحان طبع اور قابلیت کی بنا پر ہونا چاہیئے نہ کہ جنسی فرق کی بنا پر۔ اگر ایک عورت اپنے آپ کو سیاسی انتظام کے قابل ثابت کرتی ہے تو وہ حکومت کرے۔ اگر ایک مرد اپنے آپ کو صرف برتن مانجنے کے قابل ثابت کرتا ہے، تو اس کو وہ کام کرنا چاہیئے، جس کے لیے قدرت نے اس کو بنایا ہے۔

اشتراک ازدواج کے معنے اندھا دھند مقاربت کے نہیں ہیں، بلکہ تمام تناسلی تعلقات کی شدید اصلاح نسلی نگرانی ہوگی۔ یہاں پر جانوروں کی افزائش نسل سے استدلال کیا جاتا ہے، اور اس کا سلسلہ طویل ہوتا ہے۔ اگر ہم جانوروں میں پسندیدہ اوصاف کی خاطر انتخاباً نسل کشی اور ہر پشت میں صرف بہترین افراد سے نسل لینے سے اس قدر عمدہ نتائج حاصل کر سکتے ہیں تو اسی قسم کے اصول کو بنی نوع انسان کے تناسل میں کیوں نہ استعمال کریں؟ (۴۵۹) کیونکہ بچے کو صحیح تعلیم دینا ہی کافی نہیں، بلکہ وہ تندرست اور منتخب والدین سے پیدا ہونا چاہیئے، جس کے معنے یہ ہیں کہ تعلیم پیدائش سے پہلے شروع ہو جانی چاہیئے۔" (لاز ۷۸۹)۔ لہذا کسی مرد یا عورت کو ۵۹ اس وقت تک بچے پیدا کرنے کی اجازت نہ دی جائے گی جب تک وہ کامل طور پر تندرست نہ ہو۔ ہر دلہن اور ہر دولہا کو صحت کا صداقت نامہ پیش کرنا ہوگا۔ مردوں کو توالد و تناسل کی صرف اس وقت اجازت ہوگی جب تیس سال سے زیادہ اور پینتالیس سال سے کم ہوں اور عورتوں کو صرف اس وقت جب وہ بیس سال سے زیادہ اور چالیس سال سے کم ہوں۔ جو بچے بلا اجازت مقاربتوں سے پیدا ہوں یا صحیح و تندرست پیدا نہ ہوں، ان کو ضائع کر دیا جائے گا۔ توالد و تناسل کے لیے جو عمر مقرر کی گئی ہے، اس سے پہلے اور اس کے بعد مقاربت کی اجازت ہوگی، مگر اس شرط کے ساتھ کہ حمل کو ضائع کرا دیا جائے گا۔ ہم یہ اجازت فریقین کو ان تاکیدی احکام کے ساتھ دیتے ہیں، کہ وہ جہاں تک ان سے ممکن ہوگا، اس امر کی کوشش کریں گے کہ کوئی جنین زندہ پیدا نہ ہو، اور اگر کوئی زندہ پیدا ہو بھی جائے، تو یہ بات ان کو

نتیجے کو زندہ نہیں رکھا جا سکتا، اور انھیں
سمجھ لینی چاہیئے کہ اس قسم کی یکجائی کے
اپنے انتظامات اس کے مطابق کر لینے چاہییں" (۴۶۱) رشتہ داروں کے
ازدواج کی ممانعت ہوگی۔ کیونکہ یہ انحطاط پیدا کرتا ہے (۳۱۰)۔ "دونوں
جنسوں میں جو بہترین ہوں تا بہ امکان ان میں باہم رشتۂ ازدواج قائم
کرنا چاہیئے اور کم درجے کے لوگوں کا کم درجے کے لوگوں کے ساتھ۔ اور یہ صرف ایک قسم کی اولاد
کی پرورش کریں گے، مگر دوسری قسم کی اولاد کی پرورش نہ کریں گے۔ کیونکہ
یہی صورت ہے، جس کے بموجب ریوڑ بہترین حالت میں رہ سکتا ہے ......
ہمارے نوجوانوں میں سے جو زیادہ بہادر اور بہتر ہوں گے ان کو بہت سی
عورتوں کی اجازت ہوگی، کیونکہ اس قسم کے باپوں کے جتنے بیٹے بھی ہو سکیں،
اتنا ہی بہتر ہے" (۴۵۹-۶۰)۔

لیکن ہمیں اپنے نسل سدھار معاشرے کو صرف داخلی بیماری اور انحطاط
ہی سے محفوظ نہیں رکھنا ہے، بلکہ خارجی دشمنوں سے بھی بچانا ہے۔ اگر ضرورت
ہو تو اسے کامیاب جنگ کرنے کے لیے بھی تیار رہنا چاہیئے۔ ہماری معیاری
قوم بلاشبہ صلح پسند ہوگی، کیونکہ یہ آبادی کو وسائل معاش کی حد سے نہ
بڑھنے دیگی۔ مگر آس پاس کی ریاستیں جن کا انتظام اس قدر عمدہ نہ ہوگا،
ممکن ہے یوٹوپیا کی باقاعدہ فارغ البالی کو حملہ آور ہونے اور لوٹنے کی دعوت
تصور کریں۔ لہذا (اگرچہ ہم اس ضرورت پر افسوس کرتے ہیں) ہمیں اپنے
درمیانی طبقے میں ایک جماعت نہایت ہی عمدہ تربیت یافتہ سپاہیوں کی
رکھنی ہوگی، جو محافظین کی سی سخت اور سادہ زندگی بسر کریں گے، اور
تھوڑے سے مقررہ وظیفے لیتے رہیں گے، جو ان کے رکھنے والے اور بڑے
یعنی قوم ان کو دیگی۔ اس کے ساتھ ہی جنگ کے مواقع سے بچنے کے لیے
رقم کی تدبیر کرنی چاہیئے۔ جنگ کا سب سے بڑا سبب تو ضرورت سے زیادہ ۴۶
آبادی کا بڑھ جانا ہے (۳۷۳)۔ دوسرا سبب بیرونی تجارت ہے،
جس کے ساتھ لازمی طور پر جھگڑے ہوتے ہیں، جو اس میں خلل پیدا
کرتے ہیں۔ درحقیقت تجارتی مقابلہ ایک قسم کی جنگ ہی ہے "صلح اور امن تو

اس میں صرف برائے نام ہوتا ہے (لاز ۶۲۲) اس لیے بہتر ہو گا کہ اپنی سیاسی ریاست کو بہت کچھ اندرونی علاقے میں قائم کیا جائے، تاکہ یہ بیرونی تجارت کی زیادہ ترقی سے محفوظ رہے۔ "سمندر ایک ملک کو سامان تجارت روپیہ کمانے اور مول تول کرنے سے بھر دیتا ہے۔ یہ انسانوں کے ذہنوں میں داخلی اور خارجی تعلقات دونوں میں مالی طمع اور بے ایمانی پیدا کرتا ہے" (لاز، ۷۰۵)۔ بیرونی تجارت کی حفاظت کے لیے ایک بڑے بحریے کی ضرورت ہوتی ہے، اور بحریت اتنی ہی بری چیز ہے جتنی کہ عسکریت۔ "جنگ کا جرم ہر حالت میں چند اشخاص تک محدود ہوتا ہے، اور بڑی تعداد دوستوں کی ہوتی ہے" (۱۷۴۰)۔ سب سے زیادہ کثیر الوقوع لڑائیاں سب سے بری ہوتی ہیں۔ مثلاً خانہ جنگیاں یونانی کی یونانی سے لڑائی، یونانیوں کو چاہیے کہ یونانی اقوام کا ایک اتحاد قائم کریں، ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کل یونانی نسل کسی دن وحشی اقوام کے ماتحت آجائے۔

پس ہمارے سیاسی شیرازے کی قیادت محافظین کی ایک چھوٹی جماعت کے ہاتھ میں ہوگی۔ اس کی حفاظت سپاہیوں اور معاونوں کی ایک بڑی جماعت کرے گی۔ اور اس کا مدار تجارتی صنعتی اور زرعی آبادی کی بڑی بنیاد پر ہو گا۔ یہ آخری اور معاشی طبقہ ذاتی ملکیت، ذاتی ازواج اور ذاتی خاندان رکھے گا۔ لیکن تجارت اور صنعت کو محافظین اس طرح سے منضبط رکھیں گے کہ ضرورت سے زیادہ دولت اور حد سے زیادہ افلاس پیدا نہ ہونے پائیں۔ اگر کوئی شخص اوسط شہری سے چار گونہ سے زیادہ دولت پیدا کرلے، تو اسے اس زیادتی کو مملکت کے حوالے کر دینا پڑے گا (لاز ۷۴۱)۔ شاید سود کی ممانعت کر دی جائے گی، اور منافع کو محدود کر دیا جائے گا۔ محافظین کی اشتراکیت معاشی طبقے کے لیے ناقابل عمل ہے، کیونکہ اس طبقے کی امتیازی خصوصیات شوق اکتساب و مقابلہ میں۔ ان میں سے بعض شریف لوگ اس اکتساب و مقابلے کے خبط سے بری ہوں، مگر ان میں اکثریت اس پر جان دیتی ہے۔ ان کو

نیکی کی طلب ہوتی ہے، اور نہ عزت کی صرف اسی کی طلب ہوتی ہے کہ مال و دولت بڑھتا چلا جائے۔ مگر وہ لوگ جنھیں روپیہ پیدا کرنے ہی کا شوق ہوتا ہے، ایک مملکت پر حکومت کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ اور ہماری کل تجویز اس ۴۷
امید پر مبنی ہے، کہ اگر محافظین اچھی طرح سے حکومت کریں اور سادہ زندگی بسر کریں، تو معاشی انسان ان کو اس شرط کے ساتھ حکومت کرنے کا اجارہ دینے پر رضامند ہو جائے گا کہ وہ اس کو عیش و عشرت کا اجارہ دیدیں مختصر یہ کہ کامل معاشرہ وہ ہوگا، جس میں ہر طبقہ اور ہر شخص وہ کام کرے گا جس کے لیے وہ قدرتی طور پر سب سے زیادہ صلاحیت رکھتا ہو۔ جس میں کوئی طبقہ یا فرد دوسرے کے کام میں مخل نہ ہو۔ بلکہ سب اپنی مختلف حیثیتوں میں ایک کارآمد اور ہم آہنگ کل کے پیدا کرنے میں اتحاد عمل کریں۔ یہ مملکت صاحب عدالت ہوگی۔

۹۔ اخلاقیاتی حل

اب ہماری سیاسی گریز ختم ہو چکی ہے، اور آخرکار ہم اس سوال کا جواب دینے کے لیے تیار ہیں، جس سے ہم نے ابتدا کی تھی کہ عدالت کیا ہے؟ اس دنیا میں صرف تین چیزیں قابل قدر رہیں عدالت، حسن اور صداقت، اور شاید ان میں سے کسی کی بھی تعریف نہیں ہو سکتی۔ فلاطون کے چار سو سال بعد ارض یہود کے ایک رومی صوبہ دار نے لاچار ہو کر یہ پوچھا تھا کہ "صداقت کیا ہے" ـــــ اور فلاسفہ نے ابھی تک اس سوال کا جواب نہیں دیا کہ حسن کیا ہے۔ لیکن عدالت کی تعریف بیان کرنے کی فلاطون جرأت کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عدالت اپنی چیز کے رکھنے اور اپنے کام کے انجام دینے کا نام ہے (۴۳۳)۔ ۴۷

اس تعریف کو سن کر کچھ ناکامی سی ہوتی ہے۔ کیونکہ اس قدر تاخیر کے بعد ہم کو کسی بے خطا انکشاف کی توقع تھی۔ اس تعریف کے معنے کیا ہیں۔ محض یہ کہ ہر شخص کو اتنا ملے جتنا کہ وہ پیدا کرے اور وہ کام انجام دے جس کی اس میں سب سے زیادہ صلاحیت ہو۔ عادل انسان وہ ہوتا ہے، جو ٹھیک جگہ پر اپنی انتہائی کوشش صرف کرتا ہے، اور جو کچھ پاتا ہے ٹھیک اتنا ہی کام بھی کر دیتا ہے۔ لہٰذا عادل انسانوں کا معاشرہ بہت ہی مربوط اور کارگزار جماعت ہوگا۔ کیونکہ اس کے اندر ہر عنصر اپنی جگہ پر اس طرح سے اپنا صحیح کام انجام دے گا، جس طرح سے کہ نغمے میں ہر ساز اپنا ٹھیک کام انجام دیتا ہے۔ ایک معاشرے کے اندر عدالت علائق کی اس ہم آہنگی کے مانند ہوگی، جس کے ذریعے سے سیارے اپنی باقاعدہ (یا جیسا کہ فیثا غورث کہے گا اپنی موسیقی) حرکت کو باقی رکھتے ہیں۔ اس طرح کا منظم معاشرہ بقا کا اہل ہوتا ہے۔ اس طرح سے عدالت کو ایک ڈارونی موجب مل جاتا ہے۔ جہاں پر لوگ اپنی اپنی ٹھیک جگہوں پر نہیں ہوتے، جہاں پر تاجر مدبر کو ماتحت بنا لیتا ہے، یا سپاہی بادشاہ کی جگہ غصب کر لیتا ہے، اجزا کا باہمی ربط تباہ ہو جاتا ہے، جوڑ ڈھیلے ہو کر خراب ہو جاتے ہیں اور معاشرہ منتشر و پریشان ہو جاتا ہے۔ عدالت موثر قسم کا اتحاد عمل ہے۔ ۴۸

فرد میں بھی عدالت موثر اتحاد عمل ہے، یعنے انسان کے اندر عناصر کا ہم آہنگ عمل، جن میں سے ہر ایک اپنی مناسب جگہ پر ہو، ہر ایک کردار میں اپنا تعاونی جزو شریک کرے۔ ہر فرد خواہشوں جذبوں اور تصورات کی کائنات یا مجموعۂ پریشان ہوتا ہے۔ اگر ان کے اندر ہمنوائی پیدا ہو جائے تو فرد باقی رہتا اور کامیاب ہوتا ہے، اگر وہ اپنی مناسب جگہ اور کام ترک کر دیں، مثلاً اگر جذبۂ عمل کا نور اور اس کی حرارت دونوں بننے کی کوشش کرے (جیسا کہ جذباتی انسان میں ہوتا ہے) یا اگر فکر عمل کی حرارت اور اس کا نور دونوں بننے کی کوشش کرے، جیسا کہ خالص علمی انسان میں ہوتا ہے، تو شخصیت میں انقراض شروع ہو جاتا ہے،

اور ناکامی اٹل رات کی طرح سے بڑھنا شروع کر دیتی ہے۔
اس طرح پر فلاطون تھریسی میکس اور کیلکلیز اور تمام مقلدان نیٹشے کو ہمیشہ کے لیے
جواب دیتا ہے۔ عدالت محض قوت نہیں بلکہ مربوط قوت ہے خواہشیں اور انسان اس ترتیب
کو اختیار کرتے ہیں، جس کو عقل اور تنظیم معرض وجود میں لاتے ہیں عدالت قوی کا حق نہیں ہے،
بلکہ کل کی موثر ہمنوائی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جو شخص اس جگہ سے ہٹ کر جس کے لیے فطرت اور
صلاحیت اس کو موزوں بناتی ہے، دوسری جگہ چلا جاتا ہے، وہ ممکن ہے
کچھ عرصے کے لیے کچھ نفع حاصل کر لے۔ لیکن انتقام کی دیوی اس کا ان
دیویوں کے مانند تعاقب کرتی رہتی ہے، جو بقول اینکساغورس اس سیارے
کا تعاقب کرتی ہیں، جو اپنے محور سے بھٹک جاتا ہے، جس سے وہ بچ نہیں سکتا۔
فطرت اشیا کی خوفناک چھڑی گمراہ آلے کو اس کی اپنی جگہ اپنے استداد اور اپنے
فطری سر پہ واپس لے آتی ہے کارسیکا کا لفٹنٹ یورپ پر ایسے نمائشی استبداد سے
حکومت کرنے کی کوشش کر سکتا ہے جو کسی قدیم بادشاہت کے شایان شان ہو سکتا تھا
نہ کہ ایسے خاندان کے جو کل ہی عالم وجود میں آیا ہو، مگر اس کا انجام سمندر کے
وسط میں قید خانے کی چٹان پر ہوتا ہے۔ اور اسے افسوس کے ساتھ تسلیم کرنا پڑتا
ہے کہ وہ فطرت اشیا کا غلام ہے۔ بے انصافی مٹ جائے گی۔ ۴۹
اس تعقل کے اندر کوئی بات بیہودہ طور پر نئی نہیں ہے۔ اور درحقیقت فلسفے
میں اگر کسی ایسے نظریے کو ہم شبہے کی نظر سے دیکھیں جو جدت کا مدعی ہو، تو کچھ بے جا نہیں ہے حقیقت
(ہر مہذب خاتون کی طرح سے) اکثر اوقات اپنا لباس بدلتی رہتی ہے مگر نئے لباس میں بھی وہ
ہمیشہ دبی رہتی ہے۔ اخلاق میں ہم سنسنی پیدا کر دینے والے اختراعات کی توقع نہیں کر سکتے۔
سوفسطائیہ اور مقلدان نیٹشے کی دلچسپ عقل آرائیوں کے باوجود تمام اخلاقی
تعقلات کل کی خیر کے گرد گھوم رہے ہیں۔ اخلاق اجتماع احتیاج باہمی اور
تنظیم سے عالم وجود میں آتا ہے۔ معاشرے کے اندر زندگی بسر کرنا اس بات کا
طالب ہوتا ہے کہ فرد اپنے اختیار کا کچھ حصہ عام نظام کے حق میں چھوڑ دے۔
آخر کردار کا معیار اجتماع کی عافیت بن جاتا ہے۔ فطرت اس بات کی
طالب ہے، اور اس کا فیصلہ ہمیشہ قطعی ہوتا ہے۔ ایک جماعت دوسری

جماعت سے مقابلے یا لڑائی کی صورت میں اپنی وحدت و قوت اپنے افراد کی مشترکہ اغراض میں اشتراک عمل کرنے کی قابلیت کے اعتبار سے باقی رہتی ہے۔ اس سے بہتر اتحاد عمل کیا ہو سکتا ہے کہ ہر شخص وہ کام کرتا ہو، جس کو وہ بہتر سے بہتر انجام دے سکتا ہے، یہ تنظیم کی وہ غایت الغایات ہے، جس کے حاصل کرنے کی ہر معاشرے کو کوشش کرنی چاہیئے، اگر یہ باقی رہنا چاہتا ہو۔ مسیحؑ کا قول ہے کہ اخلاق کمزور کے ساتھ مہربانی سے پیش آنے کا نام ہے۔ نیٹشے کہتا ہے کہ اخلاق طاقتور کی بہادری کا نام ہے۔ فلاطون کہتا ہے کہ اخلاق کل کی موثر ہمنوائی ہے۔ غالباً مکمل اخلاقیات کے عالم وجود میں لانے کے لیے تینوں نظریوں کو ترکیب دینا پڑے گا۔ لیکن کیا اس بارے میں شک ہو سکتا ہے کہ ان عناصر میں سے اساسی کونسا ہے؟

فنا ۔ انتقاد

اور اب ہم اس کل یوٹوپیا کے متعلق کیا کہیں گے؟ کیا یہ قابل عمل ہے؟ اور اگر نہیں تو کیا یہ کوئی عملی خصوصیت رکھتا ہے، جس کو اس زمانے میں کام میں لا سکیں۔ کیا اس کا کسی جگہ اور کسی حد تک تحقق ہوا ہے؟

کم از کم آخری سوال کا فلاطون کی تائید میں جواب دیا جا سکتا ہے، ایک ہزار برس تک یورپ پر محافظین کے ایسے نظام نے حکومت کی ہے، جو اس نظام سے بہت کچھ مشابہ تھا، جس کو ہمارے فلسفی نے پیش کیا ہے۔ قرون وسطیٰ میں عالم عیسوی کو تین طبقوں پر تقسیم کرنے کا رواج تھا۔ مزدور Laboratores سپاہی اور Bellatores پادری Oratores

آخری طبقہ اگرچہ تعداد میں چھوٹا تھا، مگر تہذیب و تمدن سے کل آلات و مواقع کا اجارہ دار تھا، اور اس نے کرۂ ارض کے سب سے طاقتور

برِ اعظم کے نصف حصے پر غیر محدود اختیارات کے ساتھ حکومت کی ہے۔ پادریوں کو فلاطون کے محافظین کی طرح سے اقتدار لوگوں کی رائے سے حاصل نہ ہوتا تھا بلکہ مذہبی علوم کے اکتساب اور انتظام مملکت میں قابلیت دکھانے تفکر اور سادگی کی زندگی بسر کرنے کا رجحان رکھنے اور (شاید اتنا اور اضافہ کرنا چاہئے) اپنے رشتہ داروں کے مملکت اور کلیسا میں با اقتدار ہونے سے حاصل ہوتا تھا۔ اپنی حکومت کے بعد کے نصف حصے میں پادری خاندانی افکار سے اُسی قدر آزاد تھے جتنا کہ فلاطون خواہش کر سکتا تھا۔ اور بعض صورتوں میں تناسلی آزادی بھی ان کو محافظین سے کم نہ تھی۔ تجرد پادریوں کی قوت کی نفسیاتی ساخت کا ایک جزو تھا۔ کیونکہ ایک طرف تو اس کی وجہ سے وہ خاندان کی انانیت سے بری تھے، دوسری طرف گوشت پوست کے مطالبے پر ان کا ظاہری غلبہ اس احترام کو اور بڑھا دیتا تھا، جو گناہگار دنیا دار ان کی طرف سے اپنے دلوں میں رکھتے تھے، اور یہ احترام اعتراف کے وقت ان گناہگاروں کی اپنی زندگیوں کے حالات بلا کم و کاست بیان کردینے کی آمادگی کو زیادہ کر دیتا تھا۔

کیتھولک مذہب کی سیاست کا بڑا حصہ فلاطون کے "شاہانہ جھوٹوں" سے ماخوذ یا ان سے متاثر تھا۔ جنت اعراف اور جہنم کے تصورات کا اپنی قرون وسطیٰ کی شکل میں ریپبلک کی آخری کتاب میں پتا چل سکتا ہے۔ مدرسیت کا علم کائنات زیادہ تر ٹاٹموس (Timæus) سے ماخوذ ہے۔ نظریہ حقیقیت (عام تصورات کی خارجی حقیقت) نظریہ مثل کی ایک شرح تھی۔ تعلیمی نصاب چہارگانہ (حساب ہندسہ ہیئت موسیقی) اس نصاب پر ڈھالا گیا تھا جو فلاطون نے تجویز کیا تھا۔ اس نظریے کے مطابق یورپ کے لوگوں پر بغیر کسی قسم کے جبر کے حکومت کی گئی۔ اور انھوں نے اس حکومت کو اس قدر آسانی سے قبول کر لیا کہ ایک ہزار برس تک اپنے حکمرانوں کو کافی مادی تائید بخشی اور حکومت میں کسی مداخلت کا مطالبہ نہیں کیا۔ یہ رضامندی صرف عام آبادی تک محدود نہ تھی۔ تاجر اور سپاہی سردار اور شہری عہدہ دار سب کے سب

روم کے سامنے اپنے گھٹنے ٹیکتے تھے۔ یہ اشرافیہ کچھ کم فراست کی مالک نہیں تھی، اس نے دنیا میں غالباً سب سے حیرت انگیز اور طاقتور تنظیم قائم کی تھی۔

۵۱ یسوعی (Jesuits) جنھوں نے کچھ عرصے تک پیراگوئی پر حکومت کی ہے، غالباً نیم فلاطونی محافظ تھے۔ ان کی ایک تعلیم یافتہ عدیدیہ تھی جو ایک وحشی آبادی میں علم و ہنر کا زور رکھتی تھی۔ اور ایک وقت میں تو نومبر ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد جس اشتراکی جماعت نے روس پر حکومت کی اس نے ایسی شکل اختیار کر لی تھی، جو حیرت انگیز طور پر ریپبلک کو یاد دلاتی تھی۔ ان کی جماعت چھوٹی سی اقلیت تھی جو ایسے عقیدے سے مربوط تھی جو تقریباً مذہبی درجے تک پہنچا ہوا تھا۔ یہ لوگ صحیح الاعتقادی اور خارج از ملت کرنے کے اسلحہ سے کام لیتے تھے، اور اس قدر اپنے مسلک میں پکے تھے جتنا کہ کوئی ولی اپنے مسلک پر پکا ہو سکتا ہے۔ یہ آدھے یورپ پر حکومت کرتے تھے، مگر خود کفایت شعاری کی زندگی بسر کرتے تھے۔

ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے، کہ بعض حدود کے اندر اور بعض شرائط کے ساتھ فلاطون کی تجویز قابل عمل ہے۔ اور درحقیقت اس نے اس کو زیادہ تر حقیقی عمل سے قائم کیا تھا جو اس نے اپنے اسفار میں دیکھا تھا۔ وہ مصریوں کی مذہبی حکومت سے متاثر ہوا تھا۔ یہاں پر ایک قدیم اور عظیم الشان تمدن تھا، جس پر ایک چھوٹی سی مذہبی جماعت حکومت کرتی تھی۔ یونانی جماعت مقتدرہ کے جھگڑے ظلم اور نالائقی کے مقابلے میں یہ فلاطون کو مملکت کی بہت ہی بلند پایہ صورت معلوم ہوئی تھی (لاز ۸۱۹) اٹلی میں وہ ایک عرصے تک فیثا غورثی جماعت کے پاس مقیم رہا تھا۔ یہ لوگ سبزی خور اور اشتراکی تھے، اور پشتہا پشت سے اس یونانی نوآبادی پر حکومت کرتے چلے آ رہے تھے، جس میں کہ یہ رہتے تھے۔ اسپارٹا میں اس نے ایک چھوٹی سی حکمران جماعت دیکھی تھی، جو ایک محکوم آبادی کے درمیان سخت اور سادہ زندگی گزارتی تھی۔ وہ ساتھ کھاتے تھے اصلاح نسل کی غرض سے ازدواجی تعلقات کو محدود رکھتے تھے۔ اور بہادروں کو کئی کئی بیویاں

رکھنے کا حق دیتے تھے۔ اس نے بلاشبہ پوری پائیڈیز کو بیویوں کے مشترک کر دینے، غلاموں کو آزاد کر دینے اور یونان میں ایک یونانی اتحاد قائم کر کے امن و امان پیدا کرنے کی تائید کرتے ہوئے سنا تھا) میڈیا۔ ۲۳۰۔ فریگمنٹ ۶۵۵) اور اس میں بھی شک نہیں کہ وہ بعض کلبیہ سے واقف تھا جنھوں نے اس جماعت میں جس کو اب عام طور سقراطی پیسار کہا جاتا تھا، ایک ایک قومی اشتراکی تحریک پیدا کی تھی مختصر یہ کہ فلاطون نے اپنی تجویز پیش کرتے وقت یہ ضرور محسوس کیا ہوگا کہ وہ ان حقیقی حالات پر جن کو اس کی آنکھوں نے دیکھا تھا، کوئی ناممکن اضافہ نہیں کر رہا ہے۔

مگر اس کے باوجود ارسطو کے زمانے سے اب تک نقادوں کو رپبلک میں اعتراض و شک
۵۲ کے لیے بہت سے مواقع ملے ہیں۔ ایسٹیجرائی کلبی اختصار کے ساتھ کہتا ہے کہ یہ اور بہت سی اور چیزیں مختلف زمانوں میں کئی بار اختراع کی گئی ہیں۔ ایسے معاشرے کا نقشہ قائم کر لینا، جس میں تمام آدمی بھائیوں کی طرح سے رہتے ہوں، بہت اچھا معلوم ہوتا ہے، مگر اس لفظ کے معنے کو اپنے تمام مذکر معاصرین پر وسعت دینا، اس کو ہر قسم کے معنے سے عاری کر دینے کے مرادف ہے۔ یہی حال اشتراک ملک کا ہے۔ اس کے معنے ذمہ داری کے ختم کر دینے کے ہیں۔ جب ہر شے ہر شخص کی ہوگی، تو کوئی شخص کسی شے کی پروا نہیں کرے گا۔ اور آخر میں یہ عظیم الشان قدامت پرست کہتا ہے، کہ اشتراکیت لوگوں کو اس قدر ایک دوسرے سے متصل کر دے گی کہ خود یہ ناقابل برداشت ہو جائے گا، اس کی وجہ سے خلوت یا انفرادیت کا کوئی موقع نہ رہے گا، اور یہ صبر اور اتحاد عمل کی ایسی فضیلتوں کو مسلم مانے گی جو صرف اولیاہی کی اقلیت میں ہو سکتی ہیں۔ ہمیں نہ تو فضیلت کا ایسا معیار مسلم ماننا چاہیے، جو معمولی اشخاص کے معیار سے زیادہ ہو، اور نہ ایسی تعلیم کو مسلم ماننا چاہیے، جو خاص فطرت کے آدمی کو خاص حالات ہی میں حاصل ہو سکتی ہو۔"

یہاں تک تو فلاطون کا سب سے بڑا (اور سب سے زیادہ حاسد) شاگرد اور بعد کے انتقادات ایک ہی راگ الاپتے ہیں۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ فلاطون نے رواج کی اس قوت کا کم اندازہ کیا ہے، جو وحدت ازدواج کے دستور اور اس اخلاقی ضابطے میں جمع ہو گیا ہے، جو اس دستور سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس نے یہ فرض کر کے کہ ایک آدمی بیوی کے صرف ایک جزئی حصے پر راضی ہو جائے گا، مردوں کے تملیکی رشک کا غلط اندازہ کیا ہے۔ اور یہ فرض کر کے کہ مائیں اس بات پر راضی ہو جائیں گی کہ ان کے بچے ان سے لے لیے جائیں اور ان کی سنگ دلانہ گمنامی میں پرورش کی جائے، جبلت مادری کا صحیح اندازہ نہیں کیا۔ اور ان سب سے

بڑھ کر بات یہ ہے کہ خاندان کو مٹا کر وہ اخلاق کی بڑی پرورش گاہ تعاونی اور اشتراکی عادات کے بڑے ذریعے کو تباہ کئے دے رہا ہے جو اس کی مملکت کی نفسیاتی بنیاد ہوتے۔ بے مثال فصاحت سے اس نے اسی شاخ کو کاٹ ڈالا جس پر کہ وہ بیٹھا ہوا تھا۔

ان سب نکتہ چینیوں کا جواب محض یہ کہہ کر دیا جا سکتا ہے کہ ان سے صرف بھونس کا آدمی تباہ ہوتا ہے۔ فلاطون نے صراحتہً اکثریت کو اپنی اشتراکی تجویز سے مستثنیٰ کر دیا ہے۔ وہ اس امر کو اچھی طرح سے تسلیم کرتا ہے کہ اس مادی نفس کشی کے جس کو وہ فرمانروا طبقے کے لیے تجویز کرتا ہے صرف چند آدمی قابل ہوتے ہیں محافظ ہی ہر دوسرے محافظ کو بھائی یا بہن کہیں گے صرف محافظ ہی مال و اسباب کے بغیر زندگی بسر کریں گے۔ باقی عظیم الشان اکثریت تمام باعزت معاہد کو باقی رکھے گی۔ ان کو ملک روپیہ عیش و آرام مقابلہ سب حاصل ہوں گے اور خلوت بھی حسب خواہش میسر ہوگی۔ شادی میں وہ اس قدر وحدت ازدواج پر عمل پیرا ہو سکتے ہیں جس قدر کہ وہ برداشت کر سکتے ہوں، اور ان تمام اخلاق کو حاصل کر سکتے ہیں جو وحدت ازدواج اور خاندان سے عالم وجود میں آتے ہیں۔ باپ اپنی بیویوں اور مائیں اپنے بچوں کو مرتے دم تک اپنے ساتھ رکھ سکتے ہیں۔ محافظین کے متعلق یہ ہے کہ ان کو اشتراکی رجحان کی اتنی ضرورت نہیں ہے جس قدر کہ احساس عزت اور عزت سے محبت کی۔ ان کو رحم دلی نہیں بلکہ غرور اپنی جگہ پر قائم رکھے گا۔ مادری جبلت کے متعلق یہ ہے کہ یہ ولادت بلکہ نشوونما سے پہلے قوی نہیں ہوتی۔ عام طور پر ماں نوزائیدہ بچے کو خوشی کے ساتھ نہیں بلکہ صبر و رضا کے ساتھ قبول کر لیتی ہے۔ اس کی محبت بتدریج بڑھتی ہے اور کوئی اچانک معجزہ نہیں ہوتی۔ جوں جوں بچہ بڑھتا ہے اور ماں کی زحمت کش نگرانی میں شکل اختیار کرتا جاتا ہے محبت بڑھتی جاتی ہے۔ اور اس کی محبت دل پر اس وقت تک کامل طور پر قابض نہیں ہوتی جب تک یہ مادری ہنرمندی کا مرقع نہیں بن جاتا۔ 53

دوسرے اعتراضات جو ہیں وہ نفسیاتی نہیں بلکہ معاشیاتی ہیں۔ اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ فلاطون کی جمہوریت پر شہر کو دو حصوں میں تقسیم کر دینے کی شدت کے ساتھ مخالفت کرتی ہے، اور پھر ہمارے سامنے ایسا شہر پیش کرتی ہے جو تین حصوں میں منقسم ہوتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلی صورت میں تقسیم معاشیاتی تصادم اور کشمکش کی بنا پر ہوتی ہے۔ فلاطون کی مملکت میں محافظ اور معاون طبقے خاص طور پر اس مال و اسباب کے مقابلے میں شریک ہونے سے باز

رکھے جاتے ہیں۔ لیکن اس صورت میں محافظوں کو ذمہ داری کے بغیر قوت حاصل ہوگی۔ اور
کیا یہ صورت استبداد کا باعث نہ ہوگی۔ ہرگز نہیں۔ ان کو سیاسی اقتدار و اختیار حاصل ہوتا
ہے، مگر معاشی قوت و دولت حاصل نہیں ہوتی۔ معاشی جماعت اگر محافظین کے طریق حکومت
سے مطمئن نہ ہو تو یہ ان کا وظیفہ روک سکتی ہے جس طرح پارلیمانیں بجٹ کو روک کر مجالس عاملہ
کو قابو میں رکھتی ہیں۔ لیکن اگر محافظوں کے پاس سیاسی قوت ہو اور معاشی قوت نہ ہو تو وہ
اپنی حکومت کو کیونکر قائم رکھ سکتے ہیں۔ کیا ہیرنگٹن اور مارکس اور بہت سے دوسرے
لوگوں نے یہ ثابت نہیں کر دیا ہے کہ سیاسی اقتدار معاشی اقتدار کا پرتو ہے، اور جیسے ہی معاشی
قوت سیاسی اعتبار سے محکوم جماعت کے پاس چلی جاتی ہے تو یہ متزلزل ہو جاتا ہے جس طرح
سے اٹھارہویں صدی میں متوسط طبقے کی صورت میں ہوا تھا۔ ۵۲
یہ نہایت ہی اہم اعتراض ہے، اور شاید تباہ کن ہے۔ اس کا یہ جواب دیا جا سکتا
ہے کہ رومن کیتھولک کلیسا کی قوت جس نے کینوسا میں بادشاہوں تک کو جھکنے پر مجبور
کر دیا تھا، اپنی حکومت کی ابتدائی صدیوں میں اعتقادات پر مبنی تھی، نہ کہ دولت پر، مگر
ممکن ہے کہ کلیسا کی طویل حکومت یورپ کی زرعی حالت کی بنا پر ہو، کیونکہ ایک زرعی آبادی
کا عناصر کے تلون پر مدار ہوتا ہے، اور فطرت پر قابو حاصل کرنے میں یہ خود کو لاچار پاتی ہے۔ یہ
امر ہمیشہ پہلے خوف اور پھر عبادت کا موجب ہوتا ہے، اس لیے یہ فوق الفطری اعتقادات کی
جانب مائل ہو جاتی ہے۔ جب صنعت و تجارت نے ترقی کی تو ایک نئی قسم کا ذہن اور نئی قسم کا
انسان عالم وجود میں آیا جو زیادہ حقیقت پسند اور دنیادار تھا۔ جیسے ہی کلیسا کی قوت کا اس
نئے معاشی واقعے کے ساتھ تصادم ہوا یہ ختم ہونے لگی۔ سیاسی قوت کے لیے ضروری ہے کہ
یہ معاشی قوتوں کے متغیر رہنے والے زیر باقی کے ساتھ خود کو مطابق کرتی رہے۔ فلاطون کے محافظین
کا معاشی اعتبار سے معاشی طبقے کا محتاج رہنا، بہت جلد ان کو اس طبقے کے ماتحت سیاسی عمال کی
صورت میں منتقل کر دے گا۔ فوجی قوت کے انتظام سے بھی اس ناگزیر نتیجے کی روک تھام نہیں ہو سکتی
جس طرح سے روس کی فوجی قوتیں مالکانہ انفرادیت کے نشو و نما کو کاشتکاروں میں نہیں روک سکیں،
جن کو غذا کی پیداوار پر اقتدار تھا، اور اسی وجہ سے قوم کی قسمت ان کے ہاتھوں میں تھی۔ فلاطون کی
بات صرف اس حد تک تسلیم کی جا سکتی ہے کہ اگر سیاسی حکمت عملی کو بھی وہ فریق متعین کرے جس کو
معاشی اعتبار سے غلبہ حاصل ہو، تو بھی یہ بہتر ہے کہ اس کو ایسے عہدہ دار عملی جامہ پہنائیں جو اس

غرض کے لیے خاص طور پر تیار کیئے گئے ہوں، بہ نسبت ایسے اشخاص کے جو تجارت یا صنعت سے
سیاسی خدمت پر فنون مدبری میں کسی قسم کی تربیت حاصل کیئے بغیر کود پڑیں۔

فلاطون کے یہاں غالباً سب سے زیادہ جس شے کی کمی ہے، وہ تحول یا تغیر کا ہر قلیطوسی
احساس ہے۔ اسے اس دنیا کی متحرک تصویر کو ساکن یا قائم بنا دینے کا بہت فکر ہے۔ وہ ایک بزدل
فلسفی کی طرح سے محض انتظام کو پسند کرتا ہے۔ وہ ایتھنز کے جمہوری ہنگامے سے اس قدر ڈر گیا
ہے کہ انفرادی قیمتوں کو اس نے بھلا ہی دیا ہے۔ وہ آدمیوں کو طبقوں میں اس طرح سے ترتیب
دیتا ہے، جس طرح علم دیدان کا ماہر مکھیوں کا اصطفاف کرتا ہے۔ اور غایت کے پورا کرنے کے لیے
وہ مذہبی خرافات سے کام لینے کے بھی خلاف نہیں ہے۔ اس کی مملکت سکونی ہے۔ یہ آسانی کے
ساتھ دقیانوسی معاشرہ بن سکتی ہے، جن پر ایسے ہشتاد سالہ بڈھے حکومت کرتے ہوں، جو ۵۵
اختراع و ایجاد کے دشمن اور تغیر کے مخالف ہوں۔ یہ علم ہی علم ہے، فن نہیں ہے۔ یہ انتظام کو حد سے زیادہ
بڑھاتی ہے، جو حکمی ذہن کو اس قدر عزیز ہے، اور آزادی کو نظر انداز کرتی ہے، جو فن کی روح ہے۔
یہ حسن کے نام کی پرستش کرتی ہے، لیکن اہل ہنر کو جو حسن پیدا کر سکتے یا اس کو بتا سکتے ہیں جلا وطن
کرتی ہے۔ یہ اسپارٹا یا پروشیا ہے نہ معیاری مملکت۔

غیر خوشگوار لوازم کو ایمانداری سے ضبط تحریر میں لانے کے بعد اب فلاطون کے تعقل کی
قوت اور گہرائی کا اعتراف کرنا باقی رہ جاتا ہے۔ اساسی طور پر اس کا خیال صحیح ہے ـــــ کیا نہیں
ہے؟ اس دنیا کو صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ اس پر اس کے سب عاقل و دانا حکومت کریں،
یہ ہمارا کام ہے کہ ہم اس کے خیال کو اپنے زمانے اور اپنی حدود کے مطابق کر لیں۔ اس زمانے میں ہمیں
جمہوریت کو مسلم ماننا چاہیئے ہم حق رائے کو اس طرح سے محدود نہیں کر سکتے، جس طرح سے فلاطون
نے تجویز کیا تھا۔ لیکن ہم برسر عہدہ ہونے پر قیود عائد کر سکتے ہیں، اور اس طرح پر جمہوریہ اور اشرافیہ
کا وہ امتزاج پیدا کر سکتے ہیں، جو فلاطون کا مدعا معلوم ہوتا ہے۔ ہم اس کی اس حجت کو تسلیم کر سکتے ہیں،
کہ اہل تدبیر کو بھی طبیبوں کی طرح سے مخصوص اور مکمل تعلیم دینی چاہیئے۔ ہم اپنی جامعات میں سیاسیات
اور انتظام مملکت کے شعبے قائم کر سکتے ہیں اور جب یہ شعبے اچھی طرح سے کام کرنے لگیں، تو ہم یہ قاعدہ
مقرر کر سکتے ہیں، کہ جب تک لوگ اس قسم کے سیاسی مدرسوں کے فارغ التحصیل نہ ہوں، ان کی سیاسی
خدمت کے لیے نامزدگی عمل میں نہ آسکے۔ ہم ہر اس شخص کو جو سیاسیات اور انتظام مملکت کی تربیت
حاصل کر لے سیاسی خدمت کے لیے نامزد ہونے کے قابل قرار دے سکتے ہیں، اور اس طرح سے نامزدگی کے

اس پیچیدہ نظام کو ختم کر سکتے ہیں، جو ہماری جمہوریت کی خرابی کا مرکز ہے۔ حلقۂ انتخاب ہر ایسے آدمی کو پسند کر سکے جو پوری تعلیم و تربیت حاصل کر کے امیدوار بنا ہو۔ اس طرح سے جمہوری پسند اب سے کہیں زیادہ وسیع ہو گی، جب کہ ہر چوتھے سال ناموں کے اختلاف کے ساتھ وہی تماشہ اور مکاری ہوتی ہے۔ عہدوں کو انتظام مملکت کے فاضلوں کی حد تک محدود رکھنے کی تجویز کو کامل طور پر جمہوری بنانے کے لیے صرف ترمیم کی ضرورت ہو گی اور وہ تعلیمی موقع کی ایسی مساوات جو تمام مردوں اور عورتوں کے لیے بلالحاظ ان کے والدین کے وسائل کے اعلیٰ تربیت اور سیاسی ترقی کی راہ کھول دے۔ یہ بالکل آسان بات ہے کہ بلدیئے تعلقے اور ریاستیں ابتدائی اور فوقانیہ مدارس کے اور کالج کے ایسے طالب علموں کو وظائف دیں، جو ایک خاص معیار قابلیت تک پہنچ چکے ہوں، اور جن کے والدین مالی اعتبار سے ان کی آیندہ تعلیمی منزل میں کفالت نہ کر سکتے ہوں، یہ جمہوریت واقعی جمہوریت کہلانے کی مستحق ہو گی۔ ۵۶

آخر میں یہ بتا دینا بھی انصاف سے بعید نہ ہو گا کہ افلاطون اس بات کو سمجھتا ہے، کہ اس کا یوٹوپیا عملی عالم میں پوری طرح ٹھیک نہیں بیٹھتا۔ وہ اس کو تسلیم کرتا ہے کہ اس نے ایک نصب العین بیان کر دیا ہے، جس تک پہنچنا دشوار ہے۔ مگر اس کے جواب میں وہ یہ کہتا ہے، کہ پھر بھی پسندیدہ تصویریں کھینچنا مفید ہے۔ انسان کو اسی بنا پر اہمیت حاصل ہے، کہ وہ ایک بہتر عالم کی تمثال قائم کر سکتا ہے، اس طرح سے اس کا کم از کم کوئی حصہ تو معرض حقیقت میں آ جائے گا، انسان ایسا حیوان ہے، جو یوٹوپیا بناتا ہے۔ "ہم آگے پیچھے دیکھتے ہیں، اور جو کچھ نہیں ہوتا اس کی آرزو کرتے ہیں"۔ اور یہ سب بے نتیجہ بھی نہیں ہوتا۔ بہت سے خوابوں کے اعضا جوارح پیدا ہوئے ہیں اور وہ چلے ہیں، بہت سے خوالوں کے اکیرس کے خواب کی طرح سے کہ آدمی اڑ سکتا ہے، پر نکل آتے ہیں اور وہ اڑے ہیں۔ اگر ہم نے صرف تصویر ہی بنائی ہو تو بھی یہ ہماری حرکت اور عمل کے لیے مقصد اور نمونے کا کام دے سکتی ہے۔ جب ہم میں سے بہت سے آدمی تصویر کو دیکھ لیں گے اور اس کی روشنی پر چلیں گے، تو یوٹوپیا خود بخود نقشے پر آ جائے گا، فی الحال آسمان پر ایسے شہر کا نمونہ ہے۔ جو چاہے اس کو دیکھ سکتا ہے، اور دیکھ کر اس کے مطابق حکومت کر سکتا ہے۔ لیکن ایسا شہر حقیقۃً دنیا میں ہو یا نہ ہو...... وہ اس شہر کے قوانین کے مطابق عمل

کرے گا۔ اور کسی دوسرے شہر کے قوانین کے مطابق نہ کرے گا (لاز ۵۹۲)۔
شک کی ان تمام گنجائشوں کے باوجود، یہ حکیم اس قدر جری ضرور تھا۔ کہ جب ایک موقع اس کی تجویز کو علمی جامہ پہنانے کا آیا، تو اس نے اپنے آپ کو خطرے میں ڈالدیا۔ ۳۸۷ قبل مسیح میں ڈائی نوسیس نے جو اس وقت خوش حال اور طاقتور شہر سرقوسہ یعنے سسلی کے دارالسلطنت کا فرمانروا تھا، فلاطون کو دعوت دی کہ آئے اور اس کی سلطنت کو یوٹوپیا بنادے، اور حکیم نے یہ خیال کرکے کہ ایک پوری قوم کی نسبت ایک آدمی کو تعلیم دینا آسان ہے، اگرچہ وہ بادشاہ ہی کیوں نہ ہو، دعوت کو قبول کرلیا۔ مگر جب ڈائی نوسیس نے یہ دیکھا کہ تجویز کے بموجب یا تو وہ فلسفی بن جائے، یا بادشاہت چھوڑدے تو اس کو تامل ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں میں سخت جھگڑا ہوا۔ ۵۷
بیان کیا جاتا ہے کہ فلاطون کو بیچ دیا گیا اور اس کے دوست اور شاگرد انی سرس نے اس کو چھڑایا اور فلاطون کے ایتھنزی متبعین نے جب وہ رقم ادا کرنی چاہی جو انی سرس نے صرف کی تھی، تو اس نے یہ کہہ کر لینے سے انکار کردیا کہ فلسفے کی مدد کرنے کا صرف تمھیں کو حقدار نہیں ہونا چاہئے یہ تجربہ (اور اگر ہم دیوجانس لیرٹس پر اعتبار کرسکتے ہیں تو ایسا ہی ایک اور تجربہ) غالباً فلاطون کی آخری تصنیف دی لاز کی اس قدامت پرستی کا سبب ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب التباس دور ہوچکا ہے۔
اور اس کے باوجود اس کی طویل زندگی کے آخری سال کافی مسرت کے ساتھ بسر ہوئے ہوں گے۔ اس کے شاگرد ہر سمت میں پھیل گئے تھے، اور ان کی کامیابی کی وجہ سے اس کی ہر جگہ عزت ہوتی تھی۔ وہ امن و امان کے ساتھ اپنی اکیڈیمی میں تھا، اور اپنے طلبا کے ایک مجمع سے دوسرے مجمع تک جاتا اور ان کو مسائل اور کام دیتا تھا، جن پر ان کو تحقیق کرنی ہوئی تھی اور جب وہ پھر ان کے پاس آتا تھا، تو اپنی تحقیق پیش کرنی اور جواب دینا ہوتا تھا۔ لاروشی فوکو نے کہا ہے کہ "کم لوگ بوڑھا ہونا جانتے ہیں"۔ فلاطون جانتا تھا۔ سولن کی طرح سے سیکھنا اور سقراط کی طرح سکھانا" نوتقین

نوجوانوں کی رہبری کرنا اور رفیقوں کی علمی محبت حاصل کرنا۔ کیونکہ اس کے طلبہ بھی اس سے اسی طرح سے محبت کرتے تھے جس طرح سے وہ ان سے محبت کرتا تھا وہ اسی طرح سے ان کا دوست بھی تھا جس طرح سے ان کا فلسفی اور رہبر تھا۔ اس کے ایک شاگرد کو وہ عظیم الشان مرحلہ درپیش تھا جس کو شادی کہتے ہیں۔ اس نے استاد کو شادی کی ضیافت میں بلایا۔ فلاطون جو اس وقت اسی سال کے سن کو پہنچ چکا تھا، آیا اور خوشی منانے والوں میں بخوشی شریک ہو گیا۔ ہنسی خوشی میں گھنٹے گزر رہے تھے، کہ بوڑھا فلسفی مکان کے ایک گوشے میں چلا گیا اور کرسی پر ذرا دیر نیند لینے کے لیے بیٹھ گیا، صبح کو جب دعوت ختم ہوئی تو تھکے ماندے جشن منانے والے اس کو جگانے کے لیے آئے۔ انھوں نے پایا کہ شب میں وہ چپ چاپ ذرا دیر کی نیند سے ابدی نیند میں منتقل ہو گیا تھا۔ سارا ایتھنز قبر تک اس کے ساتھ گیا۔

۵۸

باب ۲

ارسطو اور یونانی حکمت

۱۔ تاریخی پس منظر

ارسطو ۳۸۴ قم میں اسٹیجرا میں پیدا ہوا تھا، جو ایتھنز کے شمال میں تقریباً دو سو میل کے فاصلے پر مقدونیہ کا ایک شہر ہے۔ اس کا باپ سکندر کے دادا ایمنٹس شاہ مقدونیہ کا دوست اور طبیب تھا۔ خود ارسطو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسکلیپیڈس کی بڑی طبی برادری کا رکن ہو گیا تھا۔ اس کی پرورش طب کی شہرت میں ہوئی تھی جس طرح سے بہت سے بعد کے فلاسفہ کی پرورش تقدس کی شہرت میں ہوئی تھی۔ اس کو حکمی رجحان کا ہر طرح موقع اور ہر قسم کی ہمت افزائی میسر تھی۔ وہ شروع ہی سے حکمت کا بانی ہونے کے لیے تیار تھا۔

اس کی نوجوانی کے متعلق مختلف افسانے مشہور ہیں۔ ایک کی رو سے وہ اپنی موروثی جائداد کو عیاشی میں ضائع کرتا ہے اور فاقوں سے بچنے کے لیے فوج میں شریک ہوتا ہے، پھر اسٹیجرا مطب کرنے کے لیے لوٹتا ہے، اور

تیس سال کی عمر میں فلاطون سے فلسفہ پڑھنے کے لیے ایتھنز آتا ہے۔ دوسرا افسانہ جو شبتہً اس کی شان کے زیادہ مطابق معلوم ہوتا ہے، اس کو اٹھارہ سال کی عمر میں ایتھنز لاتا ہے، اور فوراً بڑے استاد کی شاگردی میں داخل کر دیتا ہے۔ مگر اس سے زیادہ قرین قیاس بیان سے بھی ایک بے پروا اور بے قاعدہ نوجوان کا پتا چلتا ہے جو تیزی کے ساتھ اپنی دولت ضائع کر رہا ہے[1]۔ بہرصورت پریشان ناظر یہ کہہ کر تشفی دے سکتا ہے کہ آخر کار ہمارا فلسفی اکیڈیمی کے خاموش گوشوں میں لنگر انداز ہو جاتا ہے۔

فلاطون سے اس نے آٹھ سال یا بیس سال تعلیم حاصل کی۔ درحقیقت ارسطو کے نظریات میں حتیٰ کہ ان نظریات میں جو سب سے زیادہ مخالف فلاطون ہیں فلاطونیت کا ساری ہونا، طویل تر مدت کا پتا دیتا ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ تصور کرنا چاہے کہ یہ برس بہت ہی خوشی اور دلچسپی سے گزرے ہوں گے۔ 59
ایک عالی دماغ شاگرد کی ایک لاثانی استاد رہبری کرتا ہے، اور وہ یونانی عاشقوں کی طرح سے فلسفے کے باغوں کی سیر کرتے ہیں۔ لیکن یہ دونوں طباع تھے۔ اور یہ ایک مشہور بات ہے کہ طباعوں میں ایسی موافقت ہوتی ہے جیسی کہ ڈائنامیٹ اور آگ میں۔ ان میں تقریباً نصف صدی کا فرق ہے، فہم کے لیے اس مدت کی خلیج کا پاٹنا اور روحوں کے فرق کو مٹانا دشوار تھا۔ فلاطون نے اس عجیب نئے شاگرد کی عظمت کو پہچان لیا تھا۔ جو بظاہر شمال کے وحشی حصے سے آیا تھا اور اس کو ایک مرتبہ اکیڈیمی کی عقل مجسم کہا تھا۔ ارسطو نے کتابوں کے جمع کرنے میں (یعنے ان دنوں میں جب کہ مطبع نہ تھا، اور صرف قلمی کتابیں تھیں) دریا دلی سے روپیہ خرچ کیا تھا۔ یوری پائڈیز کے بعد سے وہ پہلا شخص ہے جس نے کتب خانہ جمع کیا تھا۔ اور اس نے کتب خانے کی ترتیب کے اصول کی بنیاد رکھی تھی، جو اس کی بہت سی علمی خدمتوں میں سے ایک ہے؛ اسی لیے فلاطون نے

[1] گروٹ، ارسطو، لندن طبع ۱۸۷۲ء صفحہ ۴ زیلر ارسطو اور ابتدائی مشائیں طبع لندن ۱۸۹۷ء جلد اول صفحہ ۶۔

ارسطو کے گھر کو "پڑھنے والے کا گھر" کہا تھا، اور اس سے غالباً اس کی مخلصانہ تعریف تھی۔ لیکن ایک قدیم گپ ہے کہ استاد ارسطو کے کتاب کا کیڑا ہونے پر ایک جھبی ہوئی مگر سخت چوٹ کرنا چاہتا تھا۔ مگر حقیقی جھگڑا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فلاطون کی زندگی کے آخری زمانے میں پیش آیا۔ ہمارے شوقین نوجوان میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فلسفے کی عنایتوں اور محبتوں کے بدلے اپنے روحانی باپ کے خلاف لڑائیوں پیدا ہو گئی تھی، اور وہ یہ اشارے کرنے لگا تھا کہ حکمت فلاطون کے ساتھ ختم ہو جائے گی۔ اور بوڑھا حکیم اپنے شاگرد کو ایسے بچھیرے سے تشبیہ دیتا تھا جو اپنی ماں کا تمام دودھ پی لینے کے بعد اس کے لاتیں مارتا ہو، زیلر جس کے صفحات میں ارسطو احترام کا نروان حاصل کر لیتا ہے، ان سب افسانوں کو رد کرتا ہے۔ مگر ہمارا قیاس ہے کہ جہاں اب تک اس قدر دھواں ہے وہاں کبھی نہ کبھی آگ ضرور تھی۔

اس ایتھنز کی دور کے دوسرے واقعات اور بھی زیادہ مشکوک ہیں۔ بعض سوانح نگار یہ کہتے ہیں ارسطو نے اسو کریٹیز کے مقابلے میں خطابت کے ایک مدرسے کی بنیاد ڈالی تھی اور اس کے اس مدرسے کے شاگردوں میں سے دولت مند ہرمیاز بھی تھا، جو جلد ہی شہری ریاست اٹرنیس کا مطلق العنان حاکم بن جانے والا تھا۔ اس رتبے پر پہنچ کر اس نے ارسطو کو ۲۰
اپنے دربار میں بلایا، اور ۳۴۴ ق م اس کی سابقہ مہربانیوں کے عوض میں اپنی بہن (یا بھتیجی) سے اس کی شادی کر دی۔ شبہہ ہو سکتا ہے، کہ یہ عنایت کہیں مصیبت نہ ہوئی ہو۔ مگر مورخ ہم کو یقین دلاتے ہیں کہ ارسطو نے اپنی طباعی کے باوجود اپنی بیوی کے ساتھ ہنسی خوشی سے زندگی بسر کی، اور اپنی وصیت میں اس کا نہایت محبت سے تذکرہ کیا۔ اس کے ایک سال کے بعد ہی فلپ شاہ مقدونیہ نے ارسطو کو اپنے بیٹے سکندر کی تعلیم کے سلسلے میں اپنے دربار میں بلایا۔ اس سے ہمارے فلسفی کی بڑھی ہوئی شہرت کا پتا چلتا ہے، کہ اپنے زمانے کا سب سے بڑا بادشاہ جب دنیا کے آیندہ مالک کی تعلیم کے لیے سب سے بڑے معلم کی تلاش کرتا ہے، تو نظر انتخاب ارسطو پر پڑتی ہے،

فلپ نے اس کا تہیہ کر رکھا تھا کہ اس کے بیٹے کو ہر تعلیمی سہولت بہم پہنچے کیونکہ سکندر کے متعلق اس کے غیر محدود ارادے تھے۔ ۳۵۶ ؁ء میں اس نے تھریس کو فتح کر لیا تھا، جس سے اس کو سونے کی کانوں پر قابو حاصل ہو گیا اور اسے اس سے دس گونہ زیادہ سونا ملنے لگا جتنا کہ اس وقت لاریم کی رو بہ زوال چاندی سے ایتھنز میں آتا تھا۔ اس کی قوم طاقتور کسانوں اور سپاہیوں پر مشتمل تھی جو ابھی تک شہری تعیش اور بدکاری سے خراب نہیں ہوئے تھے۔ یہاں پر ایسی باتیں جمع ہو گئی تھیں، جن کی وجہ سے سو چھوٹی شہری ریاستوں کو فتح کر کے یونان کو سیاسی اعتبار سے متحد کر لینا ممکن تھا۔ فلپ کو اس انفرادیت سے کوئی ہمدردی نہ تھی جس نے یونان میں علم و فن کو تو ترقی دی تھی، مگر ساتھ ہی معاشری نظام کو منتشر کر دیا تھا۔ ان تمام چھوٹے چھوٹے دارالحکومتوں میں اسے حیات بخش تہذیب اور لاثانی ہنر نظر نہیں آتا تھا، بلکہ تجارتی خرابی اور سیاسی ابتری نظر آتی تھی۔ وہ دیکھتا تھا کہ سوداگروں اور ساہوکاروں کی نہ سیر ہونے والی حرص قوم کے ضروری ذرائع کو ہضم کئے جا رہی ہے، اور نالائق مدبر اور ہوشیار مقرر مصروف عوام کو گمراہ کر کے مہلک سازشوں اور لڑائیوں میں مبتلا کر رہے ہیں۔ دھڑے بندیاں مختلف طبقوں کو جدا کر کے ذاتوں کی صورت پیدا کر رہی ہیں۔ فلپ کہتا تھا کہ یہ قوم نہیں ہے، بلکہ افراد کا ایک ہنگامہ ہے، جس میں طباع اور غلام سب شامل ہیں۔ وہ اس ابتری کو انتظام سے بدلنا، اور کل یونان کو دنیا کے سیاسی مرکز اور بنیاد کی حیثیت سے متحد اور طاقتور بنا کر کھڑا کرنا چاہتا تھا۔ اپنی جوانی میں اس نے ایتھنز میں فوجی قیادت اور شہری انتظام کے فنون کو شریف النفس ایپامی ننڈ اس کی شاگردی میں 61
حاصل کیا تھا، اور اب اس نے جرأت کے ساتھ جو اس میں اس کی ہوس ملک گیری کی طرح سے بے پایاں تھی، اپنی تعلیم سے فائدہ اٹھانا شروع کیا۔ ۳۳۸ ؁ ق م۔ ایتھنز والوں کو کیرونیا میں شکست دی، اور آخرکار یونان کو متحد دیکھ لیا، اگرچہ یہ اتحاد زنجیروں کے ساتھ ہوا تھا۔ ابھی وہ اپنی فتح سے

مسرور ہی ہو رہا تھا، اور اس امر کے منصوبے ہی بنا رہا تھا کہ اسے اور اس کے بیٹے کو کس طرح سے دنیا پر قابو حاصل کر کے اس کو متحد بنانا چاہئے کہ وہ قاتل کے حملے کا شکار ہو گیا۔

سکندر ارسطو کی آمد کے وقت تیرہ برس کا ایک خود سر نوجوان تھا، پرجوش صرعی اور تقریباً شرابی۔ اس کا مشغلہ یہ تھا، جن گھوڑوں کو کوئی سیدھا نہیں کر سکتا تھا ان کو وہ سیدھا کر دیا کرتا تھا۔ اس نوخیز کوہ آتش فشاں کے ٹھنڈا کرنے میں فلسفی کی کوشش کوئی بہت زیادہ کارگر نہیں ہوئی، سکندر کو بیوسی فلس (گھوڑا) کے مقابلے میں جس قدر کامیابی ہوئی اتنی ارسطو کو سکندر پر نہیں ہوئی۔ پلوٹارک کہتا ہے کہ کچھ عرصے کے لیے تو سکندر ارسطو کو اپنے باپ کی طرح سے عزیز رکھتا تھا، اور یہ کہتا تھا کہ اگرچہ باپ سے مجھے زندگی ملی ہے مگر زندہ رہنے کا فن مجھے ارسطو سے حاصل ہوا ہے (ایک عمدہ یونانی مقولہ ہے کہ "زندگی تو عطیۂ فطرت ہے مگر عمدگی کے ساتھ زندگی بسر کرنا عطیۂ حکمت ہے")۔ سکندر ارسطو کو اپنے ایک خط میں لکھتا ہے کہ "بجائے اس کے کہ میری مملکت کی وسعت سب سے زیادہ ہو میری تو آرزو یہ ہے کہ میں علم خیر میں سب سے بڑھ جاؤں"، مگر غالباً یہ نوجوان شہزادے کی محض قدردانی ہی تھی، کیونکہ فلسفے کے پرجوش ہنتدی کی تہ میں ایک وحشی شاہزادی اور خودسر بادشاہ کا شر انگیز بیٹا تھا۔ عقل کی پابندیاں ان موروثی جذبات کو قابو میں رکھنے کے لیے بہت ہی کمزور تھیں۔ دو سال بعد ارسطو نے فلسفے کو تخت سلطنت پر متمکن ہونے اور عالم کے مسخر کرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ از روئے تاریخ ہم یہ یقین کرنے کے لیے آزاد ہیں (اگرچہ ہمیں اس قسم کے دل آویز خیالات پر شک ہونا چاہئے) کہ سکندر کے وحدت آفریں جذبات نے اپنی قوت و شوکت کا کچھ حصہ ضرور اپنے استاد سے حاصل کیا ہوگا، جو تاریخ فکر میں سب سے بڑا ترکیبی مفکر ہے، اور یہ کہ سیاسی عالم میں شاگرد کی فتح اور عالم فلسفہ میں استاد کی فتح ایک شریف اور رزمی کارنامے کے مختلف پہلو تھے۔ اور دو شاندار مقدونیوں نے دو پریشان عالموں کو باوحدت بنایا۔

ایشیا کی فتح کے لیے روانہ ہوتے وقت سکندر نے اپنے پیچھے یونان کے شہروں میں ایسی حکومتیں چھوڑی تھیں جو اس کی حامی اور موئید تھیں، مگر آبادیاں شدت کے ساتھ اس کی مخالف تھیں۔ آزاد اور ایک زمانے میں حکمراں ایتھنز کی طویل روایت نے محکومی کو، اگرچہ وہ ایک شاندار فاتح عالم مطلق العنان بادشاہ ہی کی کیوں نہ ہو، ناقابل برداشت بنا دیا تھا، اور ڈیماستھینز کی تلخ خطابت مجلس کو ہمیشہ مقدونی جماعت کے خلاف جس کے ہاتھ میں اس وقت شہر کی زمام حکومت تھی بغاوت کے کنارے پر رکھتی تھی۔ اب جب ارسطو اپنے سفروں کے دوسرے زمانے کے بعد ۳۳۴ قم میں ایتھنز واپس ہوا، تو قدرتی طور پر اس کے تعلقات اس مقدونی جماعت سے ہوئے، اور اس نے سکندر کی متحد کر دینے والی حکومت کی نسبت اپنی پسندیدگی چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ فلسفے اور حکمت کے ان حیرت انگیز سلسلۂ تصانیف کا مطالعہ کرتے وقت جو ارسطو نے اپنی زندگی کے آخری بارہ سال میں مرتب کی تھیں، اور اس کو اپنے مدرسے کی تنظیم اور علم کی اس دولت کو جو اس سے پہلے کسی ایک شخص کے ذہن میں کبھی نہ سمائی تھی، مرتب کرتے ہوئے دیکھتے وقت ہمیں کبھی کبھی اس امر کو بھی یاد کرنا چاہیے کہ یہ سب خاموش اور محفوظ، مطمئن صداقت کی جستجو میں نہ ہوا تھا، ہر وقت اس کا اندیشہ لگا ہوا تھا کہ سیاسی فضا مکدر ہو جائے اور پر امن فلسفی کی زندگی پر طوفان ٹوٹ پڑے۔ صرف اس حالت کو ذہن میں رکھ کر ہم ارسطو کے سیاسی فلسفے اور اس کے افسوس ناک انجام کو سمجھ سکیں گے۔ ۶۲

۲۔ ارسطو کا کام

ایک شہنشاہ کے معلم کے لیے، ایسے مخالف شہر میں بھی جیسا کہ ایتھنز تھا،

شاگردوں کا مل جانا دشوار نہ تھا۔ اپنی عمر کے ترپنویں سال میں اس نے اپنا مدرسہ لیسیم قائم کیا، اور اس قدر طلبہ جمع ہو گئے کہ انتظام قائم کرنے کے لیے پیچیدہ قواعد وضوابط مرتب کرنے پڑے۔ طلبہ خود قواعد وضوابط کا فیصلہ کرتے تھے، اور ہر دس روز کے بعد اپنے میں سے ایک کو مدرسے کی نگرانی کے لیے انتخاب کرتے تھے۔ مگر ہم کو اسے ایسی جگہ نہ خیال کرنا چاہیے جہاں کا انتظام بہت ہی سخت ہو۔ اس کے برعکس اس کا جو نقشہ بیان ہوتا چلا آتا ہے، وہ یہ ہے کہ شاگرد استاد کے ساتھ ہی کھانا کھاتے تھے اور ورزشی میدان کی روش پر ادھر ادھر ٹہلتے وقت استاد سے تعلیم حاصل کرتے تھے جس سے کہ لیسیم کو اپنا نام ملتا ہے۔

نیا مدرسہ افلاطون کے مدرسے کی محض نقل نہ تھا۔ اکیڈیمی زیادہ تر ریاضیات اور فکری وسیاسی فلسفے کی تعلیم دیتی تھی۔ اس کے برخلاف لیسیم حیاتیات اور طبیعی علوم کی طرف مائل تھی۔ اگر ہم پلینی کے قول کو باور کر سکتے ہیں تو سکندر نے اپنے شکاریوں، شکارگاہ کے محافظوں، باغبانوں اور ماہی گیروں کو حکم دے رکھا تھا کہ سکندر جس قدر حیوانیاتی اور نباتیاتی مواد طلب کرے وہ مہیا کیا جائے۔ دوسرے قدیم مصنف بیان کرتے ہیں کہ ایک وقت میں ارسطو نے ایک ہزار آدمی یونان اور ایشیا میں پھیلا رکھے تھے، جو اس کے لیے ہر خطے کے حیوانات اور نباتات کے نمونے مہیا کرتے تھے۔ اس ساز وسامان کی بدولت وہ دنیا میں سب سے پہلا بڑا حیوانیاتی باغ قائم کرنے کے لائق ہوا۔ اس مجموعے کا جو اثر اس کی حکمت اور فلسفے پر ہوا ہوگا وہ ظاہر ہے کہ بے حد ہوگا۔

ان کاموں پر خرچ کرنے کے لیے ارسطو کے پاس روپیہ کہاں سے آیا۔

لہ۔ روش (Peripatos) کہلاتی تھی، اسی ارسطو کے مدرسے کا نام بعد کو (Peripatetic School) (مشائین) ہوگیا۔ ورزشی میدان اپالو لیسین کی زمینوں کا حصہ تھا جو بھیڑیے کے خلاف گلے کا محافظ سمجھا جاتا تھا۔

اس وقت تک خود اس کی آمدنی بہت کافی ہوگئی تھی۔ اور اس نے یونان کے ایک نہایت ہی ذی اثر اور مالدار خاندان میں سلسلۂ ازدواج قائم کرلیا تھا۔ ایتھنس بیان کرتا ہے (اور بلاشبہہ مبالغے کے بغیر نہیں) کہ ایک بار سکندر نے ارسطو کو آٹھ سو ٹیلینٹ حیاتیاتی ساز و سامان اور تحقیقات کے لیے عطا کئے تھے، (جو موجودہ زمانے کی قوت خرید کے اعتبار سے چالیس لاکھ ڈالر کے مساوی ہوتے ہیں، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ارسطو کے اشارے پر سکندر نے ایک گران قدر مہم دریائے نیل کے منبع اور اس کی موقتی طغیانی[1] کے اسباب دریافت کرنے کے لیے روانہ کی۔ اس قسم کے کام جیسا کہ ۱۵۸ سیاسی دستوروں کا خلاصہ ہے، جو ارسطو کے لیے کیا گیا تھا، یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ایک بہت بڑی جماعت مددگاروں کی کام کرتی تھی۔ مختصر یہ ہے کہ یہاں پر ہم کو تاریخ یورپ میں پہلی مثال علم و حکمت کی سرکاری روپیے سے خدمت کرنے کی ملتی ہے۔ اگر زمانۂ حال کی حکومتیں ایسی ہی فیاضی سے تحقیقات علمی کی سرپرستی کرنے لگیں تو کتنا علم حاصل نہ ہو جائے۔

۶۴ لیکن اگر ہم آلات کی اس محدودی کو نظر انداز کردیں جو ان عدیم المثال وسائل اور سہولتوں کے ساتھ تھی تو ارسطو کے ساتھ بے انصافی ہوگی۔ وہ بغیر گھڑی کے وقت معلوم کرنے بغیر مقیاس الحرارت کے حرارت کے درجوں کا مقابلہ کرنے بغیر دوربین کے آسمان کا مشاہدہ کرنے اور بارپیما کے بغیر موسم کا مطالعہ کرنے پر مجبور تھا...... ہمارے تمام ریاضیاتی بصریاتی طبیعیاتی آلات میں سے وہ صرف مسطر اور پرکار رکھتا تھا، اور بعض دوسرے آلات کے بجائے نہایت ہی ناقص قسم کے بدل تھے۔ کیمیاوی تحلیل صحیح پیمائشیں اور اوزان اور ریاضیات کا طبیعیات پر کامل اطلاق اس وقت تک نامعلوم تھا۔ مادّے کی قوت جاذبہ قانون تجاذب، برقی مظہر کیمیاوی ترکیب کے شرائط، ہوا کا

---

[1] ارکان مہم نے آکر یہ رپورٹ پیش کی کہ طغیانی حبشہ کے پہاڑوں پر برف کے پگھلنے کے سبب سے ہوتی ہے۔

دباؤ اور اس کے اثرات، روشنی حرارت احتراق وغیرہ مختصر یہ کہ وہ تمام واقعات جن پر کہ موجودہ حکمت کے طبیعیاتی نظریئے مبنی ہیں، اس زمانے میں کلیتہً یا تقریباً کلیتہً نا معلوم تھے۔

یہاں پر دیکھو کہ ایجادات تاریخ کو کس طرح بناتی ہیں۔ دوربین نہ ہونے کی وجہ سے ارسطو کی ہیئت بچوں کی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ خوردبین کی کمی کی بنا پر اس کی حیاتیات جگہ جگہ ٹھوکریں کھاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صنعتی اور فنی ایجادیں یونان اپنی عدیم المثال ترقیات کی سطح کی نسبت سے سب سے پست ہے۔ یونانیوں کو محنت ومزدوری کے کام سے جو نفرت تھی اس کی وجہ سے کاہل الوجود غلاموں کے علاوہ عمل پیداوار سے براہ راست واقفیت حاصل کرنے سے ہر شخص دور رہا، اور آلات سے وہ ہیجان انگیز مس حاصل نہ کر سکا جس سے نقائص ظاہر ہوتے ہیں، اور امکانات کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے۔ فنی ایجاد صرف ان لوگوں کے لیے ممکن تھی جن کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور جو اس سے کوئی مادی فائدہ حاصل نہ کر سکتے تھے۔ شاید غلاموں کی ارزانی ہی نے ایجاد کو پیچھے رکھا ہے۔ ابھی انسان کے گوشت پوست کی قوت مشینوں کی نسبت ارزاں تھی۔ اور اس طرح سے اگرچہ یونانی تجارت نے بحیرۂ روم کو اور یونانی فلسفے نے بحیرۂ روم کے قریب بسنے والی اقوام کے ذہن کو تسخیر کر لیا مگر یونانی حکمت پیچھے رہ گئی، اور یونانی صنعت تو تقریباً اسی سطح پر رہی جس سطح پر ایجیین صنعت ہزار برس پہلے یونانیوں کے حملے کے وقت تھی جب کہ انھوں نے کناسس ٹرینس میسنی پر تسلط قائم کیا تھا۔ بلا شبہہ یہی وجہ ہے کہ ارسطو
۶۵ اس قدر کم اختبار کی طرف رجوع ہوتا ہے۔ اختبار کے آلات ابھی بنے نہ تھے۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہ کر سکتا تھا کہ عام اور مسلسل مشاہدہ حاصل کرے۔ با ایں ہمہ معطیات کی وہ عظیم الشان مقدار جو اس نے اور اس کے مددگاروں نے جمع کی تھی حکمت کی ترقی کی بنیاد بنی اور دو ہزار برس تک علم کا نصاب اور انسان کے کام کے عجائبات میں سے رہی۔

ارسطو کی تصانیف سیکڑوں تک پہنچ گئیں۔ بعض قدیم مصنف اس کو

چار سو جلدوں اور بعض ہزار جلدوں کا مصنف بتاتے ہیں۔ جو کچھ باقی ہے وہ صرف ایک جزو ہے مگر یہ جزو بھی بجائے خود ایک کتب خانہ ہے۔ اولاً منطقی تصانیف ہیں "مقولات"، "مباحث"، "مقدم"، "موخر"، "تحلیلات"، "قضایا سوفسطائی تردیدات ان تصانیف کو بعد کے مشائین نے ارسطو کے ارگینن کے نام سے جمع کیا تھا، یعنے صحیح فکر کرنے کا آلہ۔ دوسرے حکمی تصانیف ہیں "طبیعیات" "فلکیات" "نمود انحطاط" "موسمیات"، طبیعی تاریخ" "روح" "اعضائے حیوانات"، اور "تخلیق حیوانات"۔ تیسرے جمالیاتی تصانیف ہیں۔ "خطابت" اور عروض۔ چوتھے وہ تصانیف ہیں جو زیادہ خصوصیت کے ساتھ فلسفیانہ ہیں، "اخلاقیات"، "سیاسیات"، "مابعد الطبیعیات"۔[۱]

ظاہر ہے کہ یہ یونان کی انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا ہے سورج کے نیچے اور اس کے متعلق جو مسئلہ بھی ہے وہ اس کے تحت آجاتا ہے۔ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اگر ارسطو کے یہاں ہر فلسفی سے زیادہ اغلاط و خرافات پائی جاتی ہیں۔ اس میں علم و نظر کی وہ ترکیب ملتی ہے جس تک اسپنسر کے زمانے تک کسی شخص کی دسترس نہ ہوگی۔ اور اس وقت بھی وہ اس کے مقابلے میں نصف شاندار طریق پر بھی نہ ہوگی۔ یہاں ہم وہ فتح پاتے ہیں جو سکندر کی عارضی اور وحشیانہ فتح سے بہتر دنیا کی فتح ہے۔ اگر فلسفۂ وحدت کی تلاش ہے تو ارسطو اس اعلیٰ نام کا مستحق ہے جو بیس صدیوں نے اس کو دیا ہے، الفیلسوف۔

قدرتی بات ہے کہ ایسے حکمی مزاج کے ذہن میں شعریت کی کمی تھی۔ ہمیں ارسطو سے اس قسم کی ادبیت کی توقع نہ کرنی چاہئے، جس کے تمثیلی فلسفی افلاطون نے صفحات پر دریا بہائے ہیں۔ ہم کو ایک بڑا ادب دینے کے بجائے جس میں کہ فلسفے کو افسانہ یا مخیلہ کے ذریعے سے پیش (یا دھندلا) کیا گیا ہو، ارسطو ہم کو اصطلاحی مجرد ٹھوس حکمت دیتا ہے۔ اگر ہم اس کے پاس تفریح

[۱] ۔ جہاں تک معلوم ہے یہ ترتیب تاریخ وار ہے (زیلر۔ ۱۔ ۱۵۶) ہم بہ استثنائے مابعد الطبیعیات اسی ترتیب کے مطابق بحث کریں گے۔

کے لیے جائیں تو ہمیں اس پر ہر جانے کی نالش کرنی پڑے گی۔ ادب کو اصطلاحیں دینے کے بجائے جیسا کہ فلاطون نے کیا تھا اس نے حکمت اور فلسفے کے لیے علیحدہ اصطلاحات بنالیں، اس زمانے میں ہم کسی علم وحکمت کا ان اصطلاحات کے استعمال کئے بغیر ذکر نہیں کرسکتے جو اس نے بنائی تھیں۔ وہ ہماری زبان کی تہ میں متحجرات کی طرح سے ہیں۔ استعداد، اوسط قاعدۂ کلیہ (جس کے معنی ارسطو کے یہاں قیاس کے کبریٰ کے ہیں) مقولہ توانائی، واقعیت، محرک، غایت، اصول، صورت، ـــــ یہ فلسفی فکر کے لازمی و ناگزیر سکے اُس کے ذہن میں ڈھلے تھے۔ اور شاید دلچسپ مکالمے سے ٹھیک حکمی بحث تک یہ تغیر فلسفی کی ترقی میں ایک ضروری قدم تھا۔ اور حکمت جو فلسفے کی بنیاد اور ریڑھ کی ہڈی ہے اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتی تھی جب تک کہ اس کے اپنے اسالیب بحث اور انداز بیان کا ارتقا نہ ہولے۔ ارسطو نے بھی ادبی مکالمات لکھے ہیں، جو اپنے زمانے میں ایسی شہرت رکھتے جیسے کہ فلاطون کے مکالمات رکھتے ہیں، مگر وہ اسی طرح سے ضائع ہوگئے ہیں جس طرح سے کہ فلاطون کی حکمی تصانیف ضائع ہوگئی ہیں۔ غالباً زمانے نے ہر مصنف کی تصانیف کا بہتر حصہ باقی رکھا ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ وہ تصانیف جو ارسطو سے منسوب ہیں اس کی نہ ہوں، بلکہ اس کے شاگردوں اور متبعین کی تالیفات ہوں جنھوں نے اس کی تقریروں کی یادداشتوں سے ان کو مرتب کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ارسطو نے اپنی زندگی میں منطق اور بیان کے علاوہ اور کوئی فنی تصنیف شائع نہیں کی۔ اور منطقی تصانیف کی بھی موجودہ شکل بعد کی ترتیب وتہذیب سے متعلق ہے۔ مابعد الطبیعیات اور سیاسیات کے متعلق تو اب معلوم ہوتا ہے کہ جو مواد ارسطو نے چھوڑا تھا اس کے کارکنوں نے بعد کو اسی کو جمع کرکے بغیر کسی نظر ثانی یا تغیر کے شائع کردیا تھا۔ ارسطو کی تحریرات میں انداز بیان اور طرز انشا کی جو یکسانی پائی جاتی ہے اور ان لوگوں کے لیے ایک دلیل ہے جو براہ راست اس کے مصنف ہونے کے مدعی ہیں، ممکن ہے مشائین کی مشترکہ ترتیب وتالیف کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہو۔ اس معاملے کے متعلق ایک قسم کی ہومری بحث پیدا ہوگئی جس میں لامتناہی بحث ومباحثے کی

گنجائش ہے۔ اس میں کثیر المشاغل ناظر کو پڑھنے کی پروانہ ہوگی، اور نہ ایک متعلم اس ٦٧
کے متعلق محاکمہ کرنا پسند کرے گا۔ اس امر کا ہم یقین کر سکتے ہیں کہ ارسطو ان تمام کتابوں کا روحانی مصنف ضرور ہے جو اس کے نام سے منسوب ہیں۔ ہاتھ ممکن ہے کسی دوسرے کا ہو مگر دل و دماغ اسی کا ہے۔

۳۔ منطق کی بنیاد

سب سے پہلا اور بڑا امتیاز ارسطو کو یہ حاصل ہے کہ بغیر کسی متقدم کے محض اپنی خیالی جفاکشی سے، اس نے ایک نیا علم یعنی منطق پیدا کیا۔ رینان کہتا ہے کہ اس ذہن کی تربیت یقیناً ناقص ہے، جس کو بلاواسطہ یا بالواسطہ یونانی تربیت حاصل نہیں ہوتی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ خود یونانی عقل اس وقت تک غیر تربیت یافتہ اور پریشان تھی، جب تک ارسطو کے سخت ضابطوں نے فکر کی جانچ اور صحت کے لیے ایک بنا بنایا طریقہ مہیا نہیں کیا۔ حتیٰ کہ فلاطون بھی (اگر کوئی شخص اس حد تک قیاس آرائی کر سکتا ہے) ایک خود سر اور بے قاعدہ روح رکھتا تھا، کیونکہ وہ ضرورت سے زیادہ خرافاتی افسانے کے بادل میں گرفتار ہو جاتا ہے، اور حسن کو ضرورت سے زیادہ اس کا موقع دے دیتا ہے کہ وہ اپنی دل آویزیوں میں صداقت کو چھپالے۔ خود ارسطو جیسا کہ ہم کو آیندہ معلوم ہوگا، اپنے ضوابط سے بکثرت انحراف کرتا تھا، مگر اس حالت میں وہ اپنے ماضی کا نتیجہ ہوتا تھا نہ کہ مستقبل کا جس کو اس کا فکر بنانے والا تھا۔ یونان کے سیاسی اور اقتصادی زوال نے ارسطو کے بعد یونانی ذہن اور سیرت میں کمزوری پیدا کر دی تھی۔ لیکن جب ایک ہزار برس کی وحشیانہ جہالت کے بعد ایک نسل کو غور و فکر کی فرصت اور قابلیت میسر ہوئی تو یہ ارسطو کی منطق کی کتاب آرگینن ہی تھی جس کا بوئیتھیس نے (۴۷۰–۵۲۵) ترجمہ کیا تھا، جو قرون وسطیٰ کے فکر کا سانچہ اور مدرسی فلسفے کی ماں بنی۔ اور یہ فلسفہ گو اعتقادات کے چکروں میں پھنسکر بےخبر ہو گیا تھا، مگر پھر بھی اس نے

۶۸ صغیر سن یورپ کی عقل کے معقولیت و لطافت میں تربیت کرنے کا کام انجام دیا، جدید حکمت کی اصطلاحات بنائیں، اور ذہانت کی اس پختگی کی بنیادیں رکھیں جو خود اس نظام اور ان طریقوں سے بڑھ جانے والی اور ان کو منہدم کرنے والی تھی، جس کی وجہ یہ عالم وجود میں آئی اور باقی رہی ہے۔

منطق کے معنے صرف صحیح فکر کرنے کے فن اور طریق کے ہیں۔ یہ ہر حکمت ہر باقاعدگی اور فن کا علم یا طریقہ ہے۔ یہ ایک حکمت ہے، کیونکہ بڑی حد تک صحیح فکر کے طریقوں کو طبیعیات یا ہندسے کے قواعد کی صورت میں تحویل کیا جا سکتا ہے، اور ان کی ہر متوسط ذہانت کے انسان کو تعلیم دی جا سکتی ہے۔ یہ ایک فن بھی ہے کیونکہ مشق سے آخر کار یہ فکر کو وہ غیر شعوری اور فوری صحت بخش دیتی ہے، جو ایک پیانو بجانے کی انگلیوں کی بلا کوشش کے نغموں کے پیدا کرنے میں رہبری کرتی ہے۔ منطق سے زیادہ غیر دلچسپ اور اس سے زیادہ ضروری کوئی چیز نہیں ہے۔

اس نئے علم کا اشارہ سقراط کے دیوانہ کن تعریفات کے اصرار میں، اور افلاطون کے مسلسل ہر تصور کے صاف کرنے کی کوشش میں ملتا ہے۔ ارسطو نے تعریفات پر جو چھوٹی سی کتاب لکھی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی منطق کو اس ذریعے سے کس طرح غذا ملی ہے۔ اگر بحث کرنے والے اپنی حدود کی تعریف کرنے کی جراءت کرتے تو کتنے مباحثے مختصر ہو کر چند سطروں کے نہ رہ جاتے۔ یہ منطق کی ابتدا اور انتہا اور اس کا قلب و روح ہے کہ سنجیدہ گفتگو میں ہر اہم اصطلاح کی نہایت ہی سختی کے ساتھ جانچ اور تعریف کی جائے۔ یہ دشوار ہے، اور ذہن کا نہایت ہی سخت امتحان لیتی ہے، مگر ایک بار جب یہ ہو جاتی ہے، تو یہ ہر کام کا نصف ہو تی ہے۔

ایک شے یا اصطلاح کی کس طرح سے تعریف کی جائے۔ ارسطو کہتا ہے کہ ہر اچھی تعریف کے دو حصے ہوتے ہیں، اور یہ دو ٹھوس قدموں پر قائم ہوتی ہے۔ پہلے تو یہ شے زیر بحث کو ایک قسم یا جماعت سے منسوب کرتی ہے جس کی عام خصوصیات اس کے اندر بھی موجود ہوتی ہیں۔ اس طرح سے انسان سب سے

پہلے حیوان ہے۔ دوسرے یہ اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہے جس کے اعتبار سے یہ شے اپنی قسم کی تمام چیزوں سے مختلف ہوتی ہے۔ اس طرح سے انسان ارسطا طالیسی نظام میں حیوان ناطق ہے، اس کا مخصوص فرق یہ ہے کہ وہ باقی تمام حیوانوں کے خلاف ناطق ہے۔ (یہاں پر ایک دلچسپ کہانی کی اصل نظر آتی ہے۔
ارسطو ایک شے کو اس کی قسم کے سمندر میں ڈالتا ہے، پھر اسے باہر نکالتا ہے، ایسی حالت میں کہ اس میں سے جنسی معنے کے قطرے ٹپکتے ہوئے ہوتے ہیں، اور اس کی قسم یا 69
جماعت کی علامات واضح ہوتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کی انفرادیت اور اس کا فرق دوسری چیزوں کی قربت کی وجہ سے جو اس سے اس قدر مشابہ اور اتنی مختلف ہوتی ہیں اور زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے۔

منطق کی اس عقبی قطار سے نکل کر ہم اس عظیم الشان میدان جنگ میں آجاتے ہیں، جس میں ارسطو فلاطون سے کلیات کے خوفناک مسئلے کے متعلق لڑا ہے۔ یہ اس جنگ کا پہلا معرکہ تھا جو ہمارے زمانے تک جاری ہے اور جس نے قرون وسطی کے تمام یورپ میں حقیقیہ اور اسمیہ کی ٹکر سے گونج پیدا کر دی تھی۔ ارسطو کے نزدیک ہر نکرہ اور ہر نام جس کا کلیتہً ایک جماعت کے افراد پر اطلاق ہو سکتا ہو کلی ہوتا ہے۔ اس طرح سے حیوان انسان کتاب درخت کلی ہیں۔ مگر یہ کلی ذہنی تصورات ہیں، قابل مس خارجی حقائق نہیں ہیں۔ یہ (nomina) اسما ہیں اور (res) اشیا نہیں ہیں۔ ہم سے خارج جو کچھ ہے، وہ انفرادی اور مخصوص اشیا کا عالم ہے۔ انسانوں، درختوں اور حیوانوں کا وجود ہے۔ مگر عام یا کلی انسان کا سوائے خیال کے اور کہیں وجود نہیں ہے۔ وہ ایک ہلکا پھلکا ذہنی انتزاع ہے کوئی خارجی وجود یا حقیقت نہیں ہے۔

اب ارسطو نے فلاطون کا یہ مطلب سمجھا تھا کہ کلی خارجی وجود رکھتے ہیں، اور درحقیقت فلاطون نے کہا تھا، کہ کلی فرد یا جزئی کے مقابلے میں بہت زیادہ پائدار اہم اور اصلی ہوتا ہے۔ فرد یا جزئی تو کلی کے مقابلے میں ایسا ہے جیسا کہ ایک بے پایاں سمندر کے مقابلے میں ایک چھوٹی سی موج۔ انفرادی طور پر تو انسان آتے ہیں اور جاتے ہیں کلی انسان ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ ارسطو کا ذہن حقیقت حال پر

نظر رکھتا ہے یا جیسا کہ ولیم جیمس نے کہا ہوتا کہ اس کا ذہن سخت ہے نازک نہیں۔ وہ اس فلاطونی حقیقت میں جو لا تمنا ہی تصوف اور عالمانہ خرافات ہے، اس کی جڑ کو دیکھ لیتا ہے، اور اس پر پہلے استدلالی کی تمام قوت و شدت سے حملہ کر دیتا ہے۔ جس طرح سے بروٹس سیزر سے کم محبت نہیں کرتا مگر روم سے زیادہ محبت کرتا تھا، اسی طرح سے ارسطو کہتا ہے۔ (Amicus Plato, sed magis amica veritas) کہ فلاطون عزیز ہے مگر صداقت عزیز تر ہے۔

ممکن ہے ایک مخالف نقاد (مثل نیٹشے کے) یہ کہے کہ ارسطو فلاطون پر اس شدت سے جو نکتہ چینی کرتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے فلاطون سے نہایت فراخ دلی کے ساتھ فائدہ اٹھایا ہے۔ کوئی شخص اپنے قرض داروں کے نزدیک بطل نہیں ہوتا۔ مگر اس کے باوجود ارسطو کا انداز بے لوث ہے۔ وہ ۷ تقریباً جدید زمانے کے معنے میں حقیقتی ہے۔ اس نے تہیہ کر رکھا ہے کہ وہ معروضی حال سے تعلق رکھے گا۔ حالانکہ فلاطون موضوعی مستقبل میں مصروف و منہمک ہے۔ تعریفات کے سقراطی فلاطونی مطالبہ میں، ایک رجحان اشیا اور واقعات سے دور اور نظریات و تصورات کی طرف تھا۔ جزئیات سے عمومیات کی طرف اور حکمت سے مدرسیت کی طرف۔ آخر کار فلاطون کو عمومیات سے اس قدر شغف ہو گیا کہ وہ اس کے جزئیات کو متعین کرنے لگے، اور تصورات میں اس درجہ انہماک ہو گیا کہ وہ اس کے واقعات کو متعین کرنے لگے۔ ارسطو اشیا کی طرف لوٹنے کی تلقین کرتا ہے یعنے فطرت اور حقیقت کے بغیر مرجھائے ہوئے چہرے کی طرف، وہ حقیقی جزئی اور گوشت پوست کے فرد کو ترجیح دیتا تھا۔ لیکن فلاطون عام اور کلی کو اس قدر عزیز رکھتا تھا کہ جمہوریتہ میں اس نے ایک کامل مملکت بنانے کے لیے فرد کو برباد ہی کر ڈالا۔

با ایں ہمہ تاریخ میں جیسا عام طور پر ہوتا ہے نوجوان سپاہی بوڑھے استاد سے جس پر کہ وہ حملہ آور ہوتا ہے بہت سے اوصاف لیتا ہے۔ ہم اپنے اندران باتوں کا ہمیشہ کافی ذخیرہ رکھتے ہیں، جن کی مذمت کرتے ہیں۔ جس طرح سے صرف مشابہ چیزوں کا مفید طور پر مقابلہ کیا جا سکتا ہے اسی طرح سے مشابہ لوگوں ہی میں جھگڑا ہوتا ہے اور تلخ ترین لڑائیاں مقصد یا

اعتقاد کے خفیف ترین اختلاف پر ہوتی ہیں۔ حروب صلیبیہ کے نائٹوں نے صلاح الدین کو ایسا شریف انسان پایا تھا جس کے ساتھ وہ امن کے ساتھ جھگڑ سکتے تھے مگر جب یورپ کے عیسائیوں میں اختلاف ہوا تو مہذب ترین دشمن کے لیے بھی پناہ نہیں تھی۔ ارسطو فلاطون کے ساتھ اسی لیے اس بے رحمی سے پیش آتا ہے کہ اس کے اندر فلاطونی عنصر بہت ہی زیادہ ہے۔ وہ بھی تجریدات اور عمومیات کا شائق رہتا ہے اور بار بار سادہ واقعے کو کسی ظاہرہ طور پر خوش نما نظریے پر قربان کر دیتا ہے۔ اور بلند ترین آسمان کی تفتیش کے فلسفیانہ جذبے کو مسلسل کشمکش سے دبانے پر مجبور ہوتا ہے۔

اس کے بہت ہی نمایاں آثار ارسطو کی سب سے مخصوص اور سب سے ممتاز تصنیف ضابطۂ قیاس میں پائے جاتے ہیں۔ ایک قیاس تین قضیوں پر مشتمل ہوتا ہے، جس میں سے تیسرا قضیہ یعنی نتیجہ دوسرے دو قضیوں (یعنی کبریٰ اور صغریٰ) کی مسلّمہ صداقت سے مستنبط ہوتا ہے۔ مثلاً انسان حیوان ناطق ہے۔ لیکن سقراط انسان ہے، لہذا سقراط حیوان ناطق ہے، ریاضیاتی کو فوراً معلوم ہوگا، کہ قیاس اس قضیے کے مشابہ ہے کہ دو چیزیں جب ایک ہی چیز کے مساوی ہوتی ہیں، تو وہ ایک دوسرے کے بھی مساوی ہوتی ہیں۔ اگر ا ب ہو اور ج ا ہو تو ج ب ہوگا۔ جس طرح سے ریاضیات میں نتیجہ دونوں مقدموں میں سے حد مشترک ا کے خارج کر دینے سے ہوتا ہے، اسی طرح سے ہمارے قیاس میں نتیجہ حد مشترک انسان کے خارج کر دینے اور جو کچھ باقی رہ جاتا ہے اس کے ترکیب دینے سے مرتب ہوتا ہے۔ اس میں دشواری یہ ہے جیسا کہ اہل منطق فائرو سے لے کر جان اسٹوارٹ مل تک کہتے چلے آئے ہیں، کہ قیاس میں کبریٰ ٹھیک اس چیز کو مسلم مانتا ہے جو ثابت کرنی ہوتی ہے کیونکہ اگر سقراط ناطق نہ ہو، (اور کسی شخص کو اس کے انسان ہونے سے انکار ہو) تو یہ بات کلیتہً صحیح نہیں رہتی کہ انسان ایک حیوان ناطق ہے۔ ارسطو اس کا یہ جواب دے گا، کہ بلاشبہ جہاں ایک فرد ایسا مل جاتا ہے، جس میں اس جماعت سے مختص اوصاف کی بڑی تعداد ہوتی ہے، اس امر کا

نہایت ہی قوی قرینہ دستیاب ہو جاتا ہے کہ فرد میں وہ دوسرے اوصاف بھی ہوں گے (نطق) جو اس جماعت سے مختص ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ قیاس اس قدر سچائی کے انکشاف کا آلہ نہیں ہے جتنا کہ بیان و فکر کے واضح بنانے کا آلہ ہے۔

یہ تمام چیزیں ارگنین کی دوسری صفات کی طرح سے اپنی قدر و قیمت رکھتی ہیں۔ ارسطو نے نظری صحت کے ہر قانون اور جدلیاتی مباحثے کی ہر چال کو ایسی محنت اور باریکی کے ساتھ دریافت کیا تھا کہ اس کی تعریف میں مبالغہ نہیں ہو سکتا، اور اس جہت میں اس بات کی مساعی نے بعد کے قرون کے عقلی ہیجان میں اس قدر حصہ لیا ہے کہ جو کسی دوسرے مصنف کو تنہا حاصل نہیں ہوئی[1] لیکن کبھی کوئی شخص ایسا نہیں گزرا جو منطق کو بلند سطح پر لا سکا ہو۔ صحیح استدلال کا رہبر اسی قدر بلند کن ہو سکتا ہے، جس قدر کہ آداب کا رسالہ۔ ہم اس کو استعمال کر سکتے ہیں مگر یہ مشکل سے ہمارے لیے بلند خیالات کے لیے مہمیز ہوتا ہے۔ بہادر سے بہادر فلسفی بھی ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر منطق کا گیت نہ گائے گا۔ منطق کی نسبت ہمیشہ انسان کو اسی قسم کا احساس ہوتا ہے جیسا کہ ورجل نے ڈانٹے سے ان لوگوں کو نسبت رکھنے کے لیے
۷۱ کہا تھا جو اپنی بے رنگ غیر جانب داری کی وجہ سے مردود ہو گئے تھے (Non ragionam di lor, ma guarda e passa) ہمیں ان لوگوں کے متعلق خیال نہیں کرنا چاہیے بلکہ ایک بار نظر ڈال کر گزر جانا چاہیے۔

۴۔ حکمت کی تنظیم

۱۔ یونانی حکمت ارسطو سے پہلے

رینان کہتا ہے کہ سقراط نے بنی نوع انسان کو فلسفہ دیا، اور ارسطو نے اس کو حکمت دی۔ سقراط سے پہلے فلسفہ تھا، اور ارسطو سے پہلے حکمت تھی، لیکن

[1] (Benn) - ۱ - ۳۰۷ -

سقراط کے بعد سے فلسفے نے اور ارسطو کے بعد سے حکمت نے زبردست ترقیاں
کی ہیں۔ مگر تمام عمارت اس بنیاد پر تعمیر ہوئی جو انھوں نے رکھی تھی۔ ارسطو سے
پہلے حکمت بھی شکم مادر میں تھی ارسطو سے وہ پیدا ہوئی۔
یونانی تمدن سے پہلے کے تمدنوں نے حکمت کی کوشش کی تھی، مگر جہاں تک
ہم ان کے فکر کو ان کے تاریک رسم الخطوں سے سمجھ سکے ہیں، ان کی حکمت ان کی
دینیات سے الگ نہ تھی۔ یعنے یہ یونانیوں سے پہلے کی اقوام فطرت کے ہر نامعلوم
عمل کی کسی فوق الفطرت عامل کے ذریعے سے توجیہ کرتے تھے۔ ہر جگہ دیوتا تھے۔
بظاہر سب سے پہلے یونانیوں ہی نے کائناتی پیچیدگیوں اور پر اسرار واقعات کی
طبیعی توجیہیں پیش کرنے کی جرأت کی۔ انھوں نے طبیعیات میں طبیعی اسباب
کی اور فلسفے میں بہ حیثیت مجموعی کل طبیعی نظریے کی تحقیق کرنے کی کوشش کی۔ طالیس
(۶۴۰ - ۵۵۰ ق م) ابو الفلسفہ دراصل عالم ہیئت تھا جس نے باشندگان ملطیہ کو
یہ بتا کر محو حیرت کر دیا، کہ سورج اور ستارے (جن کی وہ دیوتاؤں کی حیثیت
سے عبادت کیا کرتے تھے، محض آگ کی بڑی بڑی گیندیں ہیں۔ اس کا شاگرد
اینکسامنڈر (۶۱۰ - ۵۴۰ ق م) پہلا یونانی ہے جس نے ہیئت اور جغرافیے کے
نقشے تیار کیے۔ اس کا خیال تھا، کہ کائنات کا آغاز غیر ممیز تودے کی حیثیت
سے ہوا جس سے تمام چیزیں اضداد کے علیحدہ ہونے سے عالم وجود میں آئی ہیں،
اور ہیئت کی تاریخ اپنا بو قفات دنیاؤں کی غیر محدود تعداد کے ارتقا اور
افتراق کا اعادہ کرتی رہتی ہے، اور زمین اب مکان میں داخلی تسویقات کے
۴۳ توازن کی وجہ (بیورڈن کے گدھے کی طرح سے) ساکن ہے۔ ہمارے سب
سیارے کسی زمانے میں سیال تھے، مگر دھوپ میں خشک ہو گئے ہیں۔ سب سے
پہلی زندگی سمندر میں عالم وجود میں آئی ہے۔ مگر پانی کے کم ہو جانے کی وجہ سے خشکی پر
آگئی۔ ان کنارے پر آجانے والے جانوروں میں سے بعض میں سانس لینے کی
قابلیت پیدا ہو گئی اور اس طرح سے وہ بعد کی تمام خشکی کے جانداروں کے
مورث اعلیٰ بن گئے۔ انسان شروع سے ایسا نہیں ہو سکتا جیسا کہ وہ ہے، کیونکہ
اگر انسان اپنے پہلے ظہور پر پیدائش کے وقت ایسا ہی لاچار ہوتا، اور اس کو

پختگی تک پہنچنے کے لیے اسی قدر مدت درکار ہوتی جیسی کہ اب ہوتی ہے تو اس کا باقی رہنا ممکن نہ تھا۔ ملطہ کا ایک اور فلسفی اینکسا نیمز (۵۰۰ ق م) اشیا کی قدیم حالت کو بہت ہی لطیف قسم کا مادہ بیان کرتا ہے، جو رفتہ رفتہ ہوا، بادلوں پانی زمین اور پتھر میں تحلیل ہوگئی۔ مادے کی تین صورتیں یعنے بخاری رطبی اور یابس خشک ہونے کی تدریجی منزلیں تھیں۔ حرارت اور برودت محض لطیف بننے اور تحلیل ہونے کا عمل تھا۔ زلزلے زمین کے جو در اصل سیال تھی، ٹھوس بننے کی وجہ سے آتے۔ حیات اور روح یعنے ایک زندہ کرنے اور پھیلنے والی قوت تھی جو ہر جگہ موجود تھی۔ اینگسا غورس (۵۰۰ — ۴۲۸ ق م) پریکلیز کا معلم تھا۔ اس نے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسوف وخسوف کی صحیح توجیہ کی تھی۔ اس نے پودوں اور مچھلیوں کے سانس لینے کے عمل کو دریافت کیا۔ اور اس نے انسان کی عقل کی اس قوت مدبرہ سے توجیہ کی جو اس وقت عالم وجود میں آئی جب ہاتھوں کو حرکت میں کام کرنے سے آزادی مل گئی۔ آہستہ آہستہ ان لوگوں میں علم حکمت کی شکل اختیار کرتا گیا۔

ہرقلیطوس (۵۳۰ — ۴۷۰ ق م) جس نے دولت اور اس کی پریشانیوں کو فقر و مطالعے کی زندگی کے خاطر ترک کر دیا تھا، اس نے افیسس کے مندر کے دالانوں میں بیٹھ کر حکمت کا رخ ہیئت سے دنیاوی معاملات کی طرف پھیرا۔ وہ کہتا ہے کہ تمام چیزیں جاری رہتی اور متغیر ہوتی رہتی ہیں۔ ساکن ترین مادے میں بھی غیر مرئی تحول اور حرکت ہے۔ کائناتی تاریخ بار بار چکر کھانے والے دوروں میں جاری رہتی ہے ہر ابتدا آگ سے ہوتی ہے اور ہر انتہا آگ پر ہوتی ہے (یہاں پر رواقی اور عیسائی نظریۂ قیامت اور دوزخ کی اصل ملتی ہے) ہرقلیطوس کہتا ہے کہ تمام چیزیں کشمکش سے پیدا ہوتی ہیں اور کشمکش ہی سے فنا ہو جاتی ہیں ..... جنگ سب کی باپ اور بادشاہ ہے۔ بعض کو یہ دیوتا بناتی ہے، اور بعض کو انسان بعض کو غلام اور بعض کو آزاد۔ جہاں کشمکش نہیں ہوتی وہاں انحطاط ہوتا ہے جو مرکب ہلایا نہیں جاتا وہ سڑ جاتا ہے۔ اس تحول و تغیر اور کشمکش وانتخاب میں صرف ایک چیز مستقل رہتی ہے۔

اور وہ قانون ہے۔ یہ نظام جو سب چیزوں کے لیے یکساں ہے اس کو نہ تو کسی دیوتا نے بنایا ہے اور نہ انسان نے بلکہ یہ ہمیشہ سے اور رہے گا۔ امپیڈوکلیز (۴۴۵ ق م سسلی) نے تصور ارتقا کو اور ترقی دی۔ اعضا ارادے سے نہیں بلکہ انتخاب سے پیدا ہوتے ہیں۔ فطرت عضویوں کے ساتھ اعضا کو مختلف طور پر ترکیب دیکر بہت سی آزمائشیں اور اختبارات کرتی ہے۔ جہاں کہیں ترکیب ماحول کی ضروریات کے مطابق ہوتی ہے عضویہ باقی رہتا ہے اور اپنی جنس کو باقی رکھتا ہے جہاں کہیں ترکیب ناکام ہوتی ہے عضویہ فنا ہوجاتا ہے جیسے جیسے وقت گزرتا ہے عضویے زیادہ پیچیدگی اور زیادہ کامیابی کے ساتھ ماحول کے مطابق ہوتے جاتے ہیں۔ آخر میں لیوسی پس (۴۴۵ ق م) اور دیماقریطوس (۴۶۰ - ۳۶۰) استاد و شاگرد کے اندر ہم قبل ارسطاطالیسی حکمت کی آخری منزل پاتے ہیں — یعنی مادیتی جبریتی سالماتیت، لیوسی پس کہتا ہے کہ ہر شے مجبوری سے چل رہی ہے۔ دیماقریطوس کہتا ہے کہ درحقیقت صرف سالمات اور خلا ہی کا وجود ہے۔ ادراک اسی وجہ سے ہوتا ہے کہ سالمات شے سے نکل کر آلۂ حس پر آتے ہیں۔ دنیاؤں کی ایک غیر محدود تعداد ہے یا رہی ہے، یا ہو گی۔ ہر لمحے میں سیارے ٹکراتے اور فنا ہوتے رہتے ہیں، اور نئی دنیائیں یکساں جسامت اور شکل کے سالمات کے انتخابی اجتماع سے عالم وجود میں آتی رہتی ہیں۔ کوئی مقصد یا غایت نہیں ہے۔ عالم ایک مشین کی مانند ہے۔

ارسطو سے پہلے کی حکمت کا یہ ایک پریشان اور سطحی خلاصہ ہے جب ہم اختبار و مشاہدے کے ساز و سامان کے اس تنگ حلقے پر نظر کرتے ہیں جس کے اندر یہ باکمال کام کرنے پر مجبور تھے، تو اس کے بے ڈھنگے اجزا کو آسانی کے ساتھ معاف کیا جا سکتا ہے۔ ان شاندار مبادی کو کامل ترقی تک پہنچنے سے یونانی صنعت و حرفت کے جمود نے باز رکھا جو غلامی کی لعنت کا نتیجہ تھا۔ اور ایتھنز میں سیاسی زندگی کی سریع پیچیدگیوں نے سوفسطائیہ سقراط اور افلاطون کی توجہ کو طبیعی اور حیاتیاتی تحقیق سے اخلاقیاتی اور سیاسی نظریے کی طرف موڑ دیا۔
یہ بات ارسطو کے کارناموں میں سے ایک ہے کہ اس نے اس قدر وسعت خیال ۷۵

اور جراءت سے کام لیا کہ یونانی فکر کی ان دو راہوں یعنے طبیعیاتی اور اخلاقی کو ملادیا' اور اپنے استاد سے پیچھے ہٹ کر اس نے حکمی ترقی کے سلسلے کو سقراط سے پہلے کے یونانیوں سے لیا' اور ان کے کام کو تفصیل میں زیادہ استقلال اور زیادہ گوناگوں مشاہدے کے ساتھ کیا۔ اور تمام جمع شدہ نتائج کو منظم حکمت کے شاندار مجموعے میں مرتب کیا۔

(ب)۔ ارسطو ایک طبیعی کی حیثیت سے

اگر ہم یہاں تاریخ کا لحاظ کرنے سے پہلے اس کی طبیعیات سے شروع کریں تو ہم کو ناکامی ہو گی۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ کتاب درحقیقت مابعد الطبیعیات ہے جس میں مادے حرکت مکان زمان ابد علت اور دوسرے ایسے ہی انتہائی تعقلات سے بحث کرتی ہے۔ اس میں ایک نسبتہً دلچسپ ٹکڑا وہ ہے جس میں دیماقریطوس کے خلا پر بحث کی ہے۔ ارسطو کہتا ہے کہ فطرت کے اندر کوئی خلا نہیں ہو سکتا ہے' کیونکہ خلا میں تمام اجسام یکساں رفتار کے ساتھ گریں گے۔ چونکہ یہ ناممکن ہے اس لیے "مفروضہ خلا کے اندر کچھ بھی باقی نہیں رہ جاتا"۔ یہ ارسطو کی اتفاقی ظرافت اس کے غیر ثابت مسلمات کے شوق' اور فلسفے میں اپنے متقدمین کی مخالفت کے رجحان کی مثال ہے۔ ہمارے فلسفی کی یہ عادت تھی کہ وہ اپنی تصانیف سے پہلے موضوع زیر بحث کا پہلے جو کچھ کام ہو چکا تھا اس کا تاریخی خاکا دیتا تھا' اور پھر ہر کام کی نہایت ہی شدت کے ساتھ تردید کرتا تھا۔ بیکن کہتا ہے کہ سلاطین عثمانیہ کی طرح سے ارسطو کا بھی یہ خیال تھا کہ وہ اپنے تمام بھائیوں کو تہ تیغ کیے بغیر سلامتی کے ساتھ حکومت نہیں کر سکتا مگر ہمارا سقراط سے پہلے کے فلسفے کا علم بہت کچھ اس برادرکشی کے خبط ہی کا مرہون منت ہے۔

اوپر جو وجوہ بیان کر آئے ہیں ان کی بنا پر ارسطو کی ہئیت نے اپنے متقدمین پر بہت ہی کم اضافہ کیا ہے۔ وہ فیثاغورث کے اس خیال کی

تردید کرتا ہے کہ سورج ہمارے نظام کا مرکز ہے بلکہ وہ یہ اعزاز زمین کو عطا
کرنا چاہتا ہے۔ لیکن موسمیات پر اس کی کتاب شاندار مشاہدوں سے لبریز
ہے، اور اس کی قیاس آرائیاں بھی مشعل افروز ہیں۔ ہمارا فلسفی کہتا ہے کہ
یہ ایک دوری دنیا ہے۔ سورج ہمیشہ سمندروں کو تحلیل کرتا اور دریاؤں
اور چشموں کو خشک کرتا رہتا ہے۔ اور آخر کار بے پایاں سمندر کو برہنہ
چٹان کی شکل میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اب فضا میں جو رطوبت بلند ہوتی ہے، وہ ٦
بادلوں کی صورت میں جمع ہو کر دریاؤں اور سمندروں پر گرتی اور ان کو
تازہ کرتی ہے۔ ہر جگہ تغیر غیر محسوس مگر موثر طور پر جاری ہے۔ "مصر نیل کا
کارنامہ ہے" یعنے اس مٹی کا نتیجہ ہے جو ہزاروں صدیوں سے اس کے ساتھ
آتی ہے، کسی جگہ سمندر خشکی میں گھس آتا ہے کہیں خشکی ڈرتی ڈرتی سمندر میں
چلی جاتی ہے۔ نئے براعظم اور نئے سمندر پیدا ہوتے ہیں، پرانے سمندر اور
پرانے براعظم مٹ جاتے ہیں۔ اور تمام روئے زمین پیدائش دفنا کے
عظیم الشان انقباض و امتداد کی بدولت ادلتا بدلتا رہتا ہے۔ بعض
اوقات یہ وسیع اثرات اچانک رونما ہوتے ہیں، اور تمدن اور حتیٰ کہ حیات
تک ارضیاتی اور مادی بنیادوں کو برباد کر دیتے ہیں۔ بڑے بڑے حادثوں
نے بوقفات زمیں کو برہنہ کر دیا اور انسان کو اس ابتدائی حالت میں لا ڈالا
ہے۔ سسی فس کی طرح سے تمدن بھی بار بار اپنے عروج کو پہنچا ہے۔ مگر
صرف پھر وحشت کی طرف عود کرنے اور اپنی اوپر چڑھنے کی تکالیف از سرِ نو
برداشت کرنے کے لیے۔ اسی لیے تمدن کے بعد تمدن تقریباً ایک ہی قسم کی
ایجادات اور انکشافات ایک ہی طرح کے تاریک قرون معاشی اور تمدنی
ذخیرے کا آہستہ آہستہ جمع ہونے علم و حکمت اور فن کی جدید پیدائشوں
کا بار بار اعادہ نظر آتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض معروف عام افسانے
مبہم روایات ہیں جو ابتدائی تہذیبوں سے باقی رہ گئی ہیں۔ اس طرح سے
انسان کی کہانی ایک خوفناک دور میں جاری ہے، کیونکہ وہ اس زمین کا ہنوز
مالک نہیں ہے جو اس کو اٹھائے ہوئے ہے۔

(ج) حیاتیات کی بنیاد

ارسطو کو اپنے بڑے چڑیا گھر میں ٹہلتے وقت اس امر کا یقین ہو گیا کہ حیات کے لامتناہی تنوع کو ایک مسلسل سلسلے کے اندر ترتیب دیا جا سکتا ہے جس میں ہر کڑی اگلی کڑی سے غیر ممیز ہوگی تمام اعتبارات میں ساخت ہو، یا طریقۂ حیات ہو، یا توالد و تناسل اور بچوں کی پرورش ہو، یا حس اور احساس ہو، ادنیٰ ترین عضویوں سے اعلیٰ ترین عضویوں تک 'لطیف' مدارج ہیں۔ ادنیٰ حالت میں ہم مشکل سے زندہ اور مردہ میں امتیاز کر سکتے ہیں۔ فطرت بے جان اور جاندار عالم میں اس قدر تدریجی تغیر کرتی ہے کہ وہ سرحدیں جو ان کو علیحدہ
۷۷ کرتی ہیں مبہم اور مشکوک ہیں، اور شاید غیر عضوی میں بھی ایک حد تک حیات ہے پھر بہت سی انواع ایسی ہیں جن کو یقین کے ساتھ پودے یا حیوانات نہیں کہا جا سکتا۔ اور جیسا کہ ان ادنیٰ عضویوں میں بعض اوقات ٹھیک جنس اور نوع کو ان کی مشابہت کی وجہ سے متعین کرنا دشوار ہوتا ہے، اسی طرح سے ہر نظام زندگی میں، مدارج اور فرقوں کا تسلسل اتنا ہی حیرت انگیز ہوتا ہے، جتنا کہ اعمال و افعال اور شکلوں کا اختلاف۔ لیکن ساخت کی حیرتناک لطافت کے درمیان بعض چیزیں قطعی طور پر ممتاز ہیں اور یہ ظاہر کرتی ہیں کہ زندگی نے مستقل طور پر رفتہ رفتہ پیچیدگی اور قوت میں ترقی کی ہے، عقل نے ساخت کی پیچیدگی اور جسم کی حرکت پذیری کے ساتھ ترقی کی ہے، فعل کا تخصص بڑھتا رہا ہے اور عضویاتی ضبط مسلسل مرکزی بنتا چلا گیا ہے آہستہ آہستہ زندگی نے اپنے لیے ایک نظام عصبی اور ایک دماغ پیدا کر لیا) اور ذہن سے، مستقل طور پر اپنے ماحول پر قابو پانے کی طرف حرکت کی۔

یہاں پر حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ارسطو کی آنکھوں کے سامنے یہ تمام تدریجی فرق اور مشابہتیں آتی ہیں مگر وہ نظریۂ ارتقا تک نہیں پہنچتا۔ وہ

ایمپیڈوکلیز کے اس نظریے کو رد کر دیتا ہے کہ اعضا اور عضویے بقائے اصلح ہیں۔ اور اینکزاغورس کے اس تصور کو کہ انسان اپنے ہاتھوں کو حرکت کے بجائے کام کاج میں استعمال کر کے با عقل بنا ہے۔ اس کے برعکس ارسطو کا خیال ہے کہ انسان نے اپنے ہاتھوں کو اس وجہ سے استعمال کیا کہ وہ با عقل بن گیا تھا۔ درحقیقت ارسطو اتنی ہی غلطیاں کرتا ہے، جتنی کہ ایک ایسے شخص کے لیے ممکن ہے، جو حیاتیات کی بنیاد ڈال رہا ہو۔ مثلاً وہ خیال کرتا ہے کہ توالد و تناسل میں ہر عنصر محض تحریک اور تیزی پیدا کرتا ہے، اس کو یہ خیال نہیں آتا (جو کہ اب ہم اختبارات سے یقین کے ساتھ جانتے ہیں کہ نطفہ کا اساسی عمل اس قدر رحیمہ کو بار آور کرنا نہیں ہوتا جتنا کہ جنین کے لیے باپ کے موروثی اوصاف مہیا کرنا ہوتا ہے، اور اس طرح سے بچے کو ایک طاقتور متغیر اور ایک نیا مجموعہ دونوں والدین کے خاندانوں کا بنانا ہوتا ہے۔

چونکہ انسانی تقطیع اس کے زمانے میں نہیں ہوتی تھی اس لیے عضویاتی اغلاط ۷۸
اس کے یہاں خصوصیت کے ساتھ بہ کثرت ہیں۔ اس کو عضلات کا کوئی علم نہیں ہے، حتی کہ ان کے وجود کا بھی۔ وہ شریانوں اور وریدوں میں امتیاز نہیں کرتا وہ خیال کرتا ہے کہ دماغ خون کے ٹھنڈا کرنے کا آلہ ہے۔ وہ یقین رکھتا ہے اور اس یقین میں وہ معافی کے قابل ہے کہ مرد اپنے بھیجے میں عورت کی نسبت زیادہ سیونیں رکھتا ہے اس کو یقین ہے مگر اس یقین میں وہ کم قابل معافی ہے کہ مرد کے ہر پہلو میں صرف آٹھ پسلیاں ہوتی ہیں وہ یقین رکھتا ہے مگر اس کو باور کرنا اور معاف کرنا دشوار ہے کہ عورت مرد کی نسبت کم دانت رکھتی ہے بظاہر اس کے عورتوں سے تعلقات بہت ہی دوستانہ ہیں۔

باایں ہمہ وہ مجموعی طور پر حیاتیات میں اتنی ترقی کرتا ہے جتنی کہ نہ اس سے پہلے کسی یونانی نے کی تھی اور نہ بعد کو کی۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ پرندے اور رینگنے والے جانور اپنی ساخت کے اعتبار سے بہت ہی قریبی تعلق رکھتے ہیں بندر اپنی شکل کے اعتبار سے انسان اور چوپایوں کے بین بین ہے اور ایک بار وہ جرأت کے ساتھ کہتا ہے کہ انسان دودھ پلانے والے چوپایوں کے زمرے میں سے ایک ہے وہ کہتا ہے کہ انسانی روح، بچپن میں حیوانوں کی روح سے

بمشکل میسر ہو سکتی ہے۔ وہ روشنی ڈالنے والا نکتہ بیان کرتا ہے کہ غذا اکثر طرز زندگی کو متعین کرتی ہے کیونکہ حیوانوں میں سے بعض مل کر رہنے والے ہوتے ہیں اور بعض تنہا رہتے ہیں۔ وہ اس طرح سے زندگی بسر کرتے ہیں جس طرح سے ان کو اپنی پسند کی خوراک حاصل ہو سکتی ہے وہ فان بیر کے مشہور قانون کی جانب پیش دستی کرتا ہے کہ وہ خصوصیات جو جنس میں مشترک ہوتی ہیں (مثلاً آنکھ اور کان) وہ ترقی کرنے والے عضویے میں ان خصوصیات سے پہلے ظاہر ہوتی ہیں جو کہ نوع سے مخصوص ہیں مثلاً دانتوں کا) یا اس کی انفرادی ذات سے (مثلاً آنکھوں کا آخری رنگ) اور وہ دو ہزار سال کی مدت سے اسپینسر کی اس تعمیم کی جانب پیش دستی کرتا ہے کہ انفرادیت اور پیدائش میں نسبت معکوس ہے یعنے جتنی زیادہ ترقی یافتہ یا صاحب تخصص ایک نوع یا فرد ہوتا ہے، اتنی ہی اس کی اولاد کی تعداد کم ہو گی۔ وہ نمونے کے منقلب ہو جانے کی طرف توجہ کرتا اور اس کی توجیہ کرتا ہے — یعنے ممتاز تغیر (مثلاً طباعی) کے مجانست میں تحلیل ہو جانے اور چند پشتوں میں ضائع ہو جانے کے رجحان کی طرف۔ وہ بہت سے حیوانیاتی مشاہدات کرتا ہے جن کو بعد کے حیاتیاتیوں نے عارضی طور پر رد کر دیا تھا مگر جو جدید تحقیق سے صحیح ثابت ہوئے ہیں — مثلاً ان مچھلیوں کے متعلق جو گھونسلے بناتی ہیں اور ان شیر ماہیوں کے متعلق جو آنول رکھتی ہیں۔ اور آخر میں وہ علم جنینیات قائم کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ جو شخص چیزوں کو ان کی ابتدا سے بڑھتے ہوئے دیکھتا ہے اس کی ان پر سب سے عمدہ نظر ہو گی بقراط نے (۴۶۰ ق م) جو یونانی طبیبوں میں سب سے بڑا طبیب گزرا ہے اختباری طریقے کی ایک عمدہ مثال اس طرح سے دی ہے کہ مرغی کے انڈوں کو سینے کے مختلف مدارج میں توڑا اور ان مطالعوں کے نتائج کو اپنی کتاب بچے کی اصل پر استعمال کیا۔ ارسطو نے اس رہنمائی سے کام لیا اور ایسے اختبارات کئے جن کی وجہ سے وہ مرغی کے بچے کے نشو ونما کے متعلق ایسا بیان دے سکا جس پر آج تک علمائے جنینیات حیرت کرتے ہیں اس نے نسلیات میں بعض حیرت انگیز اختبار کئے ہوں گے کیونکہ وہ اس نظریے کو غلط ثابت کرتا ہے کہ ایک بچے کی

جنس اس امر پر مبنی ہوتی ہے کہ نسلی رطوبت کون سے بیضے سے مہیا ہوتی ہے اس سلسلے میں وہ ایک واقعہ نقل کرتا ہے جس میں باپ کے داہنے بیضے کو باندھ دیا گیا تھا اور اس کے باوجود بچے مختلف جنسوں کے ہوئے تھے۔ توارث کے متعلق وہ بعض بہت ہی جدید مسائل کو اٹھاتا ہے۔ ایلس کی رہنے والی ایک عورت نے ایک حبشی سے شادی کرلی تھی اس کے تمام بچے سفید ہوئے لیکن دوسری پشت میں حبشی پھر ظاہر ہوگئے ارسطو پوچھتا ہے کہ درمیانی پشت میں سیاہی کہاں چھپی ہوئی تھی۔ ایسے اہم اور عاقلانہ سوال ہیں اور گریگر مینڈل (۱۸۲۲-۱۸۸۲) کے عہد آفریں اختبارات میں صرف ایک ہی قدم باقی رہ گیا تھا یہ جاننا کہ کیا چیز دریافت کرنی ہے آدھا جان لینے کے برابر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ باوجود ان اغلاط کے جو ان حیاتیاتی تصانیف کی قیمت کو گھٹاتی ہیں یہ کتابیں بڑی سے بڑی یادگار ہیں جو کبھی کسی ایک شخص نے حکمت کے لیے
تیار کی ہے۔ جب ہم اس امر پر غور کرتے ہیں کہ ارسطو سے پہلے جہاں تک کہ ۸۰
ہم جانتے ہیں حیاتیات بجز چند منتشر مشاہدات کے نہ تھی تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ صرف یہ کام ہی ایک زندگی کے لیے کافی ہو جاتا اور اس نے حیات جاودانی بخش دی ہوتی لیکن ارسطو نے تو ابھی صرف ابتدا ہی کی تھی۔

۵۔ مابعد الطبیعیات اور خدا کی نوعیت

اس کی مابعد الطبیعیات اس کی حیاتیات سے پیدا ہوئی تھی۔ دنیا میں ہر چیز ایک داخلی تحریک سے متاثر ہوتی ہے کہ یہ اس سے بڑی بن جائے جتنی کہ یہ ہے۔ ہر چیز جو کسی دوسری چیز سے نکلی ہے جو کہ اس کا مادہ یا خام مواد تھی صورت یا حقیقت ہوتی ہے اور اپنی باری پر یہ اور بلند تر صورتوں کے لیے مادہ ہوسکتی ہے جو پیدا ہوں گی۔ اس طرح سے آدمی صورت ہے جس کا بچہ مادہ تھا بچہ صورت ہے اور جنین اس کا مادہ، جنین صورت ہے اور بیضہ مادہ

اور اسی طرح سے پیچھے ہٹتے چلے جائیں گے یہاں تک کہ ایک مبہم طریق پر ایسے مادے کے تعقل تک پہنچیں گے جس میں صورت بالکل نہ ہوگی۔ مگر ایسا بے صورت مادہ لاشے ہوگا۔ کیونکہ ہر شے ایک صورت رکھتی ہے۔ مادہ اپنی وسیع ترین مفہوم میں صورت کا امکان ہے صورت واقعیت ہے مادے کی مکمل حقیقت۔ مادہ مزاحمت کرتا ہے صورت تعمیر کرتی ہے۔ صورت محض شکل ہی نہیں ہے بلکہ شکل دینے والی قوت ہے ایک داخلی ضرورت اور تحریک جو کہ محض مادے کو ایک خاص شکل اور خاص مقصد کے مطابق ڈھالتی ہے۔ یہ مادے کی بالقوہ استعداد کا تحقق ہوتی ہے۔ یہ ان قوتوں کا مجموعہ ہوتی ہے جو کسی شے میں کچھ کرنے یا کچھ بن جانے کی ہوتی ہیں۔ فطرت مادہ کے اوپر صورت کی فتح ہے زندگی کی مستقل ترقی اور کامیابی۔

دنیا میں ہر شے فطرتاً ایک مخصوص تکمیل کے لیے حرکت کر رہی ہے۔ ان مختلف علتوں میں سے جو ایک واقعے کو متعین کرتی ہیں علت غائی جو کہ مقصد کو متعین کرتی ہے سب سے زیادہ فیصلہ کن اور اہم ہوتی ہے۔ فطرت کی غلطیاں اور ناکامیاں مادے کے اس جمود کی بدولت ہوتی ہیں جو قوت متشکلہ کے مقصد کی مزاحمت کرتا ہے۔ اسی وجہ سے اسقاط ہوتے ہیں اور اسی وجہ
۸۱ سے بدہیئت بچے پیدا ہوتے ہیں جو حیات کے منظر کو بدنما بناتے ہیں۔ ترقی اندھا دھند یا اتفاقاً نہیں ہو جاتی (ورنہ ہم مفید اعضا کے کلی ظہور اور انتقال کی کس طرح سے توجیہ کر سکتے تھے) ہر شے کی اپنے اندر سے اور اپنی فطرت کی ساخت اور مقصد پیدائش کی بنا پر ایک جہت میں رہبری ہوتی ہے۔ مرغی کا انڈا داخلی طور پر چوزہ بننے کے لیے بنایا مقدر ہوا ہے نہ کہ بطخ کا بچہ بننے کے لیے بلوط کا بیج بلوط بنتا ہے پیلو نہیں بنتا۔ ارسطو کے نزدیک اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ ایک خارجی قوت ہے جو چیزوں اور زمین کے اجسام اور واقعات کو ڈھالتی ہے۔ اس کے برعکس مقصد داخلی ہوتا ہے اور شے کی قسم اور اس کے عمل سے پیدا ہوتا ہے۔ ارسطو کے نزدیک قدرت الٰہی فطری علتوں کے عمل کے کلیتہً مطابق ہے۔

با ایں ہمہ خدا کا وجود ہے، اگرچہ ایسے سادہ اور انسانی خدا کا نہیں

جس کا نوجوان ذہن کی قابل عفو امنیت تعقل کرتی ہے۔ ارسطو اس مسئلے کی
حرکت کے پرانے معمے سے حل کرنے کی کوشش کرتا ہے —— وہ سوال کرتا
ہے کہ حرکت کس طرح سے شروع ہوتی ہے۔ وہ اس امکان کو تو تسلیم نہیں
کرتا کہ حرکت اسی طرح سے ازلی ہے جس طرح سے کہ وہ مادے کا تعقل کرتا
ہے۔ مادہ ابدی ہو سکتا ہے کیونکہ یہ آیندہ صورتوں کا دائمی امکان ہے۔
لیکن حرکت اور شناخت کا وہ وسیع عمل کب اور کس طرح سے شروع ہوا،
جس نے آخرکار کائنات کو گوناگوں اشکال سے بھر دیا؟ ارسطو کہتا ہے کہ
بلاشبہ حرکت کا ایک مبدء ہے، اور اگر ہم کو ایک بھیانک رجعت میں مبتلا
نہیں ہونا ہے، یعنے قدم بقدم اپنے مسئلے کو لامتناہی طور پر پیچھے نہیں ہٹانا
ہے تو ہمیں ایک ایسے حرکت دینے والے کو مسلم ماننا چاہئے جو غیر جسمی ناقابل
تقسیم لامکان بے جنس بے جذبہ غیر متغیر مکمل اور ابدی ہو۔ خدا دنیا کو پیدا
نہیں کرتا بلکہ وہ دنیا کو حرکت دیتا ہے۔ اور وہ اس کو میکانیکی قوت کی
طرح سے نہیں بلکہ عالم میں تمام اعمال و افعال کا مجموعی محرک ہونے کی حیثیت
سے حرکت دیتا ہے۔ خدا دنیا کو اس طرح سے حرکت دیتا ہے جس طرح سے
محبوب شے محب کو حرکت دیتی ہے۔ وہ فطرت کی علت غائی ہے۔ وہ اشیا
کا مقصد و مدعا اور عالم کی صورت ہے۔ وہ اس کی حیات کا اصول، اس کے
حیاتی اعمال اور اس کی قوتوں کا مجموعہ، اس کے نشو و نما کا مقصود اصلی اور
کل کے اندر توانائی پیدا کرنے والی غایت ہے۔ وہ خالص توانائی ہے ۸۲
اہل مدرسہ کا (Aclus Purus) یعنے فعلیت بالذات، اور شاید
جدید طبیعیات اور فلسفے کی تصوفی قوت۔ وہ اس قدر شخص نہیں ہے جس قدر
کہ ایک مقناطیسی قوت ہے۔

لیکن اپنے معمولی تناقض کے ساتھ وہ خدا کو شاعر ذات روح بھی کہتا
ہے۔ یہ ایک حد تک پر اسرار روح ہے، کیونکہ ارسطو کا خدا کبھی کوئی کام
نہیں کرتا۔ وہ نہ تو خواہش رکھتا ہے اور نہ ارادہ رکھتا ہے اور نہ مقصد۔
وہ ایسی خالص فعلیت ہے کہ وہ کبھی عمل نہیں کرتا۔ وہ قطعاً مکمل ہے، اسی لیے

وہ کسی شے کی خواہش نہیں کر سکتا اور اسی لیے وہ کچھ کرتا نہیں۔ اس کا شغلہ صرف یہ ہے کہ ماہیت اشیا پر غور کیا کرے اور چونکہ وہ خود ہی تمام چیزوں کی ماہیت ہے اور تمام صورتوں کی صورت ہے، اس لیے اس کا شغلہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنی ذات پر غور کیا کرے۔ غریب ارسطا طالیسی خدا! ـــ وہ ایک بے کام بادشاہ ہے۔ "بادشاہ کی سلطنت ہے مگر وہ حکومت نہیں کرتا" انگریز جو ارسطو کو پسند کرتے ہیں تو کوئی تعجب نہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا خدا ان کے بادشاہ کی نقل ہے۔

یا خود ارسطو کو لو۔ ہمارے فلسفی کو تفکر و تدبر اس قدر پسند ہے کہ اس نے اس پر اپنے الوہیت کے تعقل کو بھی قربان کر دیا۔ اس کا خدا ارسطا طالیسی نمونے کا ہے۔ اس کے اندر کوئی رومانی بات نہیں وہ اشیا کے ہنگامے سے ایک طرف اپنے ہاتھی دانت کے برج میں کنارہ کش ہے۔ اس سے فلاطون کے فلسفی بادشاہوں یا یہوہ (یہود کے خدا) کی ٹھوس گوشت پوست کی حقیقت یا عیسائیوں کے خدا کی بارحم اور پر شفقت ابویت بہت ہی بعد ہے۔

۶ ۔ نفسیات اور فن کی ماہیت

ارسطو کی نفسیات بھی ایسے ہی ابہام اور تذبذب میں مبتلا ہے۔ اس کے اندر بہت سے دلچسپ ٹکڑے ہیں۔ عادت کی قوت پر زور دیا گیا ہے، اور اس نے اس کو پہلی بار "طبیعت ثانیہ" کہا ہے۔ اور قوانین ائتلاف اگرچہ ترقی یافتہ شکل میں نہیں ہیں مگر ان کو یہاں پر قطعی شکل میں بیان کر دیا گیا ہے۔ لیکن فلسفیانہ نفسیات کے دونوں اہم مسئلوں یعنے اختیار اور بقائے روح کو مبہم اور مشکوک چھوڑ دیا گیا ہے۔ بعض اوقات ارسطو ایک جبری کی طرح سے گفتگو کرتا ہے ـــ "ہم براہ راست جو کچھ ہیں اس کے خلاف ہونے کا ارادہ نہیں کر سکتے" مگر آگے چل کر وہ جبریت کے خلاف استدلال کرتا ہے اور کہتا ہے کہ

ہم اس امر کو کہ ہم کیا ہوں گے پسند کر کے پسند کر سکتے ہیں کہ کس قسم کا ماحول ہم کو ڈھالے گا۔ پس ہم اس معنے کر کے با اختیار ہیں کہ ہم اپنی سیرتوں کو احباب کتابوں پیشوں اور تفریحات کے انتخاب سے ڈھالتے ہیں۔ وہ جبریہ سے اس بچے تلے جواب کی امید نہیں کرتا کہ ان بنانے والی پسندوں کا تعین بھی ہماری پہلے کی سیرت سے ہوتا ہے، اور اس کا آخر کار غیر پسند کردہ توارث اور ابتدائی ماحول ہوتا ہے۔ وہ اس امر پر بہت زور دیتا ہے کہ ہمارا تحسین و مذمت سے بار بار کام لینا اخلاقی ذمے داری اور اختیار کو مسلم مانتا ہے۔ اس کو یہ خیال نہیں آتا کہ جبری انھیں مقدمات سے اس کے بالکل برعکس نتیجے تک پہنچ سکتا ہے — یعنے تحسین اور مذمت اسی لیے کی جاتی ہے کہ یہ ان عوامل کا جزو بن جائے جو بعد کے عمل کو متعین کریں گے۔

ارسطو کا نظریۂ روح ایک دلچسپ تعریف سے شروع ہوتا ہے۔ روح کسی عضویہ کے پورے حیاتی اصول یا اس کی قوتوں اور اعمال کے پورے مجموعے کا نام ہے۔ پودوں میں روح محض ایک تغذیہ اور توالد و تناسل کی قوت ہے حیوانات میں یہ حسی اور حرکی قوت بھی ہے۔ انسان کے اندر یہ استدلال اور فکر کی بھی قوت ہے۔ روح جسم کی قوتوں کا مجموعہ ہونے کے اعتبار سے اس کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ دونوں کی مثال صورت اور موم کی سی ہے کہ یہ صرف خیال میں علحدہ ہو سکتے ہیں، مگر درحقیقت یہ ایک ہی چیز ہیں، روح جسم میں اس طرح سے داخل نہیں کی گئی ہے جس طرح سے ڈیڈیلس نے زہرہ کے مجسموں میں پارہ ان کو کھڑا کرنے کے لیے داخل کیا تھا۔ ایک شخصی اور انفرادی روح صرف اپنے جسم کے اندر ہو سکتی ہے۔ لیکن روح مادی نہیں ہے جیسا کہ دیماقریطوس کہتا ہے۔ اور یہ کلیۃً فنا ہوتی ہے۔ انسانی روح کی قوت ناطقہ کا ایک حصہ انفعالی ہے۔ یہ یاد کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے، اور اس جسم کے ساتھ مرجاتا ہے جس کو یاد تھا۔ لیکن فعلی عقل یعنے خالص قوت فکر حافظہ سے علحدہ ہوتی ہے، اور اس کو فنا نہیں چھو سکتی۔ عقل فعلی انسان میں انفرادی عنصر کے مقابلے میں کلی عنصر ہے جو کچھ باقی رہتا ہے وہ اپنی عارضی محبتوں اور

خواہشوں کے ساتھ شخصیت نہیں ہوتی بلکہ اپنی مجرد ترین اور غیر شخصی صورت میں ذہن ہوتا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ ارسطو روح کو لافنا بنانے کے لیے تباہ کر دیتا ہے غیر فانی روح خالص فکر ہے حقیقت سے غیر آلودہ ٹھیک جس طرح سے ارسطو کا خدا خالص فعلیت ہے، عمل سے غیر آلودہ۔ اب جو شخص چاہے اس دینیات سے مطمئن ہو سکتا ہے۔ بعض اوقات اس امر کا گمان ہوتا ہے کہ کہیں یہ مابعد الطبیعیاتی روٹی کا کھانا اور اس کا باقی رکھنا ارسطو کا اپنے آپ کو مخالف مقدونی حنظل سے بچانے کا لطیف طریقہ ہے۔

نفسیات کے نسبتاً محفوظ میدان میں وہ زیادہ اپج سے کام لیتا ہے اور ادھر ادھر نہیں بھٹکتا۔ اور تقریباً جمالیات یعنے نظریۂ حسن و فن کو پیدا کر دیتا ہے، ارسطو کہتا ہے ہنرورانہ اور حسین صفت صورتی تحریک اور جذبی اظہار کی آرزو سے پیدا ہوتی ہے۔ در اصل فن یا صناعت کی صورت حقیقت کی ایک نقل ہے، یہ فطرت کو آئینہ دکھاتی ہے۔ انسان کو نقل سے ایک ایسی لذت نصیب ہوتی ہے جو بظاہر ادنیٰ حیوانات میں مفقود ہے۔ با ایں ہمہ فن کا مقصد اشیا کا خارجی منظر پیش کرنا نہیں بلکہ ان کے اپنے داخلی مفہوم کو نہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے اسی لیے یہ ان کی حقیقت ہے نہ کہ خارجی باضابطگی اور تفصیل۔ اودیپس رکس کے ٹھوس ادبی اعتدال میں ٹرائے کی عورتوں کے حقیقت نما آنسوؤں کی نسبت زیادہ حقیقت انسانی ہو سکتی ہے۔

شریف ترین فن عقل و احساسات دونوں کو متوجہ کرتا ہے (جس طرح سے ایک نغمہ ہم کو اپنی ہمنوائیوں اور تسلسلوں ہی سے متاثر نہیں کرتا بلکہ اپنی ساخت اور تکمیل ہی سے متاثر کرتا ہے) اور یہ عقلی لذت مسرت کی بلند ترین صورت ہے جس تک کہ ایک انسان پہنچ سکتا ہے۔ لہذا فن کے عمل کو صورت کو مقصود بنانا چاہیئے اور سب سے زیادہ وحدت کو جو کہ ساخت اور صورت کی مرکز ہے۔ مثلاً ایک تمثیل میں وحدت عمل ہونی چاہیئے یعنے پریشان کن ذیلی حصے یا اصل سے دور کہانیاں نہ ہونی چاہئیں۔ مگر سب سے زیادہ فن اور صناعت کا مقصد پاکیزگی و تطہیر ہے یعنی جو جذبات ہم میں معاشری رکاوٹوں کے تحت جمع ہو جاتے ۸۵

ہیں اور غیر معاشری اور تخریبی عمل کی صورت میں ظاہر ہونے پر مائل ہوتے ہیں
ان کو ذرا چھیڑ کر تمثیلی ہیجان کی بے ضرر صورت میں بہا دیا جاتا ہے۔ اس طرح
سے حزنیہ رحم اور ڈر کے ذریعے سے ان جذبات کو مناسب طور پر پاک کرتا
ہے۔ ارسطو حزنیہ کی بعض خصوصیات کو نظر انداز کر دیتا ہے (مثلاً اصولوں اور
شخصیتوں کا تصادم لیکن اس نظریۂ تطہیر میں اس نے ایک ایسا اشارہ
کیا ہے جو فن کی تقریباً تصوفی قوت کے سمجھنے میں بے حد زرخیز ہے۔ یہ اس کی
قابلیت کی ایک روشن دلیل ہے کہ وہ نظریہ سازی کے ہر میدان میں
داخل ہوتا ہے اور جس کسی چیز کو چھوتا ہے اس کو آراستہ کر دیتا ہے۔

ف۔ اخلاقیات اور مسرت کی ماہیت

باایں ہمہ جوں جوں ارسطو نے ترقی کی اور اس کے گرد نوجوانوں کا تعلیم
اور اصلاح کے لیے مجمع ہوا اس کا ذہن حکمت کی تفصیلات سے کردار اور سیرت
کے عظیم تر اور مبہم تر مسائل کی طرف متوجہ ہوتا گیا۔ اس پر یہ بات زیادہ وضاحت
کے ساتھ منکشف ہوتی گئی کہ طبیعی عالم کے تمام مسائل سے بڑھ کر یہ مسئلوں کا
مسئلہ کہ بہترین زندگی کونسی ہے زندگی کی برترین خیر کیا ہے فضیلت کس کو
کہتے ہیں۔ مسرت اور تکمیل کو ہم کس طرح سے پائیں۔

وہ اپنی اخلاقیات میں بہت سادگی سے کام لیتا ہے۔ اس کی حکمی تربیت
اس کو فوق الانسان نصب العین اور تکمیل کے بے سود مشوروں کے پیش کرنے
سے باز رکھتی ہے۔ سنٹیانہ کہتا ہے ارسطو میں انسانی فطرت کا تعقل
بالکل درست ہے ہر نصب العین ایک فطری بنیاد رکھتا ہے اور ہر فطری
شے ایک معیاری ترقی رکھتی ہے۔ ارسطو صفائی کے ساتھ اس امر کو تسلیم
کر کے آغاز بحث کرتا ہے کہ زندگی کا مقصد بھلائی، محض بھلائی ہی کی خاطر
نہیں بلکہ مسرت کی خاطر ہے۔ کیونکہ مسرت کو ہم خود مسرت کی خاطر پسند کرتے ہیں۔

اور کبھی کسی آیندہ چیز کی خاطر نہیں کرتے۔ اس کے برخلاف ہم عزت لذت عقل کو اس لیے پسند کرتے ہیں کیونکہ ہم کو یقین ہوتا ہے کہ ان کے ذریعے سے ہم کو مسرت نصیب ہوگی۔ مگر وہ اس امر کو محسوس کرتا ہے کہ مسرت کو برترین خیر کہنا محض صداقت ہے، جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ مسرت کی ماہیت اور اس کے حاصل کرنے کے طریقے کو واضح طور پر بیان کیا جائے۔ وہ اس طریقے کے معلوم کر لینے کی اس طرح سے امید کرتا ہے کہ وہ پوچھتا ہے کہ کس بارے میں انسان دوسری مخلوق سے مختلف ہے اور یہ فرض کرتا ہے کہ انسان کی مسرت ۸۶
اس مخصوص طور پر انسانی وصف کے پوری طرح سے عمل کرنے میں مشتمل ہوگی۔ اب انسان کی ما بہ الامتیاز فضیلت اس کی قوت فکر ہے اسی قوت کے ذریعے سے وہ حیات کی باقی تمام صورتوں پر فوقیت رکھتا ہے اور ان پر حکومت کرتا ہے اور جس طرح سے استعداد نے اس کو برتری دی ہے اسی طرح سے ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ اس کی ترقی اس کو تکمیل و مسرت بخشے گی۔

پس مسرت کی سب سے بڑی شرط چند جسمانی ضروریات مقدم کے سوا عقل کی زندگی ہے عقل ہی انسان کی مخصوص شوکت اور قوت ہے۔ فضیلت بلکہ فوقیت کا مدار واضح رائے ضبط نفس خواہش کی باقاعدگی اوسطوں کی خوشنمائی پر ہے۔ یہ سادہ آدمی کی ملکیت نہیں ہے اور نہ معصوم ارادے کا عطیہ ہے بلکہ پوری طرح سے تکمیل کو پہنچے ہوئے انسان میں تجربے کا نتیجہ ہے۔ با ایں ہمہ ایک راستہ اس کی طرف جاتا ہے، اور فضیلت کا ایک رہبر ہے، جو بہت سے چکروں اور بہت سی تاخیروں سے بچا سکتا ہے۔ یہ درمیانی راستہ یا زرین اوسط ہے۔ سیرت کے اوصاف کو تین قسموں میں ترتیب دیا جا سکتا ہے، جن میں سے پہلے اور آخری اوصاف افراط ہوں گے اور عیوب اور درمیانی وصف ایک فضیلت یا فوقیت ہوگا۔ اس طرح سے بزدلی اور تہور کے درمیان شجاعت ہے بخل اور اسراف کے مابین فیاضی ہے کاہلی اور حرص کے مابین شوق ہے عاجزی اور غرور کے مابین انکساری ہے۔ رازداری اور بھڑبھڑیے پن کے مابین راست بازی ہے۔ تنگ مزاجی اور مسخرے پن کے مابین خوش مزاجی ہے۔

جھگڑالوپن اور خوشامد کے مابین دوستی ہے۔ ہملیٹ کے تذبذب اور کوئکزٹ کے جوش کے مابین ضبط نفس ہے پس اخلاقیات یا کردار میں صواب ریاضیات یا انجنیری کے صحیح سے کچھ مختلف نہیں ہے اس کے معنے ٹھیک اور موزوں کے ہیں یعنے اس شے کے جو نتیجے کے لیے بہترین ہوتی ہے۔

لیکن زریں اوسط ریاضیاتی اوسط کے مانند دو قابل حساب انتہاؤں ۸۷
کے مابین بالکل ٹھیک اوسط نہیں ہے۔ صورت حال کے متعلقہ حالات سے اس میں تغیر ہوتا ہے اور اس کا پتا صرف پختہ اور دقیقہ رس عقل کو چل سکتا ہے۔ فضیلت ایک فن ہے جو تربیت اور عادت سے حاصل ہوتا ہے۔ ہم صحیح طور پر اس لیے عمل نہیں کرتے کہ ہم بافضیلت ہوتے ہیں، بلکہ ہم کو فضیلت صحیح طور پر عمل کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ فضائل انسان میں اعمال کے کرنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ ہم وہ کچھ ہوتے ہیں جو کہ بار بار کرتے ہیں۔ پس فضیلت ایک فعل نہیں بلکہ ایک عادت ہے۔ انسانی خیر پوری زندگی میں فضیلت کی طرف روح کے عمل کرنے سے حاصل ہوتی ہے ـــ کیونکہ جس طرح سے ایک ابابیل کے آنے یا ایک خوشگوار دن سے بہار کا موسم نہیں بن جاتا اسی طرح سے ایک دن یا مختصر زمانہ انسان کو سعید اور صاحب مسرت نہیں بنا دیتا۔

جوانی انتہا پسندیوں کی عمر ہوتی ہے۔ اگر نوجوان کسی قصور کا مرتکب ہوتا ہے تو یہ ہمیشہ افراط یا مبالغے کی جانب ہوتا ہے۔ جوانی میں بڑی دشواری یہی ہوتی ہے (اور نوجوانوں کے بڑھوں کو بھی اکثر یہ دشواری ہوتی ہے) کہ انسان ایک افراط سے نکل کر دوسری افراط میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ایک افراط آسانی سے دوسری افراط میں منتقل ہو جاتی ہے خواہ ضرورت سے زیادہ اصلاح کرنے کی وجہ سے یا اور کسی وجہ سے۔ عدم خلوص ضرورت سے زیادہ احتجاج کرتا ہے۔ اور عاجزی غرور کے سر پر منڈلاتی رہتی ہے۔ جو لوگ محسوس طور پر ایک انتہا پر ہوتے ہیں وہ اوسط کو نہیں بلکہ دوسری انتہا کو فضیلت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ بعض اوقات یہ اچھا بھی ہوتا ہے کیونکہ اگر ہم کو ایک انتہا پر غلطی کے مرتکب ہونے کا شعور ہو تو ہمیں دوسری انتہا کو

مقصود بنانا چاہیے، تاکہ اوسط تک پہنچ جائیں۔ جس طرح سے کہ آدمی مڑی ہوئی لکڑی کے متعلق کرتے ہیں۔ لیکن بے سمجھ انتہا پسند زریں اوسط کو سب سے بڑا عیب جانتے ہیں۔ وہ اس شخص کو جو اعتدالی حالت میں ہوتا ہے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ بزدل آدمی بہادر کو جوشیلا اور غیر محتاط کہتے ہیں، اور جوشیلا آدمی اس کو بزدل کہتا ہے، اور دوسری صورتوں میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح سے جدید سیاسیات میں انتہا پسند، اعتدال پسندوں کو رجعتی کہتے ہیں اور رجعتی انتہا پسند۔

۸۸ یہ ظاہر ہے کہ یہ نظریہ اوسط ایک مخصوص روش کا اظہار ہے، جو یونانی فلسفے کے تقریباً ہر نظام میں ظاہر ہوتا ہے۔ فلاطوں نے جب فضیلت کو متوازن عمل کہا تھا تو اس کے ذہن میں بھی یہی بات تھی۔ اور سقراط نے فضیلت کو جب علم کے مطابق کہا تھا تو اس کے پیش نظر بھی یہی بات تھی۔ حکمائے سبعہ نے اس روایت کو ڈلفی میں اپالو کے مندر میں یہ نصیحت کندہ کرا کے پختہ کر دیا تھا، کہ کسی شے میں افراط نہ ہونی چاہیے۔ شاید جیسا کہ نٹشے مدعی ہے، کہ یونانیوں کی یہ تمام کوششیں خود اپنی سیرت کی شدت اور جوش کے روکنے کے لیے تھیں۔ زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ کوششیں اہل یونان کے اس احساس کا عکس ہیں، جذبات بجائے خود عیوب نہیں ہیں، بلکہ عیب و فضیلت دونوں کا اس اعتبار سے مواد ہو سکتے ہیں کہ یہ افراط و عدم تناسب کے ساتھ عمل کرتے ہیں، یا توازن اور ہمنوائی کے ساتھ۔

لیکن ہمارا عملی فلسفی کہتا ہے کہ راز مسرت محض اوسط زریں ہی میں نہیں ہے۔ دنیاوی چیزوں کی بھی ہمارے پاس خاصی مقدار ہونی چاہیے۔ افلاس انسان کو بخیل اور کنجوس بنا دیتا ہے۔ اس کے برخلاف اموال و دنیا سے انسان کو پریشانی سے وہ آزادی نصیب ہوتی ہے، جو اشرافی آرام اور دلکشی کا ذریعہ ہے۔ مسرت کے ان خارجی معاونین میں سب سے زیادہ شریف دوست ہے۔ درحقیقت دوستی صاحب مسرت کے محزون کی نسبت زیادہ ضروری ہے۔ کیونکہ مسرت شرکت سے بڑھتی ہے، یہ عدالت سے زیادہ اہم ہے، کیونکہ جب آدمی آپس میں

دوست ہوتے ہیں تو عدالت غیر ضروری ہوتی ہے۔ لیکن جب لوگ عادل ہوتے
ہیں، تو اس وقت تو دوستی اور بھی زیادہ نعمت معلوم ہوتی ہے۔ ایک دوست
دو قالبوں کے اندر ایک روح ہوتا ہے۔ لیکن دوستی سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ دوست
زیادہ نہیں بلکہ کم ہونے چاہئیں، جو شخص بہت سے دوست رکھتا ہے وہ کوئی
دوست نہیں رکھتا، اور بہت سے آدمیوں سے پختہ دوستی رکھنا ناممکن ہے۔ عمدہ
دوستی کے لیے وقتی شدت کے بجائے مدت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اس سیرت
کا استقلال مترشح ہوتا ہے۔ دوستی میں ردوبدل سیرت کے تغیر کی دلیل ہے۔
دوستی کے لیے مساوات کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ احسان مندی زیادہ سے زیادہ
اس کو ایک عارضی بنیاد دیتی ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ محسن ان لوگوں سے
جن پر کہ یہ احسان کرتے ہیں اس سے زیادہ دوستی رکھتے ہیں، جتنی کہ یہ ان کے
ساتھ رکھتے ہیں۔ اس صورت حال کی وہ تشریح جس سے اکثر لوگوں کی تشفی ہوتی ۸۹
ہے، یہ ہے کہ ان میں ایک تو مقروض ہوتے ہیں اور دوسرے قرض خواہ......
اور مقروض تو یہ چاہتے ہیں کہ ان کے قرض خواہ نہ رہیں برخلاف اس کے
قرض خواہ یہ چاہتے ہیں کہ قرض دار باقی رہیں۔ ارسطو اس تعبیر کو رد کرتا ہے
اور اس یقین کو ترجیح دیتا ہے کہ محسن کو ان لوگوں سے جن پر کہ وہ احسان
کرتا ہے اسی طرح سے زیادہ محبت ہوتی ہے جس طرح سے کہ ایک مصور کو اپنی تصویر
سے یا ایک ماں کو اپنے بچے سے۔ ہم اس چیز سے محبت کرتے ہیں جو ہماری
بنائی ہوئی ہے۔

اگرچہ خارجی اشیا اور تعلقات مسرت کے لیے ضروری ہیں مگر پھر بھی اس کا اصلی جوہر ہمارے اندر علم کی وسعت اور روح کی صفائی کی صورت میں رہتا ہے۔ لذت کی حس یقیناً اس کا راستہ نہیں ہے وہ سڑک تو دائرہ ہے جیسا کہ سقراط نے کثیف ترا بیقوری تصور کے متعلق کہا تھا۔ کہ ہم نوچتے ہیں تاکہ ہم کھجا سکیں اور کھجاتے ہیں تاکہ ہم نوچ سکیں اور نہ سیاسی زندگی اس کا راستہ ہوتی ہے کیونکہ اس میں ہم کو عوام کے اوہام کے مطابق چلنا پڑتا ہے اور انبوہ سے زیادہ متلون کوئی چیز نہیں ہوتی نہیں! مسرت کو تو ذہن کی

لذت ہونا چاہیئے اور ہم اس پر صرف اس وقت بھروسا کر سکتے ہیں جب یہ صداقت کی طلب یا اس
کے حصول سے ہوتی ہے۔ عقلی عمل اپنے علاوہ اور کسی شے کو مقصود نہیں بناتا اور اس کو اپنے
میں وہ لذت ملتی ہے جو اس کو مزید عمل کے لیئے آمادہ کرتی ہے۔ اور چونکہ کافی بالذات
عدم تکان اور استعداد سکون صریحی طور پر اس شغلے سے متعلق ہیں لہذا کامل مسرت اس میں ہونی چاہیئے۔
لیکن ارسطو کا معیاری انسان محض مابعدالطبیعیاتی نہیں ہے۔
وہ اپنے آپ کو بلا ضرورت خطرے میں مبتلا نہیں کرتا کیونکہ بہت کم چیزیں
ایسی ہیں جن کی وہ بہت پروا کرتا ہو۔ لیکن نازک وقتوں میں وہ اپنی جان تک
دینے کے لیے تیار رہتا ہے ــــ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ بعض حالات میں زندہ
رہنا بےکار ہوتا ہے۔ اس کا مزاج ایسا ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کے کام آتا ہے
اگرچہ اسے اپنے کام لیتے ہوئے شرم آتی ہے۔ مہربانی کرنا فوقیت کی دلیل
ہے اور دوسرے کی مہربانی سے فائدہ اٹھانا ماتحتی کی علامت ہے۔...... ٩٠
وہ عام تماشوں میں حصہ نہیں لیتا...... وہ اپنی ناپسندیدگیوں اور
ترجیحوں میں صاف گو ہوتا ہے۔ وہ صفائی کے ساتھ باتیں کرتا ہے اور صفائی
کے ساتھ عمل کرتا ہے کیونکہ وہ عام انسانوں اور چیزوں کو وقعت کی نگاہ
سے نہیں دیکھتا..... اس کو کبھی تعریف وتحسین کا جوش نہیں آتا کیونکہ اس کی
آنکھوں میں کوئی چیز بڑی نہیں ہوتی۔ وہ دوسروں کے ساتھ سوائے
دوست کے انکساری کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ انکساری غلام کی خصوصیت ہے۔
... وہ کبھی بغض و عداوت محسوس نہیں کرتا اور ہمیشہ مضرتوں کو بھول جاتا
ہے اور نظرانداز کر دیتا ہے...... وہ باتوں کا بہت شوقین نہیں ہوتا....
اس کو اس سے کوئی بحث نہیں ہوتی کہ اس کی تعریف ہو یا دوسروں کو الزام
دیا جائے۔ وہ دوسروں کو حتیٰ کہ اپنے دشمنوں کو بھی برا نہیں کہتا
سوائے اس کے کہ خود ان سے کہے۔ اس کی رفتار میں متانت ہوتی ہے،
اس کی آواز گہری ہوتی ہے اس کی گفتگو جچی تلی ہوتی ہے وہ جلدی نہیں
کرتا کیونکہ اسے صرف چند چیزوں سے تعلق ہوتا ہے اسے جوش نہیں آتا کیونکہ
وہ کسی چیز کو بہت اہم نہیں خیال کرتا۔ تیز آواز اور تیز قدم پریشانی کا نتیجہ

ہوتے ہیں .... وہ زندگی کے حوادث ایک شان اور انداز سے برداشت کرتا ہے وہ اپنے حالات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتا ہے ایک ہوشیار سپہ سالار کی طرح سے جو اپنی محدود فوج کو جنگ کی پوری مہارت کے ساتھ آراستہ کرتا ہے .... وہ اپنا بہترین دوست ہوتا ہے اور تنہائی میں خوش رہتا ہے برخلاف اس کے وہ شخص جس میں کوئی فضیلت یا قابلیت نہیں ہوتی اپنا بدترین دشمن ہوتا ہے اور تنہائی سے گھبراتا ہے۔

یہ ہے ارسطو کا فوق الانسان

۵۔ سیاسیات

۱۔ اشتراکیت اور قدامت پرستی

اس قسم کے اشرافی اخلاق سے قدرتی طور پر ایک شدید اشرافی فلسفۂ سیاسیات پیدا ہوتا ہے (یا ممکن ہے کہ یہ سلسلہ الٹا ہو)۔ یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ ایک شہنشاہ کا اتالیق اور ایک شاہزادی کا شوہر عوام سے یا تجارتی امرا سے کوئی خاص محبت رکھتا ہو۔ ہمارا فلسفہ وہیں ہے جہاں کہ ہمارا خزانہ پڑا ہے لیکن اس کے علاوہ ارسطو اس خلفشار اور تباہی کی وجہ سے جو ایتھنز کی جمہوریت کی وجہ برپا ہوئی تھی دیانت داری کے ساتھ قدامت پرست تھا۔ ایک سچے طالب علم کی طرح سے وہ انتظام حفاظت اور امن کا آرزومند تھا وہ محسوس کرتا تھا کہ یہ زمانہ سیاسی افراطوں کا نہیں ہے انتہا پسندی امن وسکون کے زمانے کا تعیش ہے ہم حالات کے بدلنے کی صرف اس وقت جراءت کرسکتے ہیں جب یہ ہمارے قابو میں ہوتے ہیں۔ ارسطو کہتا ہے کہ عام طور پر معمولی سی بات کے لیے قوانین کا بدلنا برا ہے۔ اور جب تبدیلی کا فائدہ تھوڑا ہو تو اگر کوئی نقص قانون یا حاکم میں ہو بھی تو بہتر ہے کہ اس پر فلسفیانہ تحمل سے کام لیا جائے۔

شہری کو تبدیلی سے اس قدر فائدہ نہ ہو گا جتنا کہ نافرمانی کی عادت پڑ جانے کی وجہ سے نقصان ہو گا۔ قانون کی تعمیل کرانے اور لہذا سیاسی توازن کو برقرار رکھنے کی قوت زیادہ تر رواج میں ہوتی ہے اور ذرا سی بات پر پرانے قوانین کو چھوڑ کر نئے قوانین کو اختیار کرنا ہر قسم کے قانون کی اندرونی روح کو یقینی طور پر کمزور کرتا ہے۔ لہذا ہمیں مدتوں کے تجربے کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ یہ چیزیں اگر اچھی ہوتیں تو یقیناً بہت سے برسوں میں ان کا علم ہو گیا ہوتا۔"

"ان چیزوں سے بے شک فلاطوں کی اشتراکی جمہوریت مراد ہے۔ ارسطو کو فلاطوں کی حقیقیت سے کلیات کے متعلق اور فلاطوں کی تصوریت سے حکومت کے متعلق اختلاف ہے۔ وہ اس تصویر میں جو استاد نے کھینچی ہے بہت سے تاریک نقطے پاتا ہے۔ اس کو اس تعلق کا بارک نا تسلسل پسند نہیں آتا جس میں فلاطوں اپنے محافظ فلسفیوں کو بند کر دیتا ہے۔ اگرچہ وہ قدامت پسند ہے مگر ارسطو انفرادی وصف تنہائی اور آزادی کو معاشری کارکردگی اور قوت سے زیادہ قیمتی سمجھتا ہے وہ ہر ہم عصر کو بھائی یا بہن یا ہر بڑی عمر والے شخص کو باپ یا ماں کہنا پسند نہیں کرتا۔ اگر سب تمہارے بھائی ہیں تو کوئی بھی نہیں ہے اور کسی کا حقیقی چچا زاد بھائی ہونا فلاطوں کے انداز میں بیٹا ہونے سے کتنا بہتر ہے۔ ایسی مملکت میں جہاں عورتیں اور بچے مشترک ہوں محبت نقش بر آب ہو گی،...... ان دو اوصاف میں سے جو زیادہ تر لحاظ اور محبت کو برانگیختہ کرتے ہیں ـــــ یہ کہ ایک چیز خود تمہاری ہے اور یہ تم میں حقیقی محبت پیدا کرتی ہے ـــــ کوئی سا بھی ایسی مملکت میں جیسی کہ فلاطوں کی ہے نہیں ہو سکتا۔

شاید کسی بہت ہی پرانے زمانے میں ایک اشتراکی معاشرہ ہو جب خاندان ہی صرف ایک مملکت تھا اور جانوروں کا چرانا اور معمولی طور پر کھیتی باڑی کرنا ہی ایک طریقۂ حیات تھا لیکن ایک نسبتاً منقسم معاشری حالت میں، ۹۲
جہاں کہ غیر مساوی اہمیت کے عملوں میں تقسیم عمل انسانوں کی قدرتی غیر مساوات کو ظاہر کرتی اور بڑھاتی ہو، اشتراکیت شکست ہو جاتی ہے کیونکہ یہ اعلیٰ

قابلیتوں کے عمل میں لانے کے لیے کوئی کافی محرک مہیا نہیں کرتی۔ مشکل کام کے لیے فائدے کا مہیج ضروری ہے اور مناسب صنعت کاشتکاری اور احتیاط کے لیے ملکیت کا مہیج لازمی ہے جب ہر شخص ہر شے کا مالک ہوگا تو کوئی شخص کسی شے کی پروا نہیں کرے گا۔ وہ شے جو بڑی سے بڑی تعداد کے لیے عام ہوتی ہے اس کی طرف سب سے کم توجہ کی جاتی ہے۔ ہر شخص زیادہ تر اپنا خیال کرتا ہے اور مشکل سے کبھی عام فائدے کا۔ ساتھ رہنے یا چیزوں کے مشترک رکھنے میں ہمیشہ ایک دشواری ہے مگر خصوصیت کے ساتھ مشترک ملکیت کے رکھنے میں ——— ہم سفروں کی شراکتیں اس کی ایک مثال ہے (شادی کے اندر جو دشوار اشتراکیت ہے اس کا تو ذکر ہی کیا) کیونکہ وہ عموماً راستے میں لڑ پڑتے ہیں اور کسی معمولی سی شے پر ان میں جھگڑا ہو جاتا ہے۔ لوگ یوٹوپیاؤں کا ذکر شوق سے سنتے ہیں اور ان کو یہ آسانی سے یقین آجاتا ہے کہ کسی حیرت انگیز طریقے سے ہر شخص ہر شخص کا دوست بن جائے گا خصوصاً اس وقت جب کہ کسی کو ان برائیوں کی مذمت کرتے ہوئے سنتے ہیں جن کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ ذاتی ملکیت اور ذاتی جواب ہیں . . . . قبضے سے پیدا ہوتی ہیں۔ مگر یہ خرابیاں ایک بالکل دوسرے ذریعے سے پیدا ہوتی ہیں یعنے فطرت انسانی کی شرارت سیاسیات انسانوں کو نہیں بناتی بلکہ اسے ان کو ایسی حالت میں لینا ہوتا ہے جیسی حالت میں کہ یہ فطرت سے آتے ہیں۔

اور فطرت انسانی یعنے اوسطاً فطرت انسانی اوتار کی نسبت حیوان سے زیادہ قریب ہوتی ہے۔ انسانوں کی بڑی کثرت فطری احمقوں اور کاہلوں پر مشتمل ہے اور ہر نظام میں خواہ وہ کیسا ہی ہو اس قسم کے انسان ڈوب کر تلی میں پہنچ جائیں گے اور ان کی حکومت کے وظائف سے امداد کرنا ایک ٹپکتے ہوئے پیپے میں پانی ڈالنے کے مانند ہے۔ سیاسیات میں اس قسم کے لوگوں پر حکومت ہونی چاہیئے اور حرفت میں رہبری اور اس کے لیے اگر ممکن ہو تو ان کی رضامندی حاصل کر لی جائے اور اگر ضروری ہو تو اس کے بغیر۔ ۹۳

پیدائش کے وقت سے بعض لوگ ماتحتی کرنے کے لیے مخصوص ہوتے ہیں اور بعض لوگ حکومت کرنے کے لیے۔ کیونکہ وہ شخص جو اپنے ذہن سے پیش بینی کر سکتا ہو فطرۃً آقا اور مالک بننے کے لائق ہوتا ہے اور جو صرف اپنے جسم سے کام کر سکتا ہو وہ فطرۃً غلام ہے۔ غلام کو آقا سے وہی نسبت ہے جو جسم سے ذہن کو ہے اور جس طرح سے جسم کو ذہن کے تابع رہنا چاہیے اسی طرح سے تمام چھوٹے درجوں کے آدمیوں کے لیے بھی مناسب ہے کہ وہ ایک آقا کے زیر حکومت رہیں۔ غلام ایک جاندار اوزار ہوتا ہے اور اوزار ایک بے جان غلام ہوتا ہے اور پھر ہمارا سخت دل فلسفی امکانات کی ایک جھلک کے ساتھ جس کو صنعتی انقلاب نے ہمارے مزدوروں کے لیے کھول دیا ہے ایک لمحے کے لیے دھندلی امید کے ساتھ لکھتا ہے اگر ہر اعلیٰ اپنا کام خود کرے اور دوسرے کے احکام یا ارادوں کو پہلے سے سمجھ لے .... اگر ناری خود بخود بننے لگے یا چھلا ستار کو بغیر اس کے کہ کوئی ہاتھ اس کی رہبری کرے خود بہ خود چھونے لگے تو بڑے کام کرنے والوں کا مددگاروں کی اور نہ آقاؤں کو غلاموں کی ضرورت ہوگی۔

یہ فلسفہ دستی محنت سے یونانی تنفر کا نمونہ ہے۔ اس قسم کا کام ایتھنز میں اتنا پیچیدہ نہیں ہوا تھا جتنا کہ یہ آج ہے کیونکہ اب اکثر دستی پیشوں کو بعض اوقات اس سے زیادہ ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے جتنی کہ نیچے کے درمیانی طبقے کے اعمال کے لیے ضرورت ہوتی ہے حتیٰ کہ ایک کالج کا پروفیسر بھی بعض مواقع پر موٹر کار کی مشین کو ایک دیوتا کی حیثیت سے دیکھ سکتا ہے۔ اس زمانے میں دستی کام محض دستی تھا اور ارسطو اس پر فلسفے کی بلندیوں سے حقارت کی نظر ڈالتا تھا کہ یہ ایسے لوگوں کا کام ہے جو ذہن نہیں رکھتے اور صرف غلاموں کے لیے موزوں ہے اور اس کے کرنے والے غلامی کے لیے ——— وہ یقین رکھتا ہے کہ دستی محنت ذہن کو کند اور پست بنا دیتی ہے اور سیاسی ذہانت کے لیے نہ تو وقت چھوڑتی ہے اور نہ ہمت۔ ارسطو کو یہ نتیجہ بالکل معقول معلوم ہوتا ہے کہ صرف ان لوگوں کی حکومت میں آواز ہونی چاہیے جو کچھ

فرصت رکھتے ہوں۔ مملکت کی بہترین صورت میکانک کو شہرت کے قریب نہ آنے دے گی۔ ...... تھبیز میں ایک قانون تھا کہ کوئی شخص عہدے پر نہیں آسکتا تھا جس کو کاروبار چھوڑے ہوئے دس برس نہ گزر چکے ہوں۔ تاجروں اور ساہوکاروں تک کو بھی ارسطو غلاموں کے زمرے میں شمار کرتا ہے۔ خردہ تجارت غیر فطری ہے .... اور ایسی صورت ہے جس میں آدمی ایک دوسرے سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس قسم کے تبادلے کی سب سے زیادہ نفرت انگیز صورت ...... سود خواری ہے جو روپے کے قدرتی استعمال سے نہیں بلکہ خود اس سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ کیونکہ روپے کا مقصد تو یہ تھا کہ یہ تبادلے کے آلے کی حیثیت سے کام دے نہ کہ یہ سود کی ماں بن جائے۔ سود خواری جس کے معنے روپے سے روپیہ پیدا کرنے کے ہیں ...... نفع کی تمام صورتوں میں سب سے زیادہ غیر فطری ہے روپے کے بچے نہیں ہونے چاہییں لہذا نظریہ مال کی بحث فلسفے کے غیر شایان نہیں ہے بلکہ مال میں یا روپیہ پیدا کرنے میں مشغول ہونا ایک آزاد آدمی کی شان کے خلاف ہے۔

ب۔ شادی اور تعلیم

عورت کی حیثیت مرد کے مقابلے میں ایسی ہے جیسی غلام کی حیثیت آقا کے مقابلے میں یا دستی کام کرنے والے کی ذہنی کام کرنے والے کے مقابلے یا وحشی کے یونانی کے مقابلے۔ عورت ایک نامکمل انسان ہے جو میزان ترقی میں ادنیٰ سطح پر کھڑی رہ گئی ہے۔ مرد فطرۃً برتر اور عورت فطرۃً کمتر ہوتی ہے ایک حکومت کرتا ہے اور دوسرا محکوم ہے اور یہ اصول بربنائے ضرورت تمام بنی نوع انسان پر حادی ہے۔ عورت ارادے میں کمزور رہوتی ہے اور
95 اس لیے سیرت یا حیثیت میں آزادی و خودمختاری کے ناقابل۔ اس کی بہترین حالت یہ ہے کہ وہ خاموشی کے ساتھ گھر کی زندگی بسر کرے۔ خارجی

معاملات میں اس پر مرد کی حکومت ہو مگر خانگی معاملات میں وہ حکومت کر سکتی ہے۔ عورت کو مرد کے بہت زیادہ مشابہ نہ بنانا چاہیئے جیسا کہ فلاطون کی جمہوریت میں ہے اس کے برعکس غیر مشابہت کو بڑھانا چاہیئے مختلف سے زیادہ دل کش کوئی چیز نہیں ہوتی۔ مرد اور عورت کی شجاعت جیسا کہ سقراط نے فرض کیا تھا ایک نہیں ہے۔ مرد کی شجاعت کا اظہار حکومت کرنے میں اور عورت کی شجاعت کا اظہار حکم ماننے میں ہوتا ہے جیسا کہ شاعر کہتا ہے کہ خاموشی عورت کی شوکت ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ارسطو کو یہ شبہہ ہے کہ عورت کی یہ معیاری غلامی مرد کے لیے شاذ و نادر ہی عمل میں آسکتی ہے اور اکثر عصائے حکومت بازو کو نہیں بلکہ زبان کو حاصل ہو جاتا ہے۔ مرد کو گویا کہ لازمی طور پر فائدہ پہنچانے کے لیے وہ نصیحت کرتا ہے کہ شادی میں تاخیر کی جائے یہاں تک کہ مرد کی عمر سینتیس کے لگ بھگ پہنچ جائے اور اس وقت وہ تقریباً بیس برس کی عمر کی لڑکی سے شادی کرے۔ ایسی لڑکی جو بیس کے لگ بھگ ہو عموماً تیس برس کے مرد کے مساوی ہوتی ہے، لیکن شاید سینتیس برس کا تجربہ کار سپاہی اس کو قابو میں رکھ سکتا ہے۔ ارسطو کو اس ازدواجی حساب پر جو شے مائل کرتی ہے وہ یہ خیال ہے کہ ایسے دو مختلف شخصوں کی تولیدی قوت اور جذبات تقریباً ایک ہی وقت میں ختم ہوں گے، اگر مرد ابھی بچے پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، اور عورت ان کی متحمل نہ ہو سکے، یا اس کے برعکس ہو تو جھگڑے یا اختلافات ہوں گے۔ چونکہ مرد کا زمانہ یا سن عموماً ستر برس کی عمر تک اور عورت کا پچاس برس کی عمر تک محدود ہے اس لیے ان کے اتحاد کی ابتدا ان زمانوں کے مطابق ہونی چاہیئے۔ مرد اور عورت کی یکجائی کمسنی میں بچوں کی پیدائش کے لیے برا ہے، تمام حیوانات میں کمسن والدین کے بچے چھوٹے ناقص نشو نما والے اور عموماً مادہ ہوتے ہیں صحت مجت کے مقابلے میں زیادہ اہم ہے علاوہ برایں اعتدال اسی میں ہے کہ بہت جلد شادی نہ کی جائے کیونکہ وہ عورتیں جن کی بہت جلد شادی ہو جاتی ہے ان کے بدراہ ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے، اور مردوں میں بھی جسمانی ڈھلیح

اگر وہ اس وقت شادی کریں جب کہ ان کا نشو و نما ہو رہا ہو ٹھہر جاتا ہے۔ ان
معاملات کو جوانوں کی مرضی پر نہیں چھوڑنا چاہیے بلکہ ان کو حکومت کی نگرانی اور 96
حکومت کے قابو میں ہونا چاہیے۔ حکومت کو ہر جنس کے لیے شادی کی کم از کم اور زیادہ سے زیادہ عمر استقرار حمل کے بہترین موسم اور آبادی کے بڑھنے کی رفتار کا تعین کرنا چاہیے۔ اگر آبادی میں اضافہ بہت ہی زیادہ شرح سے ہوتا ہو تو قتل اطفال کے بے رحم دستور کی جگہ اسقاط حمل کو دی جاسکتی ہے۔ اسقاط حمل کا انتظام حاملہ اور زندگی کے پیدا ہونے سے پہلے ہونا چاہیے۔ ہر مملکت کے لیے تعداد آبادی کی معیاری منزل ہوتی ہے جو اس کی حیثیت مقامی اور وسائل کے اعتبار سے متغیر ہوتی ہے۔ جب ایک مملکت کی آبادی بہت کم ہوتی ہے تو اپنی ضروریات کو آپ پورا نہیں کر سکتی جو ایک مملکت کے لیے ضروری ہے۔ اور اگر اس کی آبادی بہت زیادہ ہوتی ہے تو مملکت نہیں رہتی بلکہ ایک قوم بن جاتی ہے۔ ..... اور دستوری حکومت ـــ نسلی یا سیاسی وحدت کے تقریباً ناقابل ہو جاتی ہے۔ دس ہزار سے آبادی جس قدر بھی زیادہ ہوگی اچھا نہ ہوگا۔

تعلیم بھی مملکت کے ہاتھ میں ہونی چاہیے۔ وہ چیز جو دستوروں کے زیادہ مستقل بنانے میں سب سے زیادہ ممد ہوتی ہے یہ ہے کہ تعلیم حکومت کی صورت کے مطابق ہونی چاہیے .... شہری کو حکومت کی اس صورت کے مطابق ڈھلنا چاہیے جس میں کہ وہ رہتا ہو۔ مدارس اگر حکومت کی نگرانی میں ہوں گے تو ہم لوگوں کو صنعت اور تجارت سے ہٹا کر زراعت کی طرف متوجہ کر سکتے ہیں اور ہم لوگوں کو اس طرح پر تربیت کر سکتے ہیں کہ باوجود نجی ملکیت رکھنے کے اپنے مقبوضات کو مناسب موقع پر اجتماعی اغراض کے لیے وقف کر دیا کریں۔ اچھے آدمیوں میں ملکیت کے متعلق یہ مقولہ صحیح رہے گا کہ دوستوں میں تمام چیزیں مشترک ہونی چاہئیں۔ مگر سب سے بڑھ کر نوجوان شہری کو قانون کی اطاعت سکھانا ضروری ہے ورنہ مملکت ناممکن ہوگی۔ یہ مقولہ نہایت ہی اچھا ہے کہ جس شخص نے تعمیل کرنی نہیں سیکھی وہ کبھی اچھا قائد نہیں ہو سکتا...... اچھے شہری کو دونوں کے قابل ہونا چاہیے نسلی اختلاف کی صورت میں وحدت مدارس کا سرکاری نظام ہی پورا کر سکتا ہے۔ مملکت ایک کثرت ہے جس کو تعلیم کے ذریعے سے وحدت اور جماعت کی صورت منتقل ہونا چاہیے۔ نوجوان کو یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ وہ مملکت کی

صورت میں ایک بڑی نعمت رکھتا ہے یہ اطمینان و آزادی کی نعمت ہے جو معاشری تنظیم اور قانون سے آتی ہے۔ آدمی جب مکمل ہو تو وہ بہترین حیوان ہوتا ہے،
۹۷ مگر جب وہ معاشرے میں نہ ہو تو وہ بدترین حیوان ہوتا ہے، کیونکہ ناانصافی جب مسلح ہو جاتی ہے تو وہ زیادہ خطرناک ہوتی ہے؛ اور انسان پیدائش کے وقت ہی سے عقل اور سیرت کے اوصاف سے مسلح ہوتا ہے جن کو وہ بدترین مقاصد کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔ اس لیے اگر وہ فضیلت نہ رکھتا ہو تو وہ حیوانوں میں سب سے پلید اور وحشی ہوگا، پیٹو پن اور حرص سے بھرا ہوا۔ صرف معاشری نگرانی سے اس کو فضیلت مل سکتی ہے۔ نطق کے ذریعے سے آدمی نے معاشرے کو پیدا کیا ہے اور معاشرے کے ذریعے سے عقل کو ترقی دی ہے؛ اور عقل کے ذریعے سے نظم کو، اور نظم کے ذریعے سے تمدن کو۔ اس قسم کی منظم مملکت میں انسان کو ترقی کے ہزار مواقع اور راستے ہوتے ہیں جو تنہا زندگی میں کبھی نہیں ہوتے۔ لہٰذا تنہا رہنے کے لیے انسان کو یا تو حیوان ہونا چاہیے یا دیوتا۔

لہٰذا انقلاب تقریباً ہمیشہ غیر دانشمندانہ ہوتا ہے۔ اس سے ممکن ہے کہ کوئی بھلائی بھی پیدا ہو جائے، مگر بہت سی برائیوں کی قیمت پر جن میں سے سب سے بڑی معاشری نظام اور معاشری تار پود کا جس پر کہ ہر سیاسی بھلائی بنی ہے، انتشار اور شاید شکست ہے۔ انقلابی بدعات کے بلاواسطہ نتائج ممکن ہے کہ قابل اندازہ اور مفید ہوں۔ مگر بالواسطہ نتائج کا عموماً کوئی اندازہ نہیں کر سکتا، اور یہ اکثر مہلک ہوتے ہیں۔ وہ لوگ جو صرف چند ہی امور کو پیش نظر رکھتے ہوں ان کے لیے فیصلہ کر دینا آسان ہوتا ہے؛ اور جس شخص کو تھوڑا ہی سا کام انجام دینا ہوتا ہے وہ جلدی سے تہیہ کر لیتا ہے۔ نوجوان آسانی سے دھوکا کھا جاتے ہیں کیونکہ جلدی سے امید باندھ لیتے ہیں۔ دیرینہ دستوروں کی خلاف ورزی اختراع کرنے والی حکومتوں کی شکست کا موجب ہوتی ہے کیونکہ قدیم عادتیں لوگوں میں باقی رہتی ہیں۔ سیرتیں اس قدر آسانی کے ساتھ نہیں بدل جاتیں جس آسانی سے قوانین بدل جاتے ہیں۔ کسی دستور حکومت کے مستقل ہونے کے لیے یہ ضروری ہے معاشرے کے تمام حصے اس کے باقی رکھنے

کے خواہش مند ہوں۔ لہذا اگر کوئی حاکم انقلاب سے بچنا چاہتا ہو۔ ایسے افلاس اور دولت کو روکنا چاہئے یہ حالت اکثر اوقات لڑائی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ایسے (انگریزوں کی طرح سے) خطرناک طور پر گنجان آبادیوں کے نکاس کے لیے نوآبادیات قائم کرنی چاہئیں اور اسے مذہب کی حمایت کرنی چاہئے اور اس پر عامل ہونا چاہئے ایک مطلق العنان حاکم کو تو خاص طور پر دیوتاؤں کی پوجا میں بظاہر خلوص کا اظہار کرنا چاہیے۔ کیونکہ اگر لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ان کا فرمانروا مذہبی ہے اور دیوتاؤں کا احترام کرتا ہے تو انھیں اس سے ظلم کا اندیشہ کم ہوتا ہے اور وہ اس کے خلاف سازش کرنے پر کم مائل ہوتے ہیں کیونکہ ان کو خیال ہوتا ہے کہ اس کی طرف سے دیوتا لڑتے ہیں۔

98 ## ج۔ اشرافیہ اور عمومیہ

مذہب تعلیم اور خاندانی زندگی کی ترتیب میں اس قسم کے تحفظات کے ساتھ تقریباً حکومت کی تمام صورتیں کام دے سکتی ہیں۔ تمام صورتیں اپنے ساتھ اچھائی اور برائی ملی ہوئی رکھتی ہیں اور انفرادی طور پر مختلف حالات کے مناسب ہوتی ہیں۔ نظری طور پر بہترین صورت حکومت کی یہ ہوگی کہ سیاسی قوت کو ایک بہترین آدمی میں مرکوز کر دیا جائے۔ ہومر ٹھیک کہتا ہے بہت سوں کی آقائی بری ہے ایک ہی کو اپنا حاکم اور آقا بناؤ۔ ایسے شخص کے لیے قانون حد ہونے کے بجائے ایک آلہ ہوگا۔ ممتاز قابلیت کے آدمیوں کے لیے کوئی قانون نہیں ہے۔ وہ خود قانون ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ان کے لیے قوانین بنانے کی کوشش کرے تو وہ مضحکہ خیز ہوگا۔ وہ غالباً جواب دیں گے جو اینٹھس تھنز کی بیان کی ہوئی کہانی میں شیر دل نے خرگوشوں سے اس موقع پر کہا تھا جب کہ حیوانوں کی مجلس میں خرگوشوں نے تقریر کرتے ہوئے مساوات کا مطالبہ کیا تھا کہ تمھارے پنجے کہاں ہیں۔

مگر عملی طور پر بادشاہی حکومت کی عموماً سب سے خراب صورت ہوتی ہے کیونکہ انتہائی طاقت اور انتہائی فضیلت ایک ساتھ جمع نہیں ہوتیں۔ لہٰذا بہترین عملی سیاست اشرافیہ ہے یعنے چند باخبر اور قابل لوگوں کی حکومت۔ حکومت اس قدر پیچیدہ چیز ہے کہ اس کے معاملات کا تصفیہ کثرت تعداد سے نہیں ہو سکتا حالانکہ چھوٹے معاملات علم اور قابلیت کے لیے مخصوص ہوتے ہیں جس طرح سے ایک طبیب کے متعلق ایک طبیب ہی کو رائے قائم کرنی چاہیے اسی طرح سے عام طور پر انسانوں کے متعلق ان کے ہمسروں کو رائے قائم کرنی چاہیے..... اب کیا یہی اصول انتخابات پر عائد نہیں ہوتا۔ کیونکہ صحیح انتخاب صرف وہ لوگ
99 کر سکتے ہیں جن کو علم ہوتا ہے مثلاً ایک مہندس ہندسے کے معاملات میں صحیح طور پر انتخاب کر سکتا ہے یا ایک جہاز راں جہاز رانی کے معاملات میں...... پس نہ تو مجسٹریٹوں کا انتخاب کثرت رائے کے سپرد کیا جا سکتا ہے نہ ان سے رائے طلب کرنا۔

موروثی اشرافیہ میں دشواری یہ ہے کہ یہ کوئی مستقل اقتصادی بنیاد نہیں رکھتی دولت کا زور سیاسی خدمت کو جلد یا بدیر سب سے زیادہ بولی بولنے والے کے قبضے میں دے دیتا ہے۔ یہ یقیناً برا ہے کہ بڑی خدمات خریدی جائیں۔ وہ قانون جو اس خرابی کو جائز رکھتا ہے دولت کو قابلیت کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دیتا ہے اور کل مملکت لالچی بن جاتی ہے کیونکہ جب کبھی مملکت کے سربرآوردہ لوگ کسی چیز کو باعزت خیال کرتے ہیں تو دوسرے شہری یقیناً ان کی مثال کی تقلید کرتے ہیں (جدید معاشری نفسیات کی نقل ناموری) اور جہاں قابلیت کو سب سے بڑا مرتبہ حاصل نہیں ہوتا وہاں حقیقی اشرافیہ نہیں ہوتا۔

جمہوریہ معمولاً مالداروں کی حکومت کے خلاف انقلاب کا نتیجہ ہوتی ہے فرمانروا طبقوں میں جلب منفعت کا شوق ہمیشہ ان کی تعداد کے گھٹا دینے پر مائل ہوتا ہے (مارکس کا درمیانی طبقے کا حذف ہونا) اور اس طرح سے عوام کا طاقت حاصل کرنا جو آخر میں اپنے آقاؤں پر غالب آکر جمہوریتیں قائم کر لیتے ہیں۔

اس حکومت غربا میں بھی کچھ فائدے ہیں۔ عوام اگرچہ انفرادی طور پر ان لوگوں سے جو کہ خاص علم رکھتے ہیں ممکن ہے کہ برے منصف ہوں مگر مجموعی طور پر اچھے ہوں۔ علاوہ بریں بعض ایسے صنائع ہوتے ہیں جن کے کاموں کا بہترین اندازہ وہ خود ہی نہیں کرتے بلکہ وہ لوگ بھی کر سکتے ہیں جو کہ فن سے واقف نہیں ہوتے مثلاً مکان کے استعمال کرنے والا یا اس کا مالک بنانے والے کی نسبت اس کے متعلق بہتر طور پر اندازہ کر سکے گا...... اور ایک دعوت کے بارے میں باورچی کی نسبت مہمان بہتر رائے قائم کر سکے گا۔ اور چند کے مقابلے میں بہت سوں کے خراب ہونے کا اندیشہ بھی کم ہوتا ہے ان کی مثال پانی کی ایک بڑی مقدار کی سی ہے، جو تھوڑے پانی کے مقابلے میں آسانی سے خراب نہیں ہوتا۔ فرد غصہ یا کسی دوسرے جذبے سے مغلوب ہو سکتا ہے اور پھر اس کی رائے
لازمی طور پر متاثر ہو سکتی ہے مگر اشخاص کی ایک بڑی تعداد کے متعلق یہ ۱۰۰
فرض کرنا دشوار ہے کہ وہ سب جذبے سے مغلوب ہو کر ایک وقت میں غلطی کر جائیں گے۔

بایں ہمہ عمومیہ اشرافیہ کے مقابلے میں بحیثیت مجموعی حکومت کی ایک ادنیٰ صورت ہے۔ کیونکہ یہ مساوات کے غلط مفروضے پر مبنی ہے یہ اس تصور سے پیدا ہوتی ہے کہ وہ لوگ جو ایک اعتبار سے مساوی ہیں (مثلاً قانون وعزت کے اعتبار سے) وہ اور سب اعتبارات میں بھی مساوی ہوتے ہیں۔ چونکہ انسان مساوی طور پر آزاد ہیں، وہ مطلقاً مساوی ہونے کے مدعی ہوتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ قابلیت کو تعداد پر قربان کر دیا جاتا ہے، اور تعداد کو فریب سے قابو میں کیا جاتا ہے۔ چونکہ لوگ آسانی سے گمراہ ہو جاتے ہیں، اور اپنے خیالات میں متلون ہوتے ہیں، اس لیے حق رائے دہی صرف عقلمندوں اور تعلیم یافتہ لوگوں تک محدود ہونا چاہیے۔ ہمیں جس چیز کی ضرورت ہے وہ اشرافیہ اور عمومیہ کی ترکیب ہے۔

دستوری حکومت میں یہ خوش قسمت اتحاد موجود ہے۔ یہ حکومت کی بہترین شکل نہیں ہے، وہ تو اہل علم کی اشرافیہ ہوگی، لیکن یہ بہترین سلطنت ہے۔ ہم کو پوچھنا

چاہئے، کہ اکثر مملکتوں کے لیے بہترین دستور کونسا ہے اور اکثر آدمیوں کے لیے بہترین زندگی اور دونوں صورتوں میں، ہمیں فضیلت کا ایسا معیار فرض نہیں کرنا چاہئے، جو معمولی اشخاص سے بلند تر ہو، اور نہ ایسی تعلیم فرض کرنی چاہئے، جس کے لیے فطرت یا حالات کے غیر معمولی طور پر موافق ہونے کی ضرورت ہو۔ اور نہ ہم کو ایسی معیاری مملکت فرض کرنی چاہئے جس کی صرف آرزو کی جا سکے، بلکہ ہمیں اپنے ذہن میں ایسی حالت کو رکھنا چاہئے جس کو آبادی کی بڑی تعداد حاصل کر سکے، اور ایسی حکومت جس تک عام طور پر مملکتیں پہنچ سکیں ایک عام عمل کا اصول فرض کر کے ابتدا کرنی ضروری ہے، اور وہ یہ کہ مملکت کے اس حصے کو جو حکومت کی بقا چاہتا ہو، اسی حصے سے جو کہ نہ چاہتا ہو، زیادہ طاقتور ہونا چاہئے اور طاقت نہ صرف تعداد پر مشتمل ہے، نہ صرف جائداد پر نہ صرف فوجی یا سیاسی قابلیت پر، بلکہ ان کی ترکیب پر مشتمل ہے۔ اس لیے آزادی دولت شائستگی شرافت اور محض عددی تفوق کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔

اب ہمیں ایسی اقتصادی کثرت کہاں سے ملے گی، جو ہماری دستوری حکومت کی ۱۰۱
موئید ہو۔ شاید بہترین درمیانی طبقے میں مل سکتی ہے۔ اس میں وہی زریں اوسط ہے، جیسا کہ خود دستوری حکومت عمومیہ اور اشرافیہ کے مابین اوسط ہو گی۔ ہماری مملکت میں اگر ہر خدمت کے لیے راستہ سب کے لیے کھلا ہو تو کافی عمومی ہو گی اور اگر خدمات کا دروازہ سوائے ان لوگوں کے جو سڑک پر سفر کر کے پوری طرح سے تیار ہو کر پہنچے ہوں اور سب کے واسطے بند ہو تو کافی اشرافی ہو گی۔ جس زاویے سے بھی ہم اپنے ابدی سیاسی مسئلے کی طرف آتے ہیں ہم ہمیشہ ایک ہی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جن غایتوں کو حاصل کرنا ہے ان کا تعین قوم کو کرنا چاہئے مگر ذرائع اور وسائل کا انتخاب اور ان کا عمل میں لانا صرف ماہرین فن سے متعلق ہونا چاہئے یعنے پسند کو عمومی بنانا چاہئے لیکن عہدے کو شدت کے ساتھ تربیت یافتہ اور تیار بہترین افراد کے لیے مخصوص ہونا چاہئے۔

۹- انتقاد

اس فلسفے کے متعلق ہم کیا کہیں گے۔ شاید غیر معمولی طور پہ اظہار پسندیدگی نہ ہو۔ ارسطو کے متعلق اظہار جوش کرنا دشوار ہے۔ کیونکہ اس کو خود کسی چیز کے متعلق بہت جوش نہ تھا۔ اور اگر تم مجھے رُلانا چاہتے ہو، تو تم کو خود پہلے رونا چاہیے۔ اس کا اصول تو یہ ہے کہ کسی چیز کی تعریف یا کسی چیز پر اظہار تعجب مت کرو، اور ہم اس کے اصول کو اسی کے بارے میں توڑتے ہوئے جھجکتے ہیں۔ اس میں ہم کو فلاطون کا سا اصلاحی جوش نظر نہیں آتا اور نہ انسانیت کی وہ خشم آلود محبت، جس نے اس بڑے تصوری کو اپنے ہم جنسوں کی مذمت پہ مجبور کیا تھا۔ ہم کو اس کے یہاں اس کے استاد کی جدت طرازی، علو تخیل، فیاضانہ فریب کی استعداد نظر نہیں آتی۔ لیکن اس کے باوجود فلاطوں کے پڑھ لینے کے بعد ہمارے لیے کوئی شے اتنی صحت بخش نہیں ہو سکتی، جتنی کہ ارسطو کی ارتیابی خاموشی۔

ہمیں اپنے اختلاف کا خلاصہ کر لینا چاہیے۔ ابتدا میں تو ہم اس کے منطق پہ زور دینے سے پریشان ہوتے ہیں۔ وہ قیاس کو انسان کے استدلال کرنے کا بیان خیال کرتا ہے، حالانکہ یہ محض اس طریق کو ظاہر کرتا ہے، جس طرح سے کہ ایک شخص اپنے استدلال کو دوسرے ذہن کے قائل کرنے کے لیے ملبوس کرتا ہے۔ وہ فرض کرتا ہے کہ فکر مقدمات سے شروع ہوتا ہے اور ان کے نتائج کی تلاش کرتا ہے حالانکہ واقعاً فکر افتراضی نتائج سے شروع ہوتا ہے اور ان کے تائید کرنے والے
مقدمات کی تلاش کرتا ہے۔ اور ان کی بہتر صورت میں اس طرح سے ۱۰۲
تلاش کرتا ہے کہ جزئی واقعات کا اختیار سے محدود اور منضبط حالات میں مشاہدہ کیا جائے۔ مگر اس کے باوجود ہم کس قدر بے وقوف ہوں گے اگر ہم اس بات کو فراموش کر جائیں کہ دو ہزار برس کی مدت نے ارسطو کی منطق کے صرف عوارض کو بدلا ہے اوکیم بیکن ویہویل اور مل اور سیکڑوں

دوسروں نے اس کے سورج کے اندر صرف نقطوں کو پایا ہے اور ارسطو کی فکر کی نئی تربیت کے لیے یہ ایجاد اور اس کا اس کی اساسی حدود کو متعین کرنا اب تک ذہن انسانی کی مستقل کامیابیوں میں سے ایک ہے۔

ارسطو کے علم طبیعی کو جو شے غیر منہضم مشاہدات کا ایک انبار بناتی ہے وہ اختبار اور مفید مطلب مفروضے کا فقدان ہے۔ معطیات کا جمع کرنا اصطفاف کرنا اس کی خصوصیت ہے۔ ہر میدان میں وہ اپنے مقولات سے کام لیتا ہے اور فہرستیں بنا ڈالتا ہے۔ لیکن مشاہدے کے اس رجحان اور ذہانت کے ساتھ ساتھ مابعد الطبیعیات کا فلاطونی شوق بھی رہتا ہے۔ یہ اس کو ہر حکمت میں لا ڈالتا ہے اور حد درجہ آزادانہ مفروضات کے قائم کرنے پر آمادہ کر دیتا ہے۔ یہیں پر یونانی ذہن کی سب سے بڑی کمزوری ہے یہ تربیت یافتہ نہ تھا۔ محدود کرنے اور استوار رکھنے کی روایات اس کو حاصل نہ تھیں۔ یہ آزادی کے ساتھ غیر دریافت شدہ میدان میں حرکت کرتا تھا اور ضرورت سے زیادہ جلد نظریات و نتائج قائم کرنے لگتا تھا۔ اسی لیے یونانی فلسفہ اتنی بلندیوں تک اچھلا جن تک پھر دسترس نہ ہوئی مگر یونانی حکمت پیچھے رہ گئی۔ دور جدید کا خطرہ ٹھیک اس کا عکس ہے۔ استقرائی معطیات ہم پر ہر طرف سے اس طرح سے آ کر گرتے ہیں جیسے کہ وسویوس کا لاوا۔ غیر مربوط واقعات میں ہمارا دم گھٹتا جاتا ہے۔ ہمارے اذہان حکمتوں سے پریشان ہوتے جاتے ہیں جو بڑھ کر تخصصی ابتری میں ایک ترکیبی فکر اور وحدت بخش فلسفے کے نہ ہونے کی وجہ سے مبتلا ہوتے جا رہے ہیں۔ ہم سب اس شے کے جو کہ ایک انسان ہو سکتا ہے محض ٹکڑے ہیں۔

ارسطو کی اخلاقیات اس کی منطق کا ایک شعبہ ہے۔ معیاری زندگی ایک صحیح قیاس کے مانند ہے۔ وہ ہمیں اصلاح کے محرک کے بجائے آداب کی ایک کتاب دیتا ہے۔ ایک قدیم نقاد نے اس کے متعلق یہ کہا تھا کہ وہ حد سے زیادہ اعتدال پسند ہے۔ ایک انتہا پسند اخلاقیات کو تمام ادب میں عامی باتوں کا ایک بے مثال مجموعہ کہہ سکتا ہے۔ اور انگریز پسند کو

اس خیال پر تشفی ہوگی کہ انگریزوں نے اپنی جوانی میں اپنے پختہ سن کے شہنشاہیتی ۱۰۳
گناہوں کا پہلے ہی سے کفارہ ادا کر دیا ہے کیونکہ کیمبرج اور آکسفورڈ دونوں میں وہ اخلاقیات نقوماجس کا لفظ بہ لفظ پڑھنے پر مجبور کیے گئے تھے ہمیں ان خشک صفحات کے ساتھ تازہ سبز گھاس کی پتیوں کے ملانے کی آرزو ہوتی ہے وہائٹ ہین کی جوش انگیز خوشی کے احساس کی حمایت کو ارسطو کی خالص عقلی مسرت کے اوج پر اضافہ کرنے کی تمنا ہوتی ہے۔ ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ کیا ارسطو کا یہ غیر معتدل اعتدال کا نصب العین برطانی اشرافیہ کی بے رنگ فضیلت خشک تکمیل اور بے اظہار مستحسن صورت سے کوئی تعلق رکھتا ہے۔ میتھیو آرنلڈ ہمیں بتاتا ہے کہ اس کے زمانے میں آکسفورڈ کے معلم اخلاقیات کو ناقابل خطا خیال کرتے تھے۔ تین سو برس سے اس کتاب نے اور سیاسیات نے حکمراں برطانوی ذہن بنایا ہے اور شاید بڑے اور شریفانہ کاموں کا باعث ہوئی ہے مگر یقیناً یہ ایک سخت اور سرد کار کردگی کا بھی باعث ہوئی ہے۔ اگر سب سے بڑی سلطنت کے مالکوں کو اس کے بجائے جمہوریت کے مقدس جوش اور تعمیری جذبے کی تعلیم دی گئی ہوتی تو کیا نتیجہ ہوتا۔

بہرحال ارسطو پورا یونانی نہ تھا وہ ایتھنز آنے سے پہلے بن چکا تھا اس کے اندر ایتھنز کی کوئی بات نہ تھی اس میں وہ جلد بازی اور جوش میں لانے والی اختیاریت نہ تھی جس نے ایتھنز کو سیاسی زندگی سے گرمایا تھا اور آخر میں ایک متحد کرنے والے خود مختار بادشاہ کی اطاعت قبول کرنے پر آمادہ کیا تھا وہ ڈلفی کے حکم "کہ افراد سے بچو" کو ضرورت سے زیادہ محسوس کرتا تھا۔ وہ انتہاؤں سے بچنے کی اس قدر کوشش کرتا ہے کہ آخر کار کچھ باقی نہیں رہ جاتا۔ وہ بدنظمی سے اس قدر خائف ہے کہ غلامی سے ڈرنے کو بھول جاتا ہے۔ وہ غیر یقینی تبدیلی سے اس قدر ڈرتا ہے کہ ایسے عدم تغیر کو ترجیح دیتا ہے جو موت کے مشابہ ہے۔ اس میں تحول کا وہ ہرقلی طوسی احساس مفقود ہے جو قدامت پرست کے اس یقین کو جائز قرار دیتا ہے کہ ہر قسم کا مستقل تغیر بتدریج ہوتا ہے اور انتہا پسند کے

اس یقین کو جائز سمجھتا ہے کہ کوئی جمود یا بے تغیری مستقل نہیں ہوتی۔ وہ اس امر کو فراموش کر دیتا ہے کہ فلاطون کی اشترا کیت چند بے غرض اور بے طمع افراد کے لیے تھی اور وہ جب یہ کہتا ہے کہ اگرچہ ملکیت نجی ہونی چاہئے مگر اس کا استعمال جہاں تک ممکن ہو عام ہونا چاہئے گھوم پھر کر ایک فلاطونی نتیجے تک پہنچ جاتا ہے۔
۱۰۴ وہ اس بات کو نہیں دیکھتا (اور شاید اپنے ابتدائی زمانے میں اس سے یہ دیکھنے کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی) کہ وسائل پیدائش کا انفرادی ضبط صرف اس وقت محرک اور مفید ہو سکتا ہے، جب یہ ذرائع اس قدر سادہ ہوں کہ ان کو ہر آدمی خرید سکے۔ اور یہ کہ ان کی بڑھتی ہوئی پیچیدگی اور صرف ملکیت اور قوت کے خطرناک طور پر مرکزی بن جانے اور مصنوعی اور آخر کار منتشر کن عدم مساوات کی طرف لے جاتا ہے۔

لیکن اس سب کے باوجود یہ ایسی شے کے بالکل ہی غیر اہم انتقادات ہیں جو کہ فکر کا سب سے حیرت انگیز اور با اثر نظام ہے جس کو کہ کبھی ایک منفرد ذہن نے یکجا کیا ہے۔ یہ امر مشکوک ہے کہ آیا کسی دوسرے مفکر نے دنیا کے روشن خیال بنانے میں اس قدر حصہ لیا ہے۔ بعد کا ہر زمانہ ارسطو تک پہنچا ہے اور اس کے کندھوں پر کھڑے ہو کر صداقت کے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اسکندریہ کی گوناگوں اور شاندار تہذیب نے اپنے حکمی خیالات کی اصل اس میں پائی ہے۔ اس کی کتاب آرگینن نے قرون وسطیٰ کے وحشی ذہنوں کے تربیت یافتہ اور غیر متناقض فکر کے اندر ڈھالنے میں مرکزی خدمت انجام دی ہے۔ اس کی دوسری تصانیف نے جن کا نسٹوری عیسائیوں نے سریانی زبان میں پانچویں صدی عیسوی میں ترجمہ کیا تھا اور جس سے پھر دسویں صدی عیسوی میں عربی اور عبرانی میں ترجمہ ہوا جہاں سے پھر ۱۲۲۵ عیسوی کے قریب لاطینی میں ترجمہ ہوا۔ مدرسیت کو اس کے اے بی لارڈ مین فصیح مبادی سے تھامس ایکوئنس میں بحر العلومی تکمیل کو پہنچا دیا۔ صلیبی جنگوں کے مجاہد اس فلسفی کی تصانیف کی زیادہ صحیح یونانی نقلیں لے کر آئے اور جب ۱۴۵۳ء میں یونانی علما قسطنطنیہ سے ترکوں کے محاصرے کی وجہ سے بھاگے وہ اپنے ساتھ

اور ارسطا طالیسی خزانے سے کرآئے۔ ارسطو کی تصانیف کو فلسفۂ یورپ سے وہی نسبت ہے جو انجیل کو ان کی دینیات سے ہے۔ کہ یہ تقریباً ہر معاملے میں اٹل ہے اور اس میں ہر مسئلے کا حل پایا جاتا ہے ۱۲۱۵ء میں پوپ کے سفیر متعینہ پیرس نے معلمین کو اس کی تصانیف پر درس دینے سے منع کر دیا۔ ۱۲۳۱ء میں گری گرے نہم نے اس کے پاک و صاف کرنے کے لیے ایک جماعت مقرر کی ۱۲۶۰ء تک ہر عیسائی مدرسے میں اس کی تعلیم لازمی ہو گئی تھی اور مذہبی جماعتیں اس کے خیالات سے انحراف پر سزائیں دیتی تھیں۔ چوسر اس کے متعلم کو اپنے بستر کے قریب بیس کتابیں ارسطو اور اس کے فلسفے کی

105 سرخ یا سیاہ جلد والی رکھنے پر بہت جوش ظاہر کرتا ہے اور جہنم کے پہلے دائروں میں ڈانٹے کہتا ہے۔

میں نے وہاں ان لوگوں کے استاد کو دیکھا جو جانتے ہیں
فلسفی خاندان کے درمیان، سب اس کی تعریف کرتے ہیں اور سب
اس کا احترام کرتے ہیں، میں نے وہاں فلاطون اور سقراط کو بھی دیکھا
جو کہ اوروں کے مقابلے میں اس سے زیادہ قریب کھڑے تھے۔

اس قسم کے اشعار سے اس عزت کا پتا چلتا ہے جو ایک ہزار برس نے اسٹیجرائی کی تھی۔ ارسطو کی حکومت اس وقت تک ختم نہیں ہوئی، جب تک کہ نئے آلات جمع شدہ مشاہدات اور صبر آزما اختبارات نے حکمت کو از سر نو نہیں بنایا اور ادکم رمیس روجر اور فرنیس بیکن کو ایسے اسلحہ نہیں دے دیئے جن کا کہ مقابلہ نہیں ہو سکتا تھا۔ کسی اور ذہن نے اتنے عرصے تک بنی نوع انسان کی عقل پر حکومت نہیں کی ہے۔

۱۰۔ بعد کی زندگی اور موت

اس اثنا میں ہمارے فلسفی کے لیے زندگی بے حد پیچیدہ ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو ایک طرف تو سکندر سے کیلس تھنیز کے قتل کے خلاف (جو ارسطو کا بھتیجا تھا

احتجاج کرنے کی بنا پر الجھا ہوا پایا جس نے کہ سکندر کی خدا کی حیثیت سے عبادت کرنے سے انکار کردیا تھا' اور سکندر نے اس احتجاج کا یہ اشارہ کرکے جواب دیا تھا کہ فلسفیوں کو بھی مرد اڈالنا میری قدرت میں ہے۔ اس کے ساتھ ہی ارسطو اہل ایتھنز میں سکندر کی حمایت کرنے میں مصروف تھا۔ وہ شہری حب الوطنی کے مقابلے میں یونانی اتحاد کو ترجیح دیتا تھا' اور اس کا خیال تھا کہ چھوٹی بادشاہیوں اور جھگڑوں کے ختم ہونے کے بعد تہذیب وحکمت بہتر طریق پر سرسبز ہوگی۔ اسے سکندر میں وہی چیز نظر آتی تھی جو گوئٹے نپولین میں دیکھنے والا تھا۔ یعنے ایک پریشان اور ناقابل برداشت طور پر منتشر دنیا کی فلسفیانہ وحدت۔ ایتھنز والے جو آزادی کے بھوکے تھے وہ ارسطو پر غراتے تھے اور ان کی مخالفت اس وقت اور بھی سخت ہوگئی' جب سکندر نے ارسطو کا ایک بت مخالف شہر کے وسط میں لگا دیا۔ اسی ہنگامے میں ہم پر جو ارسطو کا اثر ہوتا ہے وہ اس کے بالکل مخالف ہے جو اس کی اخلاقیات سے ہوا تھا یہاں ایک سرد مہر اور غیر انسانی طور پر خاموش آدمی نہیں ہے بلکہ ایک لڑنے والا ہے جو اپنے عظیم الشان کام کو ہر طرف سے دشمنوں کے حلقے میں انجام دے رہا ہے۔ ایکڈمی فلاطون کے جانشین اسوکرٹیز کا مدرسۂ خطابت اور غضبناک مجمع جو ڈماستھینیز کی تلخ لسانی کے گرد جمع تھے سب کے سب سازش کر رہے تھے اور اس کی جلاوطنی یا اس کی موت کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ۱۰

اور پھر اچانک (۳۲۳ ق م) سکندر مر گیا۔ سارا ایتھنز حب الوطنی کے جوش مسرت سے دیوانہ ہوگیا۔ مقدونی جماعت کو شکست ہوئی اور ایتھنز کی آزادی کا اعلان کردیا۔ اینٹی پیٹر سکندر کا جانشین اور ارسطو کا گہرا دوست باغی شہر کے خلاف چلا۔ مقدونی جماعت کا اکثر حصہ بھاگ گیا۔ پوری میڈن ایک بڑے پادری نے ارسطو کے خلاف مقدمہ دائر کیا اور اس پر یہ الزام لگایا کہ وہ یہ تعلیم دیتا ہے کہ دعا اور قربانی بے سود ہیں۔ ارسطو نے دیکھا کہ میرے مقدمے کی سماعت ایسی مجلسیں کریں گی اور عوام کے ایسے مجمع میرے خلاف ہوں گے جو اس سے کہیں زیادہ مخالف ہوں گے جنھوں نے

سقراط کو قتل کیا تھا۔ نہایت عقلمندی سے اس نے شہر کو یہ کہتے ہوئے چھوڑ دیا کہ وہ ایتھنز کو دوسری مرتبہ فلسفے کے خلاف مرتکب گناہ ہونے کا موقع نہ دے گا۔ اس کے اندر کوئی بزدلی نہ تھی ایک ملزم کو ایتھنز میں ہمیشہ جلاوطنی کے اختیار کرنے کا موقع تھا چیلکس پہنچ کر ارسطو بیمار پڑ گیا دیو جانس لیرٹس ہم کو بتاتا ہے کہ بوڑھے فلسفی نے یہ دیکھ کر کہ تمام چیزیں اس کے خلاف جا رہی ہیں زہر کا پیالہ پی کر خودکشی کر لی۔ اب جس طرح سے بھی ہوا ہو بہر حال اس کی بیماری مہلک ثابت ہوئی اور ایتھنز کے چھوڑنے کے چند ماہ بعد ارسطو تنہائی کے عالم میں ۳۲۲ ق م میں انتقال کر گیا۔

اسی سال اور اسی عمر میں یعنے ۶۲ سال میں ڈیماس تھینیز نے جو سکندر کا سب سے بڑا دشمن تھا زہر پیا۔ بارہ مہینے کے عرصے میں یونان نے اپنا سب سے بڑا فرمانروا سب سے بڑا خطیب اور سب سے بڑا فلسفی کھو دیا۔ یونان کی شوکت دھندلی پڑ کر رومی سورج کی صبح بن گئی۔ لیکن رومی شوکت قوت کی نمائش تھی نہ کہ فکر کی روشنی۔ پھر وہ شوکت بھی دھندلی پڑ گئی اور وہ تھوڑی سی روشنی بھی قطعاً بجھ گئی۔ ایک ہزار برس تک یورپ پر تاریکی کا دور دورہ رہا۔ تمام عالم فلسفے کے پھر تازہ ہونے کا منتظر تھا۔

باب ۳

فرینسس بیکن

ارسطو سے احیائے علمی تک

جب اسپارٹا نے پانچویں صدی ق م کے ختم کے قریب ایتھنز کی ناکہ بندی کی اور اس کو شکست دی، تو سیاسی فوقیت یونانی فلسفے اور صناعت کی ماں سے نکل گئی اور ایتھنز کی ذہن کی طاقت اور خود مختاری زوال میں آگئی جب سقراط کو سزائے موت دی گئی تو ایتھنز کی روح کا اسی کے ساتھ کام تمام ہو گیا اور اس کے شاگرد رشید فلاطون ہی میں کسی حد تک باقی رہی اور جب فلپ شاہ مقدونیہ نے اہل ایتھنز کو کردنیا میں ۳۳۸ ق م میں شکست دی اور اس کے تین سال بعد سکندر نے تھیبز کے عظیم الشان شہر کو جلا کر زمین کے برابر کر دیا تو بظاہر پینڈر کے گھر کا چھوڑ دینا بھی اس واقعے کو نہ چھپا سکا ایتھنز کی خود مختاری، حکومت اور فکر میں، ہمیشہ کے لیے برباد ہو گئی ہے۔ فلسفۂ یونان پر مقدونی ارسطو کا استیلا اس بات کو ظاہر کر رہا تھا کہ یونان کو شمال کی زیادہ طاقت ور اور زیادہ نوجوان اقوام نے سیاسی طور پر مطیع بنا لیا ہے۔

سکندر کی موت نے (۳۲۳ ق م) اس عمل انحطاط کو اور تیز کر دیا۔ نوعمر شہنشاہ اگرچہ ارسطو کی تمام تعلیم اور تربیت کے باوجود وحشی ہی رہا مگر اس کے باوجود اس نے یونان کی بلند شائستگی کا ادب کرنا سیکھ لیا تھا، اور اس کا خیال تھا کہ اس تہذیب اور شائستگی کو اپنی فتح مند فوجوں کے ذریعے سے

مشرق میں پھیلائے۔ یونانی تجارت کی ترقی اور کل ایشیائے کوچک میں یونانی تجارتی چوکیوں کی افراط نے، یونانی سلطنت کی ایک حصے کی حیثیت سے اس علاقے کے اتحاد کے لیے ایک معاشی بنیاد فراہم کردی تھی۔ اور سکندر کو امید تھی کہ ان معروف مقامات سے یونانی فکر اور یونانی اشیائے تجارت دنیا میں پھیلیں گے، اور اس پر قبضہ کریں گی۔ مگر اس نے مشرقی ذہن کے جمود اور اس کی قوت
مزاحمت کا صحیح اندازہ نہ کیا تھا، اور نہ مشرقی شائستگی کے حجم اور گہرائی کا۔ یہ ۱۰۸
صرف ایک نوجوان کا خیال تھا، اور یہ فرض کرنا کہ ایسی خام اور غیر مستحکم تہذیب جیسی کہ یونانیوں کی تھی، ایک ایسے تمدن پر مسلط کی جا سکتی ہے، جو اس سے کہیں زیادہ عالم گیر ہے، اور جس کی جڑیں نہایت ہی قابل احترام روایات کی اندر ہیں، محض نادانی تھی۔ خود سکندر اپنی کامرانی کے وقت مشرق کی روح سے مغلوب ہو گیا تھا اس نے (متعدد خواتین میں سے) دارا کی بیٹی سے شادی کی تھی، اس نے ایرانی تاج اور درباری لباس اختیار کر لیا تھا۔ اس نے یورپ میں بادشاہوں کے الٰہی حق کے تصور کو رواج دیا، اور آخر کار اس نے ارتیابی یونان کو یہ اعلان کر کے متحیر کر دیا، کہ وہ خدا ہے۔ یونان نے مذاق اڑایا اور سکندر نے شراب خواری کی کثرت سے اپنا خاتمہ کر لیا۔

ایشیائی روح کے استاد یونان کے تھکے ہوئے جسم میں اس لطیف داخلے کے بعد یونان میں انھیں راستوں کے ذریعے سے جو نوجوان فاتح نے کھولے تھے مشرقی مذاہب اور ادیان کا سلسلہ آنا شروع ہو گیا۔ بند کے ٹوٹنے کی بنا پر مشرقی فکر کا سمندر ہنوز غیر پختہ یورپی ذہن کی پست زمینوں پر بہ آیا۔ تصوفی اور وہمی مذاہب جنھوں نے یونان کے غریب لوگوں میں جڑ پکڑ لی تھی ان کو تقویت پہنچی، اور وہ پھیلے اور صبر و رضا کے مشرقی جذبے نے انحطاط پذیر اور مایوس یونان میں ایک تیار زمین پائی۔ ایتھنز میں رواقی فلسفے کا رواج فینقی تاجر زینو کے ذریعے سے (تقریباً ۳۱۰ ق م میں) مشرقی درآمد کے حجم غفیر میں سے ایک تھا۔ رواقیت اور ابیقوریت —— یعنی شکست کو صبر کے ساتھ قبول کر لینا اور شکست کو لذت کے آغوش میں فراموش کر دینا

——— ایسے نظریے تھے جن کے مطابق انسان مطیع اور غلام ہو کر بھی خوش رہ سکتا ہے۔ ٹھیک جس طرح سے قنوطی مشرقی رواقیت شوپنہائیر کی اور مایوس ابیقوریت رینان کی انیسویں صدی میں ایک شکستہ انقلاب اور شکستہ فرانس کی علامات تھیں۔ یہ نہیں تھا کہ اخلاقیاتی نظریے کے یہ قدرتی تقابل جدید یونان کے لیے بالکل نئے ہوں۔ یہ افسردہ فلسفی ہرقلیطوس میں اور ضاحک فلسفی دیماقریطوس میں بھی ملتے ہیں۔ سقراط کے شاگرد کلبیہ اور سیرینیہ میں انٹستھینیز اور ارسٹی پس کی قیادت میں منقسم ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، اور ایک گروہ غیر حساسی اور دوسرا مسرت کی تعریف کرتا نظر آتا ہے۔ مگر اس وقت بھی یہ طرق فکر جیسے خارجی تھے۔ فرمانروائے ایتھنز نے ان کی طرف کوئی خاص توجہ نہ کی تھی۔ مگر جب یونان کیرونیا کو خون میں اور تھیبز کو راکھ میں منتقل ہوتا ہوا دیکھ چکا، تو اس نے دیوجانس کی بات سنی، اور جب ایتھنز سے شوکت رخصت ہو چکی، تو وہ زینو اور ابیقورس کے لیے بالکل تیار تھا۔ ۱۰۹

زینو نے اپنا فلسفۂ بے پروائی ایسی جبریت پر قائم کیا تھا جس کو بعد کے رواقی کرائیپس نے مشرقی مقدریت سے تمیز کرنا دشوار پایا۔ جب زینو جو کہ غلامی کا قائل نہ تھا، اپنے غلام کو کسی قصور کی بنا پر مار رہا تھا، تو غلام نے اپنے قصور کو کم کرنے کے لیے یہ عذر پیش کیا کہ آقا کے فلسفے کی رو سے ابدالآباد سے اس کی قسمت میں یہ قصور مقدر ہو چکا تھا، جس کا زینو نے عارفانہ سنجیدگی کے ساتھ یہ جواب دیا، کہ اسی فلسفے کی رو سے اس کی یعنی زینو کی قسمت میں اس کے لیے اس کو مارنا مقدر ہو چکا تھا۔ جس طرح سے شوپنہائیر انفرادی ارادے کے لیے کلی ارادے کے خلاف لڑنے کو بیکار خیال کیا کرتا تھا اسی طرح سے رواقی یہ استدلال کرتا تھا ۱۰ ایسی زندگی کے متعلق جس میں تنازع بلقا کے لیے لازمی شکست مقدر ہو چکی ہے، فلسفیانہ بے اعتنائی ہی ایک معقول روش ہے۔ اگر فتح بالکل ناممکن ہو تو اس سے نفرت کرنی چاہیئے۔ سکون خاطر کا راز یہ نہیں ہے، کہ ہم اپنی کامیابیوں کو اپنی خواہشوں کے برابر کر لیں، بلکہ یہ ہے کہ ہم اپنی خواہشوں کو اپنی کامیابیوں کی سطح پر لے آئیں۔ رومی رواقی

سینیکا (انتقال ۶۵ء) نے کہا ہے کہ جو کچھ تم رکھتے ہو اگر وہ تمھیں ناکافی معلوم ہو تو تمھارے قبضے میں اگر دنیا بھی ہو گی تو بھی تم زبون حال رہو گے۔

اس قسم کا اصول آسمان سے اپنا مخالف طلب کر رہا تھا، اور ابیقورس نے جو اگرچہ خود زندگی میں ایسا ہی رواقی تھا جیسا کہ زینو اس کو فراہم کر دیا۔ فبنی لانگ کہتا ہے، کہ ابیقورس نے ایک خوبصورت باغ خریدا تھا جس میں وہ خود کاشت کرتا تھا۔ اس میں اس نے اپنا مدرسہ قائم کیا۔ اس میں وہ ایک شریفانہ اور خوشگوار زندگی اپنے شاگردوں کے ساتھ بسر کرتا تھا جن کو وہ ٹہلتے ہوئے اور کام کرتے ہوئے تعلیم دیتا تھا......... وہ سب آدمیوں سے نرمی اور خوش اخلاقی سے پیش آتا تھا.......... اس کا خیال یہ تھا کہ انسان کے مشغول ہونے کے لیے فلسفے سے شریف تر کوئی مشغلہ نہیں ہے۔ ۱۱۴

اس کا نقطۂ آغاز یہ یقین ہے کہ بے پروائی و بے حسی ناممکن ہے، اور لذت ـــــ اگرچہ لازمی طور پر شہوانی لذت نہیں ـــــ ہی صرف ایک ایسی غایت ہے جو زندگی اور عمل کے لیے بالکل جائز معلوم ہوتی ہے۔ فطرت ہر عضویے کو اس طرف لے جاتی ہے کہ وہ اپنی خیر کو اور تمام خیروں پر ترجیح دے ـــــ رواقی بھی ترک لذات میں ایک لطیف لذت پاتا ہے۔ ہمیں لذتوں سے بچنا نہیں چاہیے، بلکہ لذتوں میں انتخاب کرنا چاہیے۔ پس ابیقورس ابیقوری نہیں ہے وہ حس کی لذتوں پر عقل کی لذتوں کو ترجیح دیتا ہے، وہ ایسی لذتوں کے خلاف متنبہ کرتا ہے، جو روح میں بجائے سکون و اطمینان پیدا کرنے کے ہیجان اور اختلال پیدا کرتی ہیں۔ آخر میں وہ لذت کو اس کے معمولی معنے میں تلاش کرنے کی تجویز نہیں کرتا، بلکہ اطمینان طمانیت سکون قلب کو لذت قرار دیتا ہے جو سب کے سب زینو کی غیر حاسی کے کنارے تک پہنچ جاتے ہیں۔

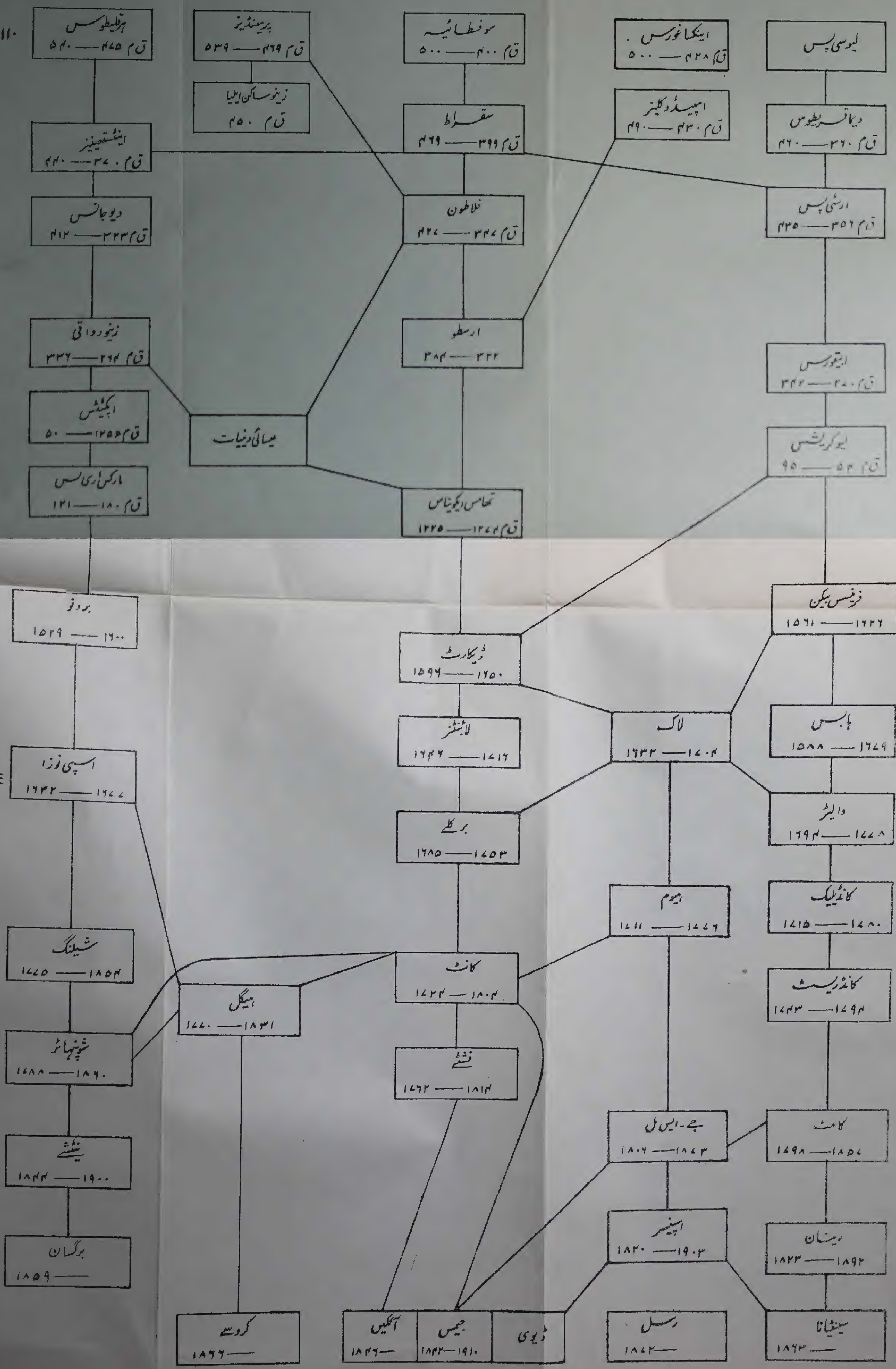
رومی جو ۱۴۶ سنہ ق م میں یونان کو لوٹنے کے لیے آئے، تو انھوں نے ان مخالف مذہبوں کو فلسفیانہ میدان کو تقسیم کرتے ہوئے پایا، اور چونکہ خود ان کو فلسفے کے لیے نہ اس قدر فرصت تھی، اور نہ ان کے ذہن میں اس قدر

ذکاوت تھی، اس لیے وہ ان فلسفوں کو اپنے اور اموال غنیمت کے ساتھ روم لے
آئے۔ بڑے منتظم اور فرمانروا ابھی رواقی انداز خیال کی طرف اسی طرح سے
مائل ہیں، جس قدر کہ غلام۔ اگر کوئی شخص حساس ہو تو اس کے لیے آقا اور خادم
دونوں بننا دشوار ہوتا ہے۔ اس لیے روم میں جتنا کچھ فلسفہ تھا، وہ زیادہ تر
زینو کے مذہب کا تھا، خواہ وہ مارکس آریلیس شہنشاہ میں ہو یا اپکٹیٹس غلام
میں۔ حتیٰ کہ لیوکریشیس بھی ابیقوریت کی گفتگو رواقی انداز میں کرتا تھا
(ہاسنٹے کے انگریز کی طرح سے، جو لذتوں سے افسردگی کے ساتھ بہرہ مند ہوتا تھا)
اور اس نے اپنے لذت کے صحیفۂ درشت کو خودکشی کر کے ختم کیا۔ اس کا عمدہ
رزمیہ "ماہیت اشیا پر"[1] لذت کو خفیف تحریف کے ساتھ مردود قرار دینے میں
ابیقورس کی تقلید کرتا ہے۔ وہ تقریباً سیزر اور پامپی کا ہم عصر ہے اور
اس نے اپنی زندگی ہنگاموں اور پریشانیوں میں گزاری ہے۔ اس کا
پریشان قلم ہمیشہ امن اور اطمینان کے لیے دعائیں مانگتا رہتا ہے۔ اس کی
نسبت یہ خیال ہوتا ہے کہ ایک ڈرپوک روح ہے، جس کی نوجوانی مذہبی
اندیشوں سے تاریک ہو گئی ہے، کیونکہ وہ یہ کہے چلا جاتا ہے، کہ اس دنیا
کے سوا دوزخ اور کہیں نہیں، اور دیوتا شریف و نیک نفس دیوتاؤں
کے علاوہ نہیں ہیں، جو ابیقورس کے باغ میں بادلوں کے اندر رہتے ہیں، اور
انسانوں کے معاملات میں کبھی مداخلت نہیں کرتے۔ اہل روم کے مابین جنت
۱۱۳ و دوزخ کے بڑھتے ہوئے عقیدے کے مقابلے میں وہ ایک شدید
قسم کی مادیت لاتا ہے۔ روح اور ذہن نے جسم سے ترقی کی ہے، وہ
اس کے نمو کے ساتھ بڑھتے ہیں، اس کی بیماری کے ساتھ بیمار ہوتے ہیں
اور اس کی موت کے ساتھ مرتے ہیں۔ سالمات مکان اور قانون کے سوائے
کسی شے کا وجود نہیں ہے۔ قانون قوانین ارتقا اور انحطاط ہے جو ہر جگہ جاری ہے۔

---

[1]۔ پروفیسر شاٹ ویل کہتے ہیں کہ یہ کتاب قدیم ادبیات میں بس حیرت انگیز چیز ہے (مقدمۂ تاریخ تاریخ)۔

فلسفیانہ ربط کی جدول (درمیان صفحات ۱۳۴ و ۱۳۵)



کوئی شے ساکن نہیں بلکہ تمام چیزیں جاری ہیں ہر ٹکڑا دوسرے ٹکڑے سے چمٹا ہوا ہے۔ اس طرح پر اشیا نمو پاتی ہیں، یہاں تک کہ ہم ان کو جانتے ہیں اور ان کو ایک نام سے موسوم کر دیتے ہیں، لیکن رفتہ رفتہ وہ تحلیل ہو جاتی ہیں اور وہ چیزیں باقی نہیں رہتیں جن کو ہم جانتے تھے۔

تیز یا سست گرنے والے سالمات کے گرنے سے میں سورج کو

ایک کرا بنتا ہوا دیکھتا ہوں، میں دیکھتا ہوں کہ نظامات اپنی صورتوں کو

بلند کرتے ہیں مگر نظام اور ان کے سورج بھی آہستہ آہستہ ابدی بہاؤ

کے ساتھ واپس جائیں گے۔

اے زمین تو بھی اپنی سلطنتوں زمینوں اور سمندروں کے

ساتھ مع اپنے ستاروں اور عقود کے۔

انھی کی طرح بنی ہے۔ اور انھی کی طرح تو بھی جائے گی

اور ساعت بہ ساعت جا رہی ہے۔

کسی شے کو قرار نہیں ہے۔ تیرے سمندر لطیف دھند کے

اندر چلے جاتے ہیں اور وہ چمکتی ہوئی ریت اپنی جگہ چھوڑ رہی ہے۔

اور جہاں وہ ہیں دوسرے سمندر اپنی باری پہ اپنی سفیدی کی

درانتیوں سے دوسری خلیجوں کو کاٹیں گے[۵۱]

ہیئتی ارتقا اور تحلیل پر انواع کی پیدائش و فنا کا اور اضافہ کرلو۔ قدیم زمانے کی زمین نے بہت سی عجیب الخلقت چیزیں بھی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے عجیب چیزوں اور عجیب اعضا والی چیزیں .... بعض بغیر پاؤں کی بعض بغیر ہاتھوں کی بعض بغیر آنکھوں کی بعض بغیر منہ کی .... اس قسم کے ہر عجیب الخلقت زمین پیدا کرنے کی کوشش کرے گی مگر بیکار کیونکہ فطرت نے ان کی افزائش پر ممانعت عائد کر دی ہے۔ وہ عمر کے دل خواہ پھول تک نہیں پہنچ سکے۔ نہ ان کو غذا مل سکی اور نہ ازدواج میں متحد ہو سکے ....

۵۱۔ لیوکریشس حیات و موت پر۔

پس زندہ چیزوں کی بہت سی نسلیں توالد و تناسل نہ ہونے اور اپنی نسل کے سلسلے کو جاری نہ رکھ سکنے کی بنا پر فنا ہو گئی ہوں گی۔ کیونکہ ان تمام چیزوں میں جن کو تم زندگی کا سانس لیتے ہوئے محسوس کرتے ہو، ابتدائے آفرینش سے نسل مکاری شجاعت یا رفتار کی بنا پر محفوظ رہی ہے ۱۱۴
جن کو فطرت نے ان صفات میں سے کوئی صفت بھی عطا نہیں کی، وہ دوسروں کا شکار اور دوسروں کی ملکیت بن جاتے ہیں، یہاں تک فطرت ان کی جنس کو ختم کر دیتی ہے۔

اقوام بھی افراد کی طرح سے آہستہ آہستہ بڑھتی ہیں اور یقیناً فنا ہو جاتی ہیں۔ بعض قومیں ترقی کرتی ہیں۔ بعض تنزل کرتی ہیں، اور تھوڑی سی مدت میں زندہ چیزوں کی نسلیں بدل جاتی ہیں، اور دوڑنے والوں کی طرح سے فانوس حیات دوسروں کے حوالے کر دیتی ہیں۔ جنگ اور ناگزیر موت کے ہوتے ہوئے سکون خاطر کے علاوہ (یعنے تمام چیزوں پر سکون قلب کے ساتھ نظر ڈالنے کے سوا) کسی شے میں حکمت و دانائی نہیں ہے۔ یہاں پر صاف ظاہر ہے کہ قدیم جاہلیت کی زندگی کی خوشی رخصت ہو چکی ہے، اور تقریباً ایک خارجی روح شکستہ بربط کو مضراب سے چھیڑ رہی ہے۔ تاریخ (جو اگر پر مسخر نہ ہو تو کچھ بھی نہ ہو) نے اتنی ستم ظریفی کبھی نہ کی ہو گی کہ اس پرہیزگار اور رزمی قنوطی کو ابیقوری کے نام سے موسوم کر دیا۔

اگر ابیقورس کے متبع کا یہ جذبہ ہے، آرمی لس یا اپکٹیٹس جیسے صریح رواقیوں کی ولولہ انگیز رجائیت کا اندازہ کرلو غلام کے بیانات (Dissertations) سے شہنشاہ کے مراقبات (Meditations) کے علاوہ اور کوئی چیز مضمحل کن نہیں ہے۔ یہ کوشش نہ کرو کہ اشیا اس طرح سے واقع ہوں جس طرح سے ہم ان کو پسند کریں بلکہ اس طرح سے پسند کرو جس طرح سے وہ ہوتی ہیں اس وقت تم خوش حالی کے ساتھ زندگی بسر کر سکتے ہو۔ اس میں شبہہ نہیں کہ اس طریق پر انسان مستقبل پر حکومت کر سکتا ہے اور کائنات کا بادشاہ ہو سکتا ہے کہتے ہیں اپکٹیٹس کا آقا جو اس کے ساتھ ہمیشہ بے رحمی سے پیش آیا کرتا تھا

ایک روز وقت گزارنے کے لیے اپکٹیٹس کی ٹانگ موڑنے لگا۔ اپکٹیٹس نے
سنجیدگی سے کہا کہ اگر آپ اسی طرح سے موڑتے رہے تو میری ٹانگ ٹوٹ
جائے گی۔ آقا ٹانگ کو موڑے گیا اور ٹانگ ٹوٹ گئی۔ اپکٹیٹس نے نرمی سے
کہا کہ کیا میں نے آپ سے نہ کہا تھا کہ اس طرح سے میری ٹانگ ٹوٹ جائے گی۔
تاہم اس فلسفے میں ایک قسم کی صوفیانہ شرافت ہے، جیسی کہ کسی ڈوسٹوڈ کی
سکون پرست کی خاموش شجاعت میں ہوسکتی ہے۔ کسی حالت میں بھی میری
کوئی ایسی چیز نہیں کھوئی ہے جو مجھ کو واپس نہ ہوئی ہو۔ کیا تیرا بچہ مرگیا ۱۱۵
ہے۔ یہ واپس ہوگیا ہے۔ کیا تیری بیوی مرگئی ہے ـــ وہ واپس ہوگئی ہے۔
کیا تو اپنی جائداد سے محروم ہوگیا ہے ـــ کیا یہ بھی واپس نہیں ہوئی ہے۔
ایسی عبارتوں میں ہم عیسائیت اور اس کے نڈر شہیدوں کی مشابہت
محسوس کرتے ہیں۔ کیا ترک نفس کی عیسائی اخلاقیات اور عیسائی سیاسی
نصب العین انسان کی تقریباً اشتراکی برادری کا اور عیسائی عقیدۂ قیامت
کل دنیا کے آخر کار جل جانے کا رواقی تعلیم کے ٹکڑے نہیں ہیں جو دریائے فکر
میں رواں تھے۔ اپکٹیٹس میں یونانی روح نے اپنی جاہلیت کھودی ہے یہ
ایک نئے دین کے لیے تیار ہے۔ اس کی کتاب کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ ابتدائی
عیسوی کلیسا نے اس کو مذہبی نصاب بنایا۔ ان بیانات سے اور آریلس کے
مراقبات سے تقلید مسیح تک صرف ایک قدم رہ جاتا ہے۔

اس اثنا میں تاریخی پس منظر جدید تر مناظر میں تحلیل ہو رہا تھا۔
لیوکریشیس میں ایک قابل غور عبارت ہے جو رومی سلطنت میں زراعت کے
انحطاط کو بیان کرتی ہے اور اس کو زمین کے کمزور پڑ جانے سے منسوب کرتی
ہے۔ سبب جو بھی کچھ ہو روم کی دولت افلاس میں تنظیم انتشار میں قوت و
غرور زوال اور غیر حساسی میں بدل گیا۔ شہر غیر ممیز بندروں میں بدل گئے۔
سڑکوں سے بے پروائی برتی گئی اور ان پر تجارت کا شور نہ رہا۔ تعلیم یافتہ
رومیوں کے چھوٹے چھوٹے خاندان طاقتور اور غیر تربیت یافتہ جرمن نسلوں
سے دب گئے، جو سال بہ سال سرحد پار سے آتی تھیں۔ جاہلیت کی تہذیب نے

مشرقی مذاہب کے سامنے سر تسلیم خم کیا اور تقریباً غیر محسوس طور پر سلطنت پاپائیت میں منتقل ہو گئی۔

کلیسا جس کو ابتدائی صدیوں میں شہنشاہوں کی امداد حاصل تھی اور جن کی قوت کو یہ رفتہ رفتہ جذب کرتا گیا نہایت تیزی سے تعداد دولت اور حلقۂ اثر میں بڑھا۔ تیرھویں صدی تک یہ یورپ کی ایک تہائی سرزمین کا مالک تھا اور اس کے خزانے امیر و غریب کے عطیات سے معمور تھے۔ ایک ہزار برس تک اس نے غیر متغیر مذہب کے افسوں سے براعظم یورپ کی اکثر اقوام کو متحد رکھا۔ اس سے پہلے یا اس کے بعد کبھی کوئی تنظیم اس قدر وسیع اور پر امن نہیں ہوئی ہے۔ لیکن اس اتحاد کے لیے جیسا کہ کلیسا خیال کرتا تھا ایک عام مذہب کی ضرورت تھی جو فوق الفطرت موجبات سے اس درجہ بلند ہو کہ زمانے کے تغیرات اور ١١٦ تصادمات سے بالاتر ہو جائے۔ اس لیے متعین اور مقرر اعتقاد قرون وسطیٰ کے یورپ کے نوجوان ذہن پر ایک چھلکے کی طرح سے منڈھ دیا گیا۔ اسی چھلکے کے اندر مدرسی فلسفہ تنگی کے ساتھ مذہب سے عقل کی طرف اور عقل سے مذہب کی طرف بغیر جانچے ہوئے مسلمات اور مقررہ نتائج کے پریشان کن دور میں حرکت کرتا تھا۔ تیرھویں صدی میں تمام عالم عیسوی ارسطو کے عربی اور یہودی تراجم سے چونک پڑا اور اس میں تحریک پیدا ہوئی لیکن کلیسا کی قوت ابھی اتنی تھی کہ تھامس اکوینس اور دوسروں کے ذریعے سے ارسطو کو قرون وسطیٰ کے ایک فقیہہ میں منتقل کر دیا گیا۔ اس کا نتیجہ لطافت تو ہوا مگر حکمت نہ ہوا۔ جیسا کہ بیکن کہتا ہے کہ انسان کی عقل اور اس کا ذہن اگر کسی معاملے پر کام کرتا ہے تو مواد کے مطابق کام کرتا ہے اور اسی سے محدود ہوتا ہے لیکن اگر یہ اپنے آپ پر عمل کرے جس طرح سے کہ مکڑی اپنا جالا تنتی ہے تو پھر اس کی کوئی انتہا نہیں ہوتی اور اس سے درحقیقت علم کے جالے پیدا ہوتے ہیں جو اپنے تاگے کی باریکی اور صنعت کے اعتبار سے قابل تعریف ہوتے ہیں لیکن ان سے حاصل یا فائدہ کچھ نہیں ہوتا۔ جلد یا بہ دیر یورپ کی عقل اس کے چھلکے میں سے باہر نکل آئے گی۔

ایک ہزار برس کی کاشت کے بعد زمین پھر شگفتہ ہو گئی اشیا کی اس قدر افراط
ہوئی کہ یہ بچنے لگیں اور انھوں نے تجارت پر مجبور کیا اور تجارت نے اپنے چوراہوں
پر پھر بڑے شہر تعمیر کیے جہاں کہ انسان تہذیب کی پرورش اور تمدن کی تعمیر
کے لیے اتحاد عمل کر سکتے تھے۔ صلیبی لڑائیوں نے مشرق کے راستے کھولے اور
تعیشات اور بدعات کا ایسا دریا امنڈ آیا جس نے مرتاضیت اور اعتقاد کا خاتمہ
کر دیا۔ کاغذ اب مصر سے ارزاں آتا تھا جس نے قیمتی دفتی کی جگہ لے لی تھی جس کی
بدولت علم صرف پادریوں کا ادارہ بن گیا تھا۔ طباعت جو عرصے سے ایک
ارزاں واسطے کا انتظار کر رہی تھی ایک گولے کی طرح سے پھٹ پڑی اور
اس نے اپنے تباہ کن اور صاف کن اثرات ہر طرف پھیلائے۔ بہادر ملاحوں نے
قطب نماؤں سے مسلح ہو کر اب سمندر کے ویرانے میں نکلنے کی جرات کی اور
زمین کے متعلق انسان کی ناواقفیت کو مغلوب کیا۔ صابر مشاہدین نے دوربینوں
سے مسلح ہو کر اعتقاد کی حدود سے باہر نکلنے کی جرات کی اور آسمان کے متعلق
انسان کی لاعلمی پر غلبہ پایا۔ کہیں کہیں یونیورسٹیوں خانقاہوں اور الگ تھلگ 117
مقامات میں انسانوں نے بحث و مباحثہ ترک کیا اور تلاش کرنے لگے۔ ادنی
دھات کو سونے میں بدلنے کی کوشش بھٹک کر ہوسی سے کیمیا میں منتقل ہو گئی نجوم
سے انسانوں نے ٹٹولتے ہوئے ہیئت کا راستہ پا لیا اور بولتے ہوئے
جانوروں کی کہانیوں سے حیاتیات عالم وجود میں آ گئی۔ بیداری روجر بیکن سے
شروع ہوئی (انتقال ۱۲۹۴ء) اور غیر محدود لیونارڈو کے ساتھ (۱۴۵۲-
۱۵۱۹) اس نے ترقی کی' کاپرنیکس (۱۴۷۳-۱۵۴۳) اور گیلیلو
(۱۵۶۴-۱۶۴۲) کی ہیئت میں گلبرٹ کی (۱۵۴۴-۱۶۳۰) مقناطیسیت
اور برق و سالیس (۱۵۱۴-۱۵۶۴) کی تشریح اور ہاروے (۱۵۷۸-۱۶۵۷)
کی دوران خون کی تحقیق میں تکمیل کو پہنچی۔ جیسے جیسے علم نے ترقی کی' خوف
گھٹتا گیا' انسانوں نے غیر معلوم کی پرستش کرنے کا خیال کم' اور اس پر
غالب آنے کا خیال زیادہ کیا۔ ہر جاندار روح کو ایک نئے اعتماد کے ساتھ
اٹھایا گیا۔ رکاوٹیں دور کی گئیں اور اب انسان کے عمل کی کوئی حد نہ تھی۔

"لیکن ہمارے زمانے کو یہ خوشی حاصل ہے، کہ چھوٹے چھوٹے جہاز آسمانی اجسام کی طرح سے کل کرے کے گرد گھومیں"۔ یہ زمانہ وہ ہے جب کہ ہم نصب العین (Plus ultra) ۔ "اور آگے" کو بنالیں حالانکہ قدما کا نصب العین (Non plus Ultra) (اور آگے مت جاؤ) تھا[1]۔ یہ اکتساب امید اور قوت کا عہد تھا، اور ہر میدان میں نئی ابتداؤں اور ہمت آزمائیوں کا زمانہ تھا، ایسا زمانہ جس کو اپنے جذبات کے جمع کرنے اور فیصلہ کرنے کے لیے کسی ترکیبی روح کی ضرورت تھی — یہ فرینسس تھا جو دور جدید کا سب سے طاقتور ذہن ہے، جس نے گھنٹی بجائی اور اہل عقل کو اکٹھا کیا، اور اعلان کردیا کہ یورپ بلوغ کو پہنچ چکا ہے۔

ف ۲ ـ فرینسس بیکن کی سیاسی زندگی

بیکن ۲۲ جنوری ۱۵۶۱ء کو یارک ہاؤس لندن میں اپنے باپ سر نکولس بیکن کے مکان پر پیدا ہوا، جو عہد ایلزبیتھ کے ابتدائی بیس سال میں مہر کبیر کے محافظ
کے عہدے پر سرفراز رہا۔ میکالے کہتا ہے کہ بیٹے کی شہرت سے باپ کی شہرت ۱۱
ماند پڑگئی۔ لیکن سر نکولس بھی کوئی معمولی آدمی نہ تھا۔ معاملہ ایسا ہی ہے جیسا کہ شبہ ہوسکتا تھا۔ کیونکہ طباع انسان ایک چوٹی کے بمنزلہ ہوتا ہے، جس تک ایک خاندان ذہانت کے واسطے سے پہنچتا ہے، اور طباع کی اولاد کی ذہانت کے واسطے سے اوسط درجے کے انسانوں میں مل جاتا ہے۔ بیکن کی ماں لیڈی این کوک سر ولیم سیسل لارڈ برگلے کی سالی تھی، جو ایلزبیتھ کا لارڈ ٹریژرر (افسر خزانہ) اور انگلستان میں نہایت ہی با اثر لوگوں میں سے تھا۔ اس کا باپ شاہ ایڈورڈ ششم کا صدر اتالیق تھا۔ خود وہ ماہر السنہ اور فقیہہ تھی اور

[1] بیکن ۔ ترقی علم ۔ کتاب ۲ باب ۱ ۔ قرون وسطیٰ میں جہاز جبل الطارق سے بحیرۂ روم میں واپس چلے جاتے تھے، اور ان پر یہ کتبہ آویزاں رہتا تھا کہ آگے مت جاؤ۔

استغوں سے یونانی میں خط و کتابت کرنے کو ایک معمولی بات سمجھتی تھی وہ اپنے بیٹے کی خود معلمہ بنی اور اس کی تعلیم میں بے دریغ محنت کی۔

مگر بیکن کی عظمت کا اصل پرورش کرنے والا ایلزبیتھ کے عہد کا انگلستان تھا، یعنے جدید اقوام میں سب سے طاقتور قوم کا سب سے بڑا عہد۔ امریکہ کے انکشاف نے تجارت کو بحیرۂ روم کی جانب سے بحراوقیانوس کی جانب منتقل کردیا تھا، اور اس نے بحراوقیانوس کی اقوام یعنے اسپین فرانس ہالینڈ اور انگلستان کو وہ تجارتی اور مالی تفوق بخش دیا تھا، جو اٹلی کو حاصل تھا، جب وہ مشرقی تجارت کے لیے نصف یورپ کا بندرگاہ بنی ہوئی تھی۔ اور اس تغیر سے نشاۃ جدیدہ فلارنس روم میلان اور وینس سے میڈرڈ پیرس ایمسٹرڈم اور لندن کو منتقل ہوگئی ۱۵۸۸ء میں اسپینی بحری قوت کی تباہی کے بعد سے انگلستان کی تجارت ہر سمندر میں پھیلی۔ اس کے شہروں میں خانگی صنعت کی زندگی پیدا ہوئی، اس کے جہاز رانوں نے کرۂ زمین کا چکر کیا، اور اس کے کپتانوں نے امریکہ حاصل کرلیا۔ اس کے ادب میں اسپنسر کی شاعری اور سڈنی کی نثر کے پھول کھلے اور اس کے تماشاگاہوں میں شیکسپیر مارلو بین جانسن کے تمثیلوں نے لرزش پیدا کی۔ ایسے زمانے اور ایسے ملک میں اگر کسی شخص میں عظمت کا تخم ہو تو وہ پھولے پھلے بغیر نہیں رہ سکتا۔

بارہ سال کی عمر میں بیکن کو ٹرنٹی کالج کیمبرج بھیجا گیا۔ وہاں پر وہ تین سال
رہا، اور اس کے نصابوں اور قواعد وضوابط سے سخت نافر ہو کر چھوڑ دیا۔ اس کو 119
ارسطو کے مذہب سے خاص طور پر عداوت ہوگئی تھی، اور اس نے یہ تہیہ کرلیا تھا کہ فلسفے کو زیادہ زرخیز راستے پر لگائے گا، اور اس کا رخ مدرسی حجت سے روشنی اور انسانی خیر کے اضافے کی طرف پھیرے گا۔ اس وقت اس کی عمر اگرچہ سولہ ہی سال تھی مگر اس کو انگریزی سفیر فرانس کے عملے میں ایک جگہ پیش کی گئی اور نشیب وفراز پر کافی غور کرکے اس نے اس کو قبول کرلیا۔ اپنی کتاب (The Interpretation of Nature) (تعبیر فطرت) کے دیباچے میں وہ اس اہم فیصلے پر بحث کرتا ہے جس نے اس کا رخ فلسفے سے سیاسیات کی جانب پھیر دیا۔ یہ عبارت نہایت ہی اہم ہے۔

چونکہ مجھے یقین تھا کہ میں بنی نوع انسان کی خدمت کے لیے پیدا کیا گیا ہوں، اور عام عافیت کی نگرانی و نگہبانی کو ان فرائض میں سے سمجھتا تھا جو اجتماعی حقوق میں سے ہیں، اور جو سب کے لیے اس طرح سے کھلے ہوئے ہیں جس طرح سے پانی اور ہوا ہیں، اس لیے میں نے اپنے آپ سے سوال کیا کہ بنی نوع انسان کو سب سے زیادہ کس چیز سے فائدہ پہنچ سکتا ہے، اور میں فطرۃً کن کاموں کی انجام دہی کے لیے بنا ہوں۔ لیکن تلاش کرنے پر مجھے کوئی کام اس قدر قابل تحسین نہ ملا جس قدر کہ فنون اور ایجادات کی تحقیق و ترقی ہے جو انسان کی زندگی کے مہذب بناتے ہیں ...... سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ اگر کوئی شخص (کسی خاص ایجاد کو روشنی ہی میں لانے میں نہیں خواہ وہ کتنی ہی مفید کیوں نہ ہو بلکہ) فطرت میں ایک ایسا آفتاب روشن کرنے کے قابل ہو، جو اپنے پہلے طلوع پر موجودہ انسانی انکشافات کی حدود پر روشنی ڈالے اور پھر بلند ہونے کے بعد جہل اور لاعلمی کے ہر گوشے اور کونے کو منور کر دے تو میرے نزدیک ایسا موجد کائنات پر حکومت انسانی کو وسعت دینے والا بطل حریت انسانی، اور ان مجبوریوں کا رافع کہلانے کا مستحق ہوگا۔ جو اس وقت انسان کو پابند کئے ہوئے ہیں۔ علاوہ بریں میں نے اپنی فطرت میں حقیقت پر تدبر کرنے کی ایک خاص صلاحیت پائی۔ کیونکہ میں اس نہایت ہی اہم مقصد کے لیے کافی متغیر ذہن رکھتا تھا (میری مراد مشابہتوں کا پہچاننا ہے) اور اس کے ساتھ ہی یہ اس قدر استوار اور متوجہ ہونے کے قابل بھی تھا کہ لطیف فرق کا مشاہدہ کر سکے، مجھ میں تحقیق کا جذبہ تھا، صبر کے ساتھ اپنی رائے کے ملتوی رکھنے، بخوشی غور و فکر کرنے، احتیاط کے ساتھ قبول کرنے، غلط ارتسامات کی جلدی تصحیح کر لینے کی قوت تھی۔ مجھے جدت کی کوئی آرزو یا قدامت سے خاص لگاؤ نہ تھا۔ دھوکے کی شکل میں بھی اس سے مجھے سخت نفرت تھی۔ ان تمام اسباب کی بنا پر میرا خیال تھا کہ میری فطرت اور میرا مزاج گویا صداقت سے ایک قسم کا تعلق خاطر یا لگاؤ رکھتا ہے۔

لیکن میرا خاندان میری تربیت اور میری تعلیم سب کی سب فلسفے کی طرف نہیں بلکہ سیاسیات کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ سیاسیات تو گویا میری گھٹی میں

پڑی تھی۔ اور جیساکہ عموماً نوجوانوں کو پیش آتا ہے، میرے ارادے لوگوں کی آرا سے بھی متزلزل ہو جاتے تھے۔ میں یہ بھی خیال کرتا تھا کہ وطن کی طرف سے جو مجھ پر فرض عائد ہوتا ہے وہ بھی ایک خاص مطالبہ ہے ایسا مطالبہ جو زندگی کے دوسرے فرائض کے مقابلے میں زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ آخر میں مجھے یہ امید بھی تھی کہ اگر مجھے حکومت کی کوئی معزز خدمت مل جائے تو مجھے اس کام کی تکمیل جو میرے لیے مقدر ہو چکا تھا اعانت و امداد کا یقین ہو جائے گا۔ ان امور کو پیش نظر رکھ کر میں نے خود کو سیاسیات میں لگا دیا۔

سر نکولس بیکن کا ۱۵۷۹ء میں اچانک انتقال ہو گیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ فرینسس کے لیے ایک جائداد کا انتظام کرے۔ مگر یہ ارادہ پورا نہ ہونے پایا تھا کہ موت نے آ دبایا۔ اور نوجوان سیاسی کو بعجلت لندن طلب کیا۔ جہاں کہ اس نے اٹھارہ سال کی عمر میں اپنے آپ کو یتیم و نادار پایا۔ وہ اس زمانے کے اکثر تعیشات کا عادی ہو چکا تھا، اس لیے اس کو جبراً سادہ زندگی کا اختیار کرنا بہت شاق گزرا۔ اس نے وکالت شروع کر دی۔ اور ساتھ ہی با اثر رشتہ داروں سے اصرار کیا کہ اس کو کوئی ایسی سیاسی خدمت دلوا دیں جو اسے مالی مشکلات سے نجات دے۔ اس کے التجائی خطوط اگر ان کی تحریر کی قوت اور لطافت کا اور ان کے مصنف کی مسلمہ قابلیت کا لحاظ کیا جائے تو بہت کم نتیجہ خیز ہوئے۔ غالباً بر کلے جو حسب دل خواہ جواب دینے سے قاصر رہا اس کی وجہ یہ تھی کہ بیکن اپنی قابلیت کا کم اندازہ نہیں کرتا تھا اور بڑے درجے کی خدمت کو اپنا حق جانتا تھا اور شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ یہ خطوط مصنف کی معززہ لارڈ سے گزشتہ موجودہ اور آیندہ وفاداری کا بہت ہی زیادہ واسطہ دلاتے تھے محبت کی طرح سے سیاسیات میں بھی یہ مناسب نہیں ہے کہ انسان اپنے آپ کو بالکل سپرد کر دے، انسان کو ہمیشہ کچھ نہ کچھ دینا تو چاہیئے، مگر کسی وقت میں بھی بالکل نہیں شکر گزاری کو امید سے تقویت پہنچتی ہے۔

آخر کار بغیر اس کے کہ کوئی اس کو اوپر اٹھائے بیکن اوپر چڑھا۔ لیکن ہر قدم پر اس کے کئی برس صرف ہوئے۔ ۱۵۸۳ء میں وہ ٹانٹن کی جانب سے 121

دارالعوام میں منتخب ہوا، اور اس کے انتخاب کرنے والوں نے اس کو اس قدر پسند کیا کہ وہ ہر بار اسی کا انتخاب کرتے رہے۔ مباحثے میں اس کا انداز بیان واضح اور دلچسپ تھا، اور وہ بلا خطابت کے خطیب تھا۔ بین جانسن نے کہا ہے کہ کوئی شخص اس قدر صفائی سے اس قدر اختصار سے، اس قدر موثر طور پر کبھی نہیں بولا، اور نہ کسی شخص نے اپنی تقریر میں اتنے بامعنے الفاظ استعمال کیے۔ اس کی تقریر کا ہر ٹکڑا اپنی ایک علیحدہ شان رکھتا تھا۔ سننے والے بغیر نقصان کیے ہوئے نہ کھانس سکتے تھے اور نہ ادھر ادھر دیکھ سکتے تھے۔ جہاں کہیں وہ بولتا تھا وہ حکومت کرتا تھا .... سننے والوں کے جذبات کبھی کسی شخص کے اس درجہ قابو میں نہیں ہوتے ہیں۔ جو شخص اس کی تقریر سنتا تھا اسے یہی ڈر رہتا تھا کہ کہیں یہ ختم نہ ہو جائے۔ بلاشبہ وہ قابل رشک مقرر تھا۔

ایک با اثر دوست نے اس کے ساتھ بہت فیاضانہ سلوک کیا تھا — یہ حسین ارل آف ایسکس تھا، جس سے الزبیتھ نے ناکام محبت کی تھی اور اس طرح اس سے نفرت کرنے لگی تھی۔ ۱۵۹۵ء ایسکس نے بیکن کے لیے سیاسی خدمت کے حصول میں ناکام رہنے کی تلافی کے طور پر اس کو ٹویکن ہام میں ایک خوبصورت جائداد بطور تحفے کے دی۔ یہ ایک شاندار ہدیہ تھا جس کی بنا پر قیاس یہ چاہتا ہے کہ بیکن عمر بھر کے لیے ایسکس سے وابستہ ہو جائے گا، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ چند سال بعد ایسکس نے الزبیتھ کو قید اور تخت کے لیے اس کا جانشین انتخاب کرنے کے لیے سازش کی۔ بیکن نے اپنے محسن کو اس بغاوت کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے خط پر خط لکھے۔ اور جب ایسکس نے اصرار کیا تو بیکن نے اسے متنبہ کر دیا کہ وہ اپنی ملکہ کی وفاداری کو اپنے دوست کی شکر گزاری پر ترجیح دے گا۔ ایسکس نے کوشش کی، ناکام ہوا، اور گرفتار ہو گیا۔ بیکن نے ملکہ سے اس کی طرف سے اس قدر مسلسل وکالت کی، کہ آخر کار وہ تنگ آگئی، اور اس کو حکم دیا کہ کوئی دوسری بات کرے۔ جب ایسکس کو عارضی طور پر آزادی مل گئی، اور اس نے اپنے گرد مسلح فوج جمع کر لی، لندن میں داخل ہوا، اور اس کے باشندوں کو انقلاب پر آمادہ کرنے کی کوشش کی تو

بیکن غصے سے اس کے خلاف ہو گیا۔ اس اثنا میں اس کو ملک کے پیروی کرنے والے دفتر میں جگہ مل گئی تھی اور جب ایسکس پھر گرفتار ہوا اور اس پر بغاوت کا مقدمہ چلا تو بیکن نے اس شخص پر مقدمہ چلانے میں سرگرم حصہ لیا جو کہ اس کا دریادل دوست تھا۔ ۱۲۲

ایسکس مجرم پایا گیا، اور اس کو قتل کر دیا گیا۔ مقدمہ چلانے میں بیکن نے جو حصہ لیا تھا، اس کی وجہ سے وہ کچھ عرصے کے لیے نامقبول ہو گیا۔ اور اس وقت سے وہ ایسے دشمنوں میں گھر گیا جو اس کے تباہ کر دینے کا موقع تلاش کرتے رہتے تھے۔ اس کی بے پایاں حرص نے اسے سکون سے محروم کر دیا۔ وہ ہمیشہ غیر مطمئن رہتا تھا، اور ہمیشہ ایک برس یا زیادہ اپنی آمدنی سے آگے رہتا تھا۔ وہ اپنے اخراجات میں مسرف تھا، اس کے نزدیک نمائش سیاست کا ایک جزو تھی۔ جب پینتالیس برس کی عمر میں اس نے شادی کی تو جہیز جو کہ خاتون کی دلکشیوں میں سے ایک دلکشی تھی، اس میں شاندار اور پر تکلف رسم نے ایک بڑا رخنہ پیدا کر دیا۔ ۱۵۹۸ء میں وہ قرض کی وجہ سے گرفتار ہوا۔ اس کے باوجود وہ ترقی کرتا رہا۔ اس کی گوناگوں قابلیت اور تقریباً لامتناہی علم نے اس کو ہر اہم مجلس کا ایک قیمتی رکن بنا دیا تھا۔ رفتہ رفتہ بلند تر خدمتیں اس کے لیے کھلیں ۱۶۰۶ء میں وہ سالیسیٹر جنرل اور ۱۶۱۳ء اٹارنی جنرل بنایا گیا، اور آخر کار ۱۶۱۸ء میں ۵۷ برس کی عمر میں وہ لارڈ چانسلر بنا۔

۳۔ مضامین

اس کی ترقی سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فلاطون کا فلسفی بادشاہ کا خواب پورا ہو جائے گا۔ کیونکہ جیسے جیسے قدم بہ قدم بیکن نے سیاسی قوت میں ترقی کی اتنا ہی وہ فلسفے کی چوٹیوں پر چڑھتا چلا گیا۔ یہ یقین کرنا دشوار معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کا وسیع علم اور ادبی کمالات ایک پر شور سیاسی زندگی کے محض عوارض اور تفریحات تھے۔

اس کا مقولہ یہ تھا کہ انسان کی چھپی ہوئی زندگی ہی بہترین ہوتی ہے۔ وہ اپنے ذہن میں اس کا تصفیہ نہیں کر سکا کہ آیا وہ فکری زندگی کو زیادہ پسند کرتا ہے، یا عملی زندگی کو۔ اس کو امید یہ تھی کہ وہ سنیکا کی طرح سے فلسفی اور مدبر دونوں ہوگا
۱۲۲ اگرچہ اس بات کا شبہہ تھا کہ کہیں اس کی زندگی کا یہ دورخہ پن اس کی پہنچ کو کم اور اس کے اکتساب کو مختصر نہ کر دے۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ کہنا مشکل ہے، کہ آیا عملی زندگی کے ساتھ غور و فکر سے ذہن کو زیادہ رکاوٹ پیش آتی ہے، یا محض غور و فکر ہی میں مصروف رہنے سے۔ اس کو یہ محسوس ہوتا تھا، کہ مطالعے نہ تو بہ ذات خود مقصود ہو سکتے ہیں اور نہ حکمت کے لیے۔ اور یہ کہ وہ علم جس سے عمل نیک میں کام نہ لیا جائے، بدنما مدرسی غرور ہے۔ مطالعوں میں ضرورت سے زیادہ وقت صرف کرنا کاہلی ہے، ان کو ضرورت سے زیادہ لفظی آرائش کے لیے استعمال کرنا بناوٹ ہے، محض ان کے اصول سے رائے قائم کرنا ایک ذی علم آدمی کا مذاق ہے .... چالاک آدمی مطالعوں کو برا کہتے ہیں سادہ آدمی ان کی تعریف کرتے ہیں عقل مند آدمی ان کو استعمال کرتے ہیں، کیونکہ مطالعے خود اپنا استعمال نہیں سکھاتے، بلکہ ان کے بغیر اور ان کے علاوہ بھی ایک حکمت ہے —— جو کہ مشاہدے سے حاصل ہوتی ہے۔ یہاں پر ایک نیا سر سنائی دیتا ہے، جو مدرسیت کے ختم کی علامت ہے، یعنے علم کے استعمال اور مشاہدے سے جدا ہونے کی —— اور اس تاکید کو تجربے اور ان نتائج پر عائد کرتا ہے، جو انگریزی فلسفے کو ممیز کرتا ہے، اور نتائجیت میں ختم ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوا کہ بیکن نے ایک لمحے کے لیے کتابوں اور غور و فکر کو ترک کر دیا ہو۔ ایسے الفاظ میں جو کہ سقراط کو یاد دلاتے ہیں، وہ لکھتا ہے کہ مجھے فلسفے کے بغیر جینے کی پروا نہیں، اور وہ اپنے متعلق کہتا ہے کہ میں ایسا انسان ہوں جو اور کسی شے کی نسبت ادب کے لیے زیادہ موزوں ہے، اور مجھے مقدر نے میری ذہانت کے رجحان کے خلاف عملی زندگی میں مبتلا کر دیا گیا ہے۔ اس کی پہلی تصنیف "علم کی توضیح" (۱۵۹۲) کے نام سے موسوم ہے۔ فلسفے کے لیے اس میں جو جوش پایا جاتا ہے۔ وہ اقتباس پر مجبور کرتا ہے ——

"میری تعریف خود ذہن کے لیے مخصوص ہو گی۔ ذہن انسان ہے اور علم ذہن ہے۔ ایک انسان صرف اس حد تک انسان ہوتا ہے جس حد تک کہ وہ علم رکھتا ہے .... کیا تاثرات کی لذتیں جو اس کی لذتوں سے زیادہ نہیں ہیں، اور کیا عقل کی لذتیں تاثرات کی لذتوں سے زیادہ نہیں ہیں۔ کیا صرف وہ ہی سچی اور قدرتی لذت نہیں ہوتی، جس سے کہ طبیعت سیر نہ ہو۔ کیا صرف وہ چیز علم نہیں ہے، جو ذہن کو ہر قسم کی گڑبڑ سے نجات دے۔ کتنی چیزیں ایسی ہو سکتی ہیں، جن کو کہ ہم خیال کرتے ہیں، کہ وہ نہیں ہیں۔ کتنی چیزوں کی ہم اس سے زیادہ قدر کرتے ہیں، جتنی کہ وہ مستحق ہیں۔ یہ بیہودہ خیالات یہ غلط ۱۲۴
اندازے غلطی کے یہی وہ بادل ہیں جو گڑبڑوں کے طوفان میں بدل جاتے ہیں۔ پس کیا کوئی مسرت انسانی ذہن کے لیے ایسی ہے، جس کو اشیا کی گڑبڑ سے بالاتر رکھا جائے، جہاں تک کہ وہ فطرت کے نظام اور انسانوں کی غلطی کا لحاظ رکھ سکے۔ کیا صرف خوشی کا نظریہ ہے، انکشاف کا نہیں ہے، قناعت کا ہے، اور نفع کا نہیں ہے۔ کیا ہم فطرت کے گودام کے قیمتی اسباب کو اسی طرح سے نہ دیکھیں گے جس طرح سے اس کی دکان کے حسن کو دیکھتے ہیں۔ کیا صداقت بے خبر ہے کیا ہم اس سے قابل قدر نتائج جمع نہیں کر سکتے اور انسان کی زندگی کے لیے ضروری اشیا فراہم نہیں کر سکتے؟"

اس کی بہترین ادبی تصنیف مضامین (۱۵۹۷-۱۶۲۳) اس کو ہنوز ان دو محبتوں میں یعنے سیاسیات اور فلسفے کی، مبتلا ظاہر کرتی ہے۔ عزت اور شہرت کے مضمون میں وہ عزت کے تمام مدارج سیاسی اور فوجی کامیابیوں کو دیتا ہے اور ادبی یا فلسفی کامیابیوں کو کوئی درجہ نہیں دیتا۔ لیکن صداقت کے مضمون میں وہ لکھتا ہے کہ صداقت کی تحقیق جو صداقت سے محبت کرنے یا عشق رکھنے کے مرادف ہے۔ صداقت کا علم جو اس کی تعریف اور توصیف ہے، اور صداقت کا یقین، جو اس سے لذت اندوز ہونا ہے انسانی فطرتوں کی سب سے بڑی خیر ہے۔ کتابوں میں ہم عقلمند لوگوں سے اسی طرح سے بات چیت کرتے ہیں، جس طرح عملی زندگی میں احمقوں سے۔

مگر ایسا اس صورت میں ہوتا ہے، جب ہم جانتے ہیں کہ اپنے لیے کتابوں کا کس طرح سے انتخاب کریں۔ بعض کتابیں چکھنے کے لیے ہوتی ہیں بعض نگلنے کے لیے ہوتی ہیں، اور تھوڑی سی ایسی ہیں جو چبانے اور ہضم کرنے کے لیے ہوتی ہیں، اور اس میں شک نہیں کہ ان میں تمام قسموں سے روشنائی کے ان سمندروں اور سیلابوں کا بہت ہی چھوٹا حصہ بنتا ہے جن میں دنیا روزانہ نہاتی اور زہر سے متاثر ہوتی اور غرق ہوتی رہتی ہے۔

بلاشبہہ مضامین کو ان چند کتابوں میں شمار کرنا چاہئے جو چبانے اور ہضم کرنے کی مستحق ہیں۔ تمھیں اس قدر گوشت اس قدر عمدگی سے پکا اور چبا ہوا، ایسی چھوٹی سی رکابی میں شاذ و نادر ہی ملے گا۔ بیکن کو لفاظی سے نفرت ہے، وہ کبھی ایک لفظ بھی ضائع نہیں کرتا وہ ایک چھوٹی سی ترکیب میں لا محدود معنے بیان کر جاتا ہے۔ یہ مضامین صفحہ دو صفحے میں زندگی کے مسائل مہمہ کے متعلق ایک بلند ذہن کی مقطر لطافت بیان کر دیتے ہیں۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ ان مضامین کا مواد زیادہ بہتر ہے، یا طریقۂ ادا۔ کیونکہ یہاں پر نثر میں ۱۲۵ ایسی اعلیٰ درجے کی زبان ملتی ہے، جیسی کہ شیکسپیر کے یہاں نظم میں۔ یہ انداز ٹیسی ٹیس کے انداز کی طرح سے طاقتور ہے، مختصر مگر مہذب، اور اس میں شک نہیں کہ کچھ اس کا اختصار لاطینی محاورے اور ترکیب کے ہنرمندانہ ترجمے پر مبنی ہے۔ مگر استعارات کی کثرت ایلزبتھ کے دور کا پتا دیتی ہے، اور نشاۃ جدیدہ کی دقت پسندی کو ظاہر کرتی ہے۔ انگریزی ادب میں کوئی شخص اس قدر معنی خیز اور موزوں تشبیہات کا حامل نہیں ہے۔ ان کی کثرت ہی بیکن کے انداز بیان کا ایک نقص ہے۔ استعارات تشبیہات اور ایہامات ہمارے اعصاب پر چابکوں کی طرح سے پڑتے ہیں، اور آخر کار ہم کو تھکا دیتے ہیں۔ مضامین قیمتی اور ثقیل غذا کی طرح سے ہیں جس کی ایک وقت میں بڑی مقدار کو ہضم نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اگر چار یا پانچ کو ایک وقت میں لیا جائے تو وہ انگریزی زبان میں بہترین ذہنی غذا ہیں۔ اس حکمت کے نچوڑ سے ہم کیا نکال سکتے ہیں۔ شاید بہترین نقطۂ آغاز

اور قرونِ وسطیٰ کے آداب سے نہایت ہی دلچسپ انحراف، بیکن کا ابیقوری اخلاقیات کو صفائی کے ساتھ تسلیم کر لینا ہے۔ وہ فلسفی سلسلے یعنے اس چیز کو استعمال نہ کرو، جس کی تم خواہش نہ کر سکو، اور اس چیز کی خواہش نہ کرو جس سے تم ڈر نہ سکو، ایک کمزور اور شرمیلے اور ڈرپوک ذہن کی علامت معلوم ہوتا ہے۔ اور درحقیقت فلاسفہ کے اکثر نظریے بہت زیادہ مشکوک معلوم ہوتے ہیں اور وہ بنی نوع انسان کی اس سے زیادہ احتیاط کرتے ہیں، جتنی کہ فطرۃً ضروری ہے۔ اس طرح سے وہ موت کے اندیشوں کو اس کے خلاف علاجوں سے بڑھاتے ہیں کیونکہ وہ انسان کی زندگی کو محض موت کے لیے تیاری اور تربیت بنا دیتے ہیں، اس لیے ظاہر ہے کہ دشمن خوفناک معلوم ہوگا جب کہ ان مدافعتی ساز و سامان کی کوئی حد ہی نہ ہو جو کہ دشمن کے خلاف مہیا کیے جا رہے ہیں۔ صحت کے لیے رواقی مسلک یعنے خواہش کے دبانے سے زیادہ کوئی چیز مضر نہیں ہو سکتی۔ ایسی زندگی کو طول دینے سے کیا فائدہ جس کو بے حسی نے قبل از وقت موت میں بدل دیا ہو۔ اور اس کے علاوہ یہ فلسفہ ناممکن العمل ہے کیونکہ جبلت ختم ہو جائے گی۔ فطرت اکثر مخفی ہوتی ہے، بعض
۱۲۶ اوقات یہ مغلوب ہو جاتی ہے، اور بعض اوقات یہ بجھ جاتی ہے جبر فطرت کو صرف زیادہ شدت کے ساتھ جواب دینے پر آمادہ کرتا ہے۔ نظریہ سازی اور بحث و مباحثہ فطرت کی ضد کو کم کرتے ہیں، لیکن رواج ہی صرف ایک ایسی چیز ہے جو فطرت کو تبدیل اور مغلوب کر دیتا ہے ...... لیکن کسی شخص کو فطرت کے مغلوب کرنے پر بہت زیادہ بھروسا نہیں کرنا چاہیے کیونکہ فطرت عرصے تک دبی ہوئی رہے گی اور اس کے باوجود موقع یا تحریص پر تازہ ہو جاتی ہے۔ ایسپ کی لڑکی کی طرح سے جو کہ بلی سے عورت بنی تھی اور تختے کے کنارے پر شرمائی ہوئی بیٹھی تھی یہاں تک کہ ایک چوہا اس کے سامنے سے دوڑا — لہذا انسان کو یا تو موقع سے بالکل بچنا چاہیے یا اپنے آپ کو اس کے سامنے بہ کثرت لانا چاہیے تاکہ وہ اس سے متاثر نہ ہو۔ درحقیقت بیکن کا یہ خیال ہے کہ جسم کو بے اعتدالیوں اور ضبط دونوں کی عادت ہونی چاہیے ورنہ تو

بغیر ضبط کا ایک لمحہ بھی اس کو تباہ کر سکتا ہے (ایسا شخص جو کہ خالص ترین اور سب سے زیادہ زود ہضم غذا کا عادی ہو، اس کی صحت آسانی سے خراب ہو سکتی ہے جب کہ وہ بھول یا ضرورت کی وجہ سے اپنے معمول کے خلاف کرنے پر مجبور ہو) لیکن دلچسپیوں اور لذتوں کا تنوع ہونا چاہیے نہ کہ ان کی افراط۔ کیونکہ جوانی میں فطری قوت بہت سی زیادتیوں کو پیچھے ڈال دیتی ہے جو انسان کے بڑھاپے تک اس کے ذمے رہتی ہیں انسان کی پختگی اس کی جوانی کی قیمت ادا کرتی ہے صحت کے لیے ایک شاہی سڑک باغ ہے۔ بیکن کو پیدائش کے مصنف سے اس باب میں اتفاق ہے کہ خداوند عالم نے پہلے ایک باغ لگایا تھا اور والٹیر کے ساتھ اس بارے میں اتفاق ہے کہ ہم کو اپنے مکان کی پشت پر کاشت کرنی چاہیے۔

مضامین کے اخلاقی فلسفے سے عیسائیت کا نہیں بلکہ میکیولی کا مزہ آتا ہے جس کے بیکن نے بار بار ادب سے حوالے دیے۔ ہم میکیولی اور اس قسم کے مصنفین کے ممنون احسان ہیں جو کھلم کھلا اور بغیر کسی پردے کے یہ کہتے ہیں کہ انسان درحقیقت کیا کہتا ہے اور یہ نہیں کہ اس کو درحقیقت کیا کرنا چاہیے کیونکہ شرط کی نوعیت جاننے سے پہلے سانپ کی دانائی اور فاختہ کی معصومی کا جمع کرنا ناممکن ہے کیونکہ اس کے بغیر فطرت کھلی ہوئی اور بلا کسی احتیاط کے رہتی ہے۔ اٹلی والوں کے یہاں ایک ضرب المثل ہے کہ وہ اس قدر اچھا ہے کہ وہ کسی چیز کے لیے بھی اچھا نہیں، بیکن اپنی تلقین کو اپنے عمل کے مطابق کرتا ہے اور دھوکے اور دیانت کے دانشمندانہ مرکب کی نصیحت کرتا ہے کہ

۱۲ یہ ایک ایسا میل ہوگا جو زیادہ خالص مگر زیادہ نرم دھات کو زیادہ طویل عمر کے لائق بنائے گا۔ وہ ایک مکمل اور گوناگوں زندگی چاہتا ہے جس میں کہ اس کو ہر ایسی چیز سے واقفیت حاصل ہو جائے جو زہر کو زیادہ وسیع زیادہ گہرا زیادہ طاقتور یا تیز بنا سکے۔ وہ محض فکری زندگی کو پسند نہیں کرتا۔ گوئٹے کی طرح سے وہ ایسے علم سے نفرت کرتا ہے جو عمل کی طرف نہ لے جائے انسانوں کو جاننا چاہیے کہ انسانی زندگی کے تماشہ گاہ میں مشاہد بننا صرف خدا اور فرشتوں کا

کام ہے۔ اس کا مذہب حب وطن کی بنا پر بادشاہ کا سا ہے ۔۔ اگرچہ کئی بار اس پر الحاد کا الزام لگایا گیا اور اس کے فلسفے کا کل رجحان دنیاوی اور عقلی جانب ہے مگر وہ کفر کی نہایت شدت اور بظاہر مخلصانہ تردید کرتا ہے ۔ میرے لیے روایت تلمود اور القرآن کی تمام کہانیوں پر ایمان لانا سہل ہے بہ نسبت اس کے کہ میں یہ یقین کروں کہ یہ عام کائنات بغیر ذہن کے ہے .... تھوڑا سا فلسفہ ایک شخص کے ذہن کو الحاد کی طرف مائل کر دیتا ہے لیکن فلسفے کے اندر گہرا جانے سے انسانوں کا ذہن مذہب کے قریب آجاتا ہے کیونکہ جب انسان کا ذہن بکھرے ہوئے ثانوی اسباب کو دیکھتا ہے تو ممکن ہے کہ یہ انھی پر ٹھہر جائے اور آگے نہ جائے لیکن جب یہ ان کے سلسلے کو دیکھ لیتا ہے اور ان کو مردود اور جڑا ہوا پاتا ہے تو اس کا قدرت اور خدا کی جانب رجوع ہونا ضروری ہے۔ مذہبی بے پروائی کی وجہ فرقوں کی کثرت ہے ۔ الحاد کے اسباب مذہبی تفرقے ہیں اگر یہ بہت ہوں کیونکہ ہر تقسیم سے دونوں فریقوں میں جوش بڑھ جاتا ہے لیکن بہت سی تقسیمیں الحاد کو داخل کر دیتی ہیں .... اور آخر میں الحاد کا سبب علمی مصروفیت کے زمانے میں خصوصاً وہ جن میں امن اور خوش حالی میسر ہو کیونکہ تکالیف اور مصیبتیں انسانوں کے ذہنوں کو مذہب کی جانب زیادہ مائل کرتی ہیں۔

لیکن بیکن کی قدر و قیمت اتنی دینیات میں نہیں ہے جتنی کہ نفسیات میں ہے۔ وہ فطرت انسانی کا ایسا محلل ہے جو کبھی دھوکا نہیں کھاتا اور اپنے تجسس کے تیروں کو ہر دل کے اندر داخل کر دیتا ہے ۔ پرانے سے پرانے موضوع پر اس کی بحث تازگی اور جدت لیے ہوئے ہوتی ہے ۔۔ ایک شادی شدہ آدمی شادی کے بعد پہلے ہی دن اپنے خیالات میں سات سال مسن ہو جاتا ہے۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے، کہ برے شوہروں کی اچھی بی بیاں ہوتی ہیں (مگر بیکن اس سے مستثنیٰ تھا) مجرد زندگی کلیسا والوں کے لیے مناسب ہوتی ہے کیونکہ خیرات اس زمین کو مشکل سے پانی دے گی، جہاں پر اس کو پہلے ایک تالاب بنانا چاہیے۔ جو شخص بیوی بچے رکھتا ہے اس نے تقدیر کو گویا کہ یرغمال

دے رکھے ہیں کیونکہ یہ بڑی مہموں کے لیے رکاوٹ ہوتے ہیں خواہ وہ نیکی کی ہوں یا بدی کی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیکن نے اس قدر سخت محنت کی تھی کہ اسے عشق و محبت کا وقت نہیں ملتا تھا اور شاید اس نے اس کی گہرائی کو تو کبھی محسوس نہیں کیا۔ اس جذبے کی شدت کو محسوس کرنا بھی عجیب بات ہے .... کبھی کسی مغرور آدمی کا اپنے متعلق اس قدر مہمل طور پر عمدہ خیال نہیں ہوا ہے جتنا کہ ایک عاشق اپنے معشوق کی نسبت کرتا ہے .... تم دیکھ سکتے ہو کہ تمام بڑے اور قابل قدر اشخاص میں (جن کی کہ یاد باقی ہے خواہ وہ قدیم زمانے کے ہوں یا حال کے) ایک بھی ایسا نہیں ہے جو عشق میں دیوانگی کی حد تک مبتلا ہوا ہو۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بڑی روحیں اور بڑے کام اس کمزور جذبے سے الگ رہتے ہیں۔

وہ دوستی کو عشق و محبت سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ اگرچہ دوستی کے متعلق بھی وہ ارتیابی ہو سکتا ہے۔ دنیا میں دوستی بہت کم ہے اور برابر والوں میں اور بھی کم ہے جس کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا تھا۔ اس کا وجود اگر ہے تو اعلیٰ اور ادنیٰ کے مابین ہے جن کی قسمتیں ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ رکھ سکتی ہیں .... دوستی کا ایک بڑا اثمرہ وہ سہولت اور قلب کی لبریزی کا اخراج ہے جو ہر قسم کے جذبات سے پیدا ہو جاتی ہے۔ دوست ایک کان کے مانند ہوتا ہے۔ وہ لوگ جن کو اپنے دل کا حال بیان کرنے کے لیے دوست میسر نہیں ہوتے اپنے دلوں کے کھانے والے ہوتے ہیں .... جس کسی شخص کا ذہن بہت سے خیالات سے پُر ہوتا ہے اس کی عقل و فہم دوسرے سے بات چیت کرنے اور اپنے دل کا حال کہنے سے ضرور صاف اور زرخیز ہوتی ہے۔ وہ اپنے خیالات کو زیادہ آسانی کے ساتھ پھینکتا ہے وہ ان کو زیادہ باقاعدگی سے آراستہ کرتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ جب ان کو الفاظ میں بدلا جاتا ہے تو وہ کیسے معلوم ہوتے ہیں اور آخر میں وہ اپنے سے زیادہ عقلمند ہو جاتا ہے اور ایک گھنٹے کی گفتگو سے ایک دن غور و فکر کی نسبت زیادہ دانشمند ہو جاتا ہے۔

جوانی اور بڑھاپے کے مضمون میں وہ پیرے گراف کے اندر ایک کتاب
کو بیان کر دیتا ہے۔ نوجوان آدمی رائے قائم کرنے کی نسبت ایجاد کرنے کے لیے
مشورے کی نسبت تعمیل کرنے کے لیے مستقل کاروبار کی نسبت نئی تجاویز
کے لیے زیادہ موزوں ہوتے ہیں کیونکہ بوڑھے آدمی کا تجربہ ایسی چیزوں میں
جو اس کے حلقے کے اندر آتی ہیں اس کی رہبری کرتا ہے لیکن نئی چیزوں میں ۱۲۹
اس کو گمراہ کرتا ہے۔ .... نوجوان آدمی کاروبار کی نگرانی اور
انتظام میں اس سے زیادہ اپنے آغوش میں لے لیتے ہیں جتنا کہ وہ تھام سکتے
ہیں اس سے زیادہ حرکت کرتے ہیں جتنا کہ وہ انجام دے سکتے ہیں مقصد کی طرف
وسائل اور مدارج پر غور کیے بغیر دوڑ پڑتے ہیں مہمل طور پر چند ایسے اصولوں
کے پیچھے پڑے رہتے ہیں جن تک وہ اتفاقاً پہنچ جاتے ہیں۔ ۱۵۹ اس کی پروا
نہیں کرتے (کہ کس طرح سے وہ) نئی بات کر رہے ہیں جو نامعلوم تکلیف کو لاتی
ہے .... بوڑھے آدمی ضرورت سے زیادہ اعتراض کرتے ہیں ضرورت
سے زیادہ دیر تک مشورہ کرتے ہیں جرأت سے بہت کم کام لیتے ہیں بہت جلد
نادم ہو جاتے ہیں اور بہت کم کام کو انجام تک پہنچاتے ہیں بلکہ اوسط درجے کی
کامیابی پر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ بلاشبہ دونوں سے کام لینا چاہیئے ....
کیونکہ ایک کی خوبیاں دوسرے کی خرابیوں کی اصلاح کر دیں گی۔ بااین ہمہ
اس کا خیال ہے کہ کہیں نوجوانوں اور بچوں کو ضرورت سے زیادہ آزادی نہ
مل جائے اور وہ بے قاعدہ اور بے راہ نہ ہو جائیں" والدین کو چاہیئے کہ
ان مشاغل اور ان راستوں کو پہلے ہی سے پسند کر لیں جو اپنے بچوں کو وہ
اختیار کرانا چاہتے ہیں کیونکہ ان میں اس وقت سب سے زیادہ لچک ہوتی
ہے اور انھیں بچوں کے رجحان پر اس خیال سے کہ وہ اسی مشغلے کو سب سے
بہتر طریق پر انجام دیں گے جس کی طرف ان کا ذہن سب سے زیادہ مائل ہوگا
بہت زیادہ غور و فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ اگر تاثرات اور
رجحانات غیر معمولی ہوں تو اس صورت میں ان کی مخالفت مناسب نہیں ہے۔
لیکن عموماً فیثا غورثیوں کا یہ اصول اچھا ہے کہ بہترین کو انتخاب کر و عادت

اس کو خوش گوار اور آسان بنا دے گی۔ کیونکہ عادت انسان کی زندگی کی سب سے بڑی حاکم ہے۔

مضامین کی سیاسیات ایسی قدامت پسندی کی تلقین کرتی ہے جو ایسے شخص کے لیے فطری ہے جو حکومت کرنے کا آرزو مند تھا۔ بیکن ایک طاقتور مرکزی قوت چاہتا ہے۔ بادشاہت حکومت کی بہترین شکل ہے اور عموماً ایک مملکت کی کارکردگی قوت کے ارتکاز سے متغیر ہوتی ہے۔ حکومت میں کام کے تین نقطے ہوتے ہیں تیاری کی مباحثہ یا جانچ اور تکمیل (یا تعمیل)۔ اگر تمھیں جلدی
۱۳۰ مقصود ہو تو ان میں سے صرف درمیانی کام کثرت تعداد کے سپرد ہونا چاہئے اور پہلا اور آخری کام چند کے۔ وہ ایک صاف گو فوجی نقطۂ خیال رکھتا ہے۔ وہ افسوس کے ساتھ کہتا ہے کہ صنعت و حرفت کی ترقی جنگی آدمیوں کے لیے غیر موزوں ہے اور طویل امن انسان کے فوجی جذبے کو خفتہ کر دیتا ہے۔ با ایں ہمہ وہ خام سامان کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے سولن نے قارون سے کیا خوب کہا تھا (جب کہ قارون نے اظہار نمائش کی خاطر اس کو اپنا سونا دکھلایا تھا) جناب اگر کوئی دوسرا ایسا آئے جس کے پاس آپ سے بہتر لوہا ہو تو وہ اس تمام سونے کا مالک ہو جائے گا۔

ارسطو کی طرح سے وہ بھی انقلابات سے بچنے کے لیے کچھ نصیحتیں کرتا ہے۔ بغاوتوں سے بچنے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ ان کے مواد کو دور کر دو کیونکہ اگر ایندھن تیار ہو تو یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ شعلہ کہاں سے آئے گا جو ان سب کو آگ لگا دے گا۔ .... نہ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بحث و مباحثے کو بہت شدت کے ساتھ دبانا اس کا علاج ہو جائے گا کیونکہ اکثر اوقات ان سے نفرت کرنا اور حقیر جاننا ان کے روکنے کا بہترین طریقہ ہوتا ہے اور ان کے روکنے کا ارادہ کرنا ان کو حیرت انگیز اور طویل زندگی بخش دیتا ہے .... بغاوت کا مادہ دو قسم کا ہوتا ہے بہت زیادہ افلاس اور بہت زیادہ بے اطمینانی .... بغاوتوں کے اسباب اور محرکات حسب ذیل ہیں۔ مذہب میں نئی باتیں نکالنا، حصول قوانین اور دستوروں کی

تبدیلیٔ حقوق کا توڑنا عام ظلم نالائق اشخاص اور اجنبیوں کی ترقی خشک سالی، برطرف شدہ سپاہی سخت جھگڑے اور وہ سب چیزیں جو لوگوں کو برہم کرکے انھیں متحد کردیں۔ ہر قائد کا اصل کام یہ ہوتا ہے کہ اپنے دشمنوں کو متفرق اور دوستوں کو متحد کرے۔ عموماً ان تمام جماعتوں کو توڑنا اور ان میں تفرقہ پیدا کرنا جو مملکت کے خلاف ہوں، اور ان کو دور رکھنا، یا کم از کم ان میں آپس میں بے اعتمادی پیدا کرادینا، کوئی برا علاج نہیں ہے۔ کیونکہ بدترین صورت یہ ہے کہ جو لوگ سلطنت کے نظم ونسق کے موئید ہوں، ان میں تو نفاق وشقاق ہو، اور جو اس کے خلاف ہوں، وہ باہم متحد ومتفق ہوں۔ انقلاب
سے بچنے کا ایک بہتر نسخہ یہ ہے کہ دولت کو انصاف کے ساتھ تقسیم کیا جائے، روپیہ 131
کھاد کی طرح سے ہے، یہ اس وقت تک اچھا نہیں ہے جب تک کہ پھیلایا نہ جائے۔ مگر اس کے معنے اشتراکیت کے نہیں ہیں اور نہ جمہوریت کے ہیں۔ بیکن کو عوام پر اعتماد نہیں جن کی اس زمانے میں تعلیم تک رسائی نہیں تھی۔ وہ تمام خوشامدوں میں سب سے ادنیٰ درجے کی خوشامد ادنیٰ درجے کے لوگوں کی ہے، اور فاسین نے اس کو ٹھیک سمجھا تھا، جس کی جس وقت مجمع نے تعریف وتوصیف کا ہنگامہ بلند کیا تو اس نے دریافت کیا، کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہے۔ بیکن جو کچھ چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ پہلے تو زمیندار کسانوں کی ایک جماعت ہو، پھر انتظام مملکت کے لیے ایک اشرافیہ ہو۔ اور اس سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ ایک فلسفی بادشاہ ہو۔ ایسی کوئی مثال نہیں ملتی جس میں کوئی حکومت تعلیم یافتہ حکمرانوں کے زیر انتظام ناکام رہی ہو۔ اس ذیل میں وہ سینیکا انٹونینس پیس اور آری لس کا ذکر کرتا ہے۔ اس کو امید تھی کہ آنے والی نسلیں ان کے ناموں کے ساتھ خود اس کے نام کو بھی شامل کردیں گی۔

۴۔ عظیم الشان تعمیر جدید

اپنی کامرانیوں کے اندر بھی اس کا دل غیر شعوری طور پر فلسفے میں

اٹکا ہوا تھا۔ جوانی میں یہ اس کی دایا رہا تھا، سرکاری عہدے میں یہ اس کا رفیق رہا تھا، قید اور بے عزتی کی حالت میں یہ اس کی تشفی بننے والا تھا۔ وہ اس بدنامی پر ماتم کرتا تھا، جس میں فلسفہ مبتلا ہو گیا تھا، اور اس کا الزام وہ بنجر مدرسیت کو دیتا تھا۔ "لوگ ان مباحثوں کی وجہ سے صداقت سے نفرت کرنے لگتے ہیں، جو اس کے متعلق ہوتے ہیں اور ان سب کو غلط راستے پر خیال کرنے لگتے ہیں جو کبھی نہیں ملتے۔" علوم تقریباً رکے ہوئے ہیں، اور ان میں نسل انسانی کے شایان کوئی اضافہ نہیں ہو رہا ہے۔...... اور اس کی تمام روایت اور تسلسل بہر حال اساتذہ اور علما کا تسلسل ہے موجدین کا نہیں...... حکمت کے معاملے میں اب جو کچھ کیا جاتا ہے وہ صرف ایک گول گردش اور دائمی ہیجان ہے جو وہیں ختم ہو جاتا ہے جہاں سے کہ شروع ہوا تھا۔ اپنی ترقی اور اوج کے تمام برسوں میں وہ فلسفے کی بحالی یا تعمیر جدید پر غور کرتا رہا۔ ۳۲

اس نے اپنے تمام مطالعوں کو اس کام کے گرد مرکوز کرنے کی کوشش کی تجویز کی سب سے پہلے وہ اپنے کام کے خاکے میں بتاتا ہے کہ وہ بعض تمہیدی کتابیں لکھے گا جن میں قدیم طریقوں کے باقی رہ جانے کی وجہ سے فلسفے میں جمود پیدا ہو جانے کی تشریح کرے گا اور پھر نئی ابتدا کے لیے اپنی تجاویز کا خاکا پیش کرے گا۔ دوسرے وہ علوم کے نئے اصطفاف کی کوشش کرے گا، ان میں سے ہر ایک علم کے مواد کو مخصوص کرے گا اور ہر میدان میں ان مسائل کی فہرست پیش کرے گا جو ابھی حل نہیں ہوئے ہیں۔ تیسرے وہ فطرت کی ترجمانی کے لیے اپنے نئے طریقے کو بیان کرے گا۔ چوتھے وہ اپنی مصروفیت کے باوجود حقیقی علم طبیعی کی کوشش کرے گا۔ پانچویں وہ عقل کے اس زینے کو دکھائے گا جس کے ذریعے سے گزشتہ زمانے کے مصنفین حقائق تک پہنچے تھے اور جو اب قرون وسطیٰ کے خس و خاشاک کے پائین میں سے صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ چھٹے وہ حکمی نتائج کے متعلق بعض پیشین گوئیاں کرے گا جو اسے یقین ہے کہ اس کے طریقے کے استعمال سے وقوع میں آئیں گے۔ اور آخر میں ثانوی (یا عملی) فلسفے کے طور پر وہ یوٹوپیا کا تصور کرے گا جو اس نوخیز حکمت سے پھلے پھولے گی جس کے کہ اس کو پیغمبر ہونے کی امید تھی۔ اس سب سے فلسفے کی عظیم الشان

تعمیر جدید ہو جائے گی۔ یہ ایک شاندار مہم تھی اور ـــــ سوائے ارسطو کے ـــــ تاریخ فکر میں اپنی نظیر نہیں رکھتی تھی یہ ہر فلسفے سے اس اعتبار سے مختلف ہو گی کہ اس کا مقصود عمل تھا نہ کہ نظریہ اور یہ مخصوص حقیقی خیروں کو حاصل کرنا چاہتی تھی نہ کہ نظری موزونی کو۔ علم قوت ہے نہ کہ محض استدلال یا زینت۔ ۱۳۳
یہ ایک رائے نہیں ہے جس کو کہ قائم کر لیا جائے بلکہ ایک کام ہے کرنے کے لیے۔ اور میں کسی فرقے یا نظریے کی بنیاد رکھنے کے لیے محنت نہیں کر رہا ہوں بلکہ افادے اور قوت کے لیے۔ یہاں پر پہلی بار جدید حکمت کا لہجہ اور آواز محسوس ہوتی ہے۔

۱۔ علم کی ترقی

کام انجام دینے کے لیے علم ہونا چاہیے۔ فطرت پر حکومت نہیں کی جا سکتی سوائے اس کے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ ہم کو قوانین فطرت کا علم حاصل کرنا چاہیے اور ہم اس کے اسی طرح سے آقا بن جائیں گے جس طرح سے جہالت کی وجہ سے اب اس کے غلام ہیں۔ حکمت ہی یوٹوپیا کا راستہ ہے لیکن یہ سڑک کس حالت میں ہے۔ مڑی تڑی غیر روشن اپنی طرف مڑی ہوئی بیکار گلی کوچوں میں گم اور روشنی کی طرف نہیں بلکہ ابتری کی طرف لے جانے والی۔ پس آؤ حکمتوں کی حالت کا ایک جائزہ لیں اور ان کے لیے ان کے مخصوص و مناسب میدان قائم کریں۔ ہر ایک حکمت کو اس کی خاص جگہ پر رکھیں ان کے نقائص ان کی ضروریات اور ان کے امکانات کو جانچیں نئے مسائل کی طرف اشارہ کریں جو ان کی روشنی کے منتظر ہیں اور عام طور پر ان کی جڑوں کے گرد سے ذرا مٹی کو کھولیں اور ہلائیں۔

یہ ہے وہ کام جس کو بیکن نے اپنی کتاب ترقی علم میں کرنا شروع کیا۔ وہ ایک ایسے بادشاہ کی طرح سے جو اپنی قلمرو میں داخل ہوتا ہو لکھتا ہے کہ

میری نیت ہے کہ علم کا دورہ کروں اور دیکھوں کہ کون سے حصے بنجر اور
غیر مزروعہ ہیں اور ان کو انسان کی محنت نے چھوڑ رکھا ہے تاکہ ویران قطعوں
کی صحت کے ساتھ نقشے بنا کر اجتماعی اور انفرادی توانائیوں سے
ان کی اصلاح میں کام لیا جائے۔ وہ خس و خاشاک سے بھری ہوئی زمین
کا نگران اور نقشہ نویس ہوگا سڑک کو سیدھا کرے گا اور کھیتوں کو مزدوروں
میں تقسیم کرے گا۔ یہ تجویز ایسی بہادرانہ تھی کہ تعلی کی حد تک آگئی تھی۔ لیکن بیکن ۱۳۴
ابھی اس قدر نوجوان تھا (بیالیس سال کی عمر میں فلسفی نوجوان ہی ہوتا ہے)
کہ بڑے سفروں کی تجویز کر سکتا تھا۔ میں نے کل علم کو اپنا حلقہ قرار دیا ہے
یہ اس نے برگلے کو ۱۵۹۲ میں لکھا تھا اور اس سے اس کی مراد یہ نہ تھی کہ
وہ اپنے آپ کو انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا کی قبل از وقت اشاعت بنالے گا بلکہ
محض یہ مراد تھی کہ اس کا کام اس کو ہر میدان میں ہر علم کے نقاد اور مددگار
کی حیثیت سے معاشری تعمیر جدید کے کام میں لے جائے گا۔ اس کے مقصد
کی مقدار ہی اس کے انداز بیان کو ایک قسم کی شوکت دے دیتی ہے اور
بعض اوقات اس کو انگریزی نثر کی بلندی پر لے جاتی ہے۔

اس طرح سے وہ اس وسیع میدان جنگ میں گشت لگاتا ہے جس میں کہ
انسانی تحقیق فطری مزاحمت اور انسانی جہالت سے کشمکش کرتی ہے اور ہر میدان
میں وہ روشنی ڈالتا ہے وہ عضویات اور طب کو بہت اہمیت دیتا ہے آخر الذکر
کی نسبت وہ کہتا ہے کہ یہ ایک نہایت ہی اعلیٰ درجے کے آلۂ موسیقی کے درست
کر دینے کے مساوی ہے جس کی آسانی سے آواز خراب ہو جاتی ہے۔ لیکن وہ ہم عصر علما
کی سست تجربیت پر اور ان کے اس رجحان پر اعتراض کرتا ہے کہ وہ تمام بیماریوں
کا ایک ہی نسخے سے علاج کرتے ہیں۔ عموماً طبیعت سے۔ ہمارے اطبا ان اسقفوں کی طرح
سے ہیں جو باندھنے اور ڈھیلا کرنے کی کنجیاں رکھتے ہیں مگر اس سے زیادہ نہیں۔ وہ
ضرورت سے زیادہ اٹکل پچو غیر منظم انفرادی تجربے پر بھروسا کرتے ہیں
ان کو چاہیے کہ وہ زیادہ وسیع پیمانے پر اختبار کیا کریں! انھیں
انسانی تشریح پر تقابلی تشریح سے روشنی ڈالنی چاہیے! ان کو تقطیع کرنی چاہیے

اور اگر ضروری ہو زندہ جسم کی تقطیع کرنی چاہیے اور سب سے زیادہ انھیں اختبارات اور نتیجوں کی ایسی آسانی سے سمجھ میں آنے والی اور آسانی سے حاصل ہونے والی یادداشت تیار کرنا چاہیے جس تک کہ لوگ پہنچ سکیں۔ بیکن کا خیال ہے کہ طبی پیشے کو موت کو آسان اور سریع کرنے کی اجازت ہونی چاہیے جہاں کہ بصورت دیگر موت میں صرف چند روز کی تاخیر ہو اور تکلیف بہت زیادہ ہو۔ لیکن وہ اطبا پر اس امر کی بہت تاکید کرتا ہے کہ ان کو زندگی کے طویل بنانے کے فن پر زیادہ غور کرنا چاہیے یہ طب کا نیا حصہ ہے اور اس میں بہت کمی ہے اگرچہ یہ اور سب حصوں سے زیادہ شریف ہے کیونکہ اگر یہ مہیا ہو سکے تو طب محض مالی منفعت کی خاطر معالجوں میں ہی مصروف نہ رہے گی اور اطبا کو صرف ضرورت کے وقت ہی عزت نہ بخشی جایا کرے گی بلکہ وہ دنیا کی اس سب سے بڑی مسرت کے تقسیم کرنے والے ہوں گے جو کہ فانی انسانوں کو حاصل ہو سکتی ہے۔ اس نقطے پر ۱۳۵
کوئی ترش روشوپنہائری احتجاج کر سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے کہ یہ مفروضہ صحیح نہیں ہے کہ طول حیات ایک نعمت ہوگی بلکہ اس کے برعکس ہمارے اطبا جتنا جلد بھی ہماری بیماریوں کو ختم کر سکیں اتنا ہی بہتر ہے اور یہ ایسا کمال ہوگا جس کی ضرور تعریف ہونی چاہیے۔ لیکن بیکن باوجود اس کے کہ وہ پریشان تھا شادی بھی کر چکا تھا اور ہر طرف سے دشواریوں میں گھرا ہوا تھا مگر اس کو اس امر کے متعلق کبھی شبہہ نہیں ہوا کہ حال میں زندگی ایک عمدہ چیز ہے۔

نفسیات میں وہ تقریباً کرداری ہے۔ وہ انسانی عمل میں علت و معلول کے سخت مطالعے کا مطالبہ کرتا ہے اور لفظ اتفاق کو حکمت کے لغت سے خارج کر دینا چاہتا ہے۔ "اتفاق ایسی چیز کا نام ہے جس کا کہ وجود نہیں" "اور کائنات میں جو حیثیت اتفاق کی ہے وہی حیثیت انسان میں ارادے کی ہے"۔ یہاں پر معنی کی ایک دنیا ہے، اور ایک اعلان جنگ ہے اور یہ سب صرف ایک چھوٹی سی سطر میں ہے۔ مدرسی نظریۂ اختبار کو ایک طرف ڈھکیل دیا جاتا ہے کہ یہ بحث کے قابل ہی نہیں ہے اور عقل سے علیحدہ ارادے کے عام مسلمہ کو رد کر دیا جاتا ہے۔ یہ ایسی رہنمائیاں ہیں جن میں بیکن آگے نہیں جاتا صرف یہی

ایک ایسا واقعہ نہیں ہے جس میں کہ وہ ایک کتاب کو ایک فقرے میں بیان کر دیتا ہے اور پھر مسکراتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔

پھر چند لفظوں میں بیکن معاشری نفسیات ایجاد کرتا ہے۔ فلاسفہ کو چاہیئے کہ دستور عمل عادت تعلیم مثال نقل و تقلید تحریص جماعت دوستی تعریف مذمت اصرار شہرت قوانین کتب مطالعوں وغیرہ کی قوتوں اور توانائی کی محنت سے تحقیق کریں۔ کیونکہ یہ وہ چیزیں ہیں جو انسان کے اخلاق میں حکومت کرتی ہیں۔ ان عاملوں کے ذریعے سے ذہن بنتا اور مطیع ہوتا ہے۔ اس خاکے کی نئی حکمت میں اس قدر پابندی کی گئی ہے کہ ٹارڈے لیبون راس والاس اور ڈرکھایم کی تصانیف کی یہ فہرست مضامین معلوم ہوتا ہے۔

حکمت کی شان سے نہ تو کوئی چیز گری ہوئی ہوتی ہے اور نہ بالاتر ہوتی ہے۔ منتر جنتر خواب پیشین گوئیاں اشراقی اطلاعات نفسیاتی مظاہر کو عام طور پر حکمی جانچ کے ماتحت لانا چاہیئے کیونکہ یہ نہیں معلوم ہے کہ کن صورتوں میں اور کس حد تک ان اثرات میں جو توہم سے منسوب کیے جاتے ہیں طبیعی اسباب کا دخل ہوتا ہے۔ اپنے سخت فطری رجحان کے باوجود وہ ان مسائل کی دل کشی کو محسوس کرتا ہے اس کے نزدیک کوئی انسانی چیز خارجی اور غیر ضروری نہیں ہے۔ ۱۳۶
کون جانتا ہے کہ کونسی غیر مشتبہ حقیقت کونسی نئی حکمت ان تجسسات سے ظاہر ہو سکتی ہے جس طرح سے کیمیا ہوسی نکل پڑی ہے۔ ہوسی کی مثال اس شخص کی سی ہو سکتی ہے جس نے اپنے بیٹوں سے یہ کہا تھا کہ میں نے تمھارے لئے سونا چھوڑا ہے جو کہیں نہ کہیں تاکستان میں دفن ہے مگر اس کے بیٹوں نے کھودنے پر وہاں سونا نہیں پایا لیکن انگوروں کی جڑوں کی پاس سے مٹی اور کھاد کے الٹ پلٹ کرنے سے بکثرت انگور لگے تھے۔ اسی طرح سے سونا بنانے کی جستجوئیں اور کوششیں بہت سی مفید ایجادات اور اختبارات کا باعث ہوئی ہیں۔

کتاب ہشتم میں ایک اور حکمت عالم وجود میں آتی ہے یعنے زندگی میں کامیابی حاصل کرنا۔ بیکن کے اقتدار کو ابھی زوال نہ ہوا تھا اس لیے وہ بعض

ابتدائی اشارے اس امر کے بیان کرتا ہے کہ دنیا میں کس طرح ترقی کی جائے۔
اس کے لیے پہلی ضرورت علم ہے یعنے علم اپنے اور دوسروں کے متعلق۔ اپنے کو
جاننا تو محض آدھی بات ہے اگرچہ اپنے کو جاننے سے دوسروں کے جاننے میں
بہت مدد ملتی ہے۔ ہمیں محنت و جانفشانی کے ساتھ ان خاص اشخاص کے متعلق
علم حاصل کرنا چاہئے جن سے کہ ہم کو سابقہ پڑتا ہے یعنے ہمیں ان کے مزاج
خواہشوں خیالات رواجات عادتوں وغیرہ کا ان امدادوں اور یقینوں کا
جن پر کہ وہ زیادہ تر بھروسا کرتے ہیں اور جہاں سے کہ ان کو ان کی قوت
ملی ہے علم حاصل کرنا چاہئے۔ ہمیں ان کے نقائص اور کمزوریوں کا بھی پتا
لگانا چاہیے جن میں کہ وہ بیشتر آسانی کے ساتھ مبتلا ہوجاتے ہیں نیز ہمیں ان کے
احباب ان کی جماعتوں ان کے مربیوں ان کے ماتحتوں ان کے دشمنوں
ان کے حاسدوں ان کے رقیبوں ان کے ملاقات کے اوقات اور انداز سے
واقفیت پیدا کرنی چاہئے............ لیکن سب سے یقینی کنجی دوسروں کے
ذہنوں کے کھولنے کی یہ ہے کہ یا تو مزاجوں اور فطرتوں کی چھان بین کرنی
چاہئے یا ان کی غایتوں اور ان کے ارادوں کی۔ کمزور اور سادہ آدمیوں
کا اندازہ ان کے مزاج سے ہوتا ہے لیکن نسبتاً دانشمند اور گھنے لوگوں کا ان
کے مقاصد اور ارادوں سے.......... مگر اس تمام تحقیق کا سب سے مختصر
راستہ تین باتوں پر منحصر ہے اول کثرت سے دوستیاں کی جائیں........ دوسرے
انسان کی ذات کو اچھی طرح سے ظاہر کرنے اور اس کے حق کو محفوظ رکھنے میں
اس سے زیادہ اور کوئی چیز مفید نہیں ہے جتنا کہ یہ ہے کہ انسان حد سے زیادہ
شیرینی اور خوش مزاجی سے اپنے کو غیر مسلح نہ کردے کیونکہ اسس سے وہ ۱۳۷
نقصانات اور ملامتوں کا شکار ہوتا ہے بلکہ......... بعض اوقات ایک
آزاد اور فیاض ذہن کی کچھ چنگاریاں بھی اڑا دے جن میں جتنی شیرینی ہو
اتنی ہی تلخی بھی ملی ہوئی ہو۔

دوست بیکن کے نزدیک زیادہ تر طاقت کا وسیلہ ہوتے ہیں اس کو
مشیولی کے ساتھ ایک ایسی بات میں اتفاق ہے جس کو انسان پہلی بار میں

احیائے علمی سے منسوب کرنے پر مائل ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کو وہ عمدہ اور بے غرض دوستیاں یاد آتی ہیں جو میکائل انجیلو اور کیویلری، مان ٹین اور لابوئسی سر فلپ سڈنی اور ہیوبرٹ لینگوئمٹ کے مابین تھی۔ غالباً دوستی کی یہی عملی قدر و قیمت بیکن کے زوال کی وجہ ہے اور اسی قسم کے نظریے نپولین کی زوال کی توجیہ میں مدد کرتے ہیں کیونکہ ایک شخص کے دوست اس کے ساتھ اپنے تعلقات میں شاذ و نادر ہی اس سے بلند تر فلسفے سے کام لیتے ہیں جتنا کہ وہ ان کے برتاؤ میں خود مدعی ہوتا ہے بیکن بیاس سے اقتباس کرتا ہے جو قدیم یونان کے سات عقلمندوں میں سے تھا۔ اپنے دوست سے اتنی محبت کرو گویا کہ وہ تمھارا دشمن بننے والا ہے اور اپنے دشمن سے اتنی محبت کرو گو یا وہ تمھارا دوست بننے والا ہے۔ اپنے دوست سے بھی اپنے حقیقی مقاصد اور خیالات کا ضرورت سے زیادہ اظہار نہ کرو۔ گفتگو میں رائے ظاہر کرنے کی نسبت سوالات زیادہ کیا کرو۔ اور جب تم بولو تو یقین اور آرا کے بجائے مواد اور معلومات زیادہ پیش کرو۔ ظاہری غرور ترقی میں مدد کرتا ہے اور تصنع اخلاقیات میں تو قصور ہے مگر سیاسیات میں نہیں —— یہاں بھی پھر نپولین کی یاد تازہ ہو جاتی ہے بیکن اس چھوٹے کارسیکی کی طرح اپنے گھر کی دیواروں کے پیچھے کافی سادہ انسان تھا لیکن ان کے باہر وہ بہت کچھ نمود و نمائش سے کام لیتا تھا جس کو وہ عام شہرت کے لیے لازمی خیال کرتا تھا۔

اس طرح سے بیکن ایک میدان سے دوسرے میدان میں اپنے فکر کے تخم کو ہر علم میں ڈالتا ہوا دوڑتا ہے۔ اپنی پیمائشں کے ختم پر وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ بجائے خود حکمت کافی نہیں ہے حکمتوں سے باہر ان کو مربوط کرنے کے لیے اور انھیں ایک مقصود کی طرف لیجانے کے لیے ایک قوت اور تربیت ہونی چاہیے اور ایک بڑا اور طاقتور سبب ہے جس کی وجہ سے حکمتوں نے بہت تھوڑی ترقی کی ہے اور وہ یہ ہے جب مقصد کو سیدھی طرح سے متعین نہ کیا گیا ہو تو راستے کا سیدھا لیجانا ممکن نہیں ہے۔ ۱۳۸
حکمت کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ فلسفہ ہے —— یعنے حکمی طریقے کی

تحلیل اور حکمی اغراض و مقاصد اور نتائج کی ترکیب اس کے بغیر ہر حکمت کا سطحی ہونا لازمی ہے۔ کیونکہ جس طرح سے ایک علاقے کا مکمل منظر ایک سطح جگہ سے نظر آنا ممکن نہیں ہے اسی طرح سے کسی حکمت کے بعیدی اور عمیق حصوں کا اسی حکمت کی سطح پر کھڑے ہو کر یا بلند تر سطح پر چڑھے بغیر سمجھ میں آنا ممکن نہیں ہے۔ وہ الگ واقعات کو ان کے سیاق کے بغیر اور بلا وحدت فطرت کا لحاظ کئے دیکھنے کی عادت کی مذمت کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص ایک چھوٹی سی شمع ایک ایسے کمرے کے کونوں میں لیے پھرتا ہو، جو کہ ایک بڑی اور مرکزی روشنی سے منور ہو۔

آخر میں بیکن کا محبوب حکمت نہیں بلکہ فلسفہ ہوتا ہے صرف فلسفہ ہی ایسی چیز ہے جو رنج اور کشمکش کی زندگی کو بھی وہ پر شوکت سکون بخش سکتا ہے جو کہ فہم سے پیدا ہوتا ہے۔ علم موت کے اور قسمت کی گردش کے خوف کو مغلوب کرتا اور کم کرتا ہے وہ ورجل کے مشہور مصرعوں کو نقل کرتا ہے۔

خوش قسمت ہے وہ شخص جو اشیا کے اسباب کو جان چکا ہے اور تمام اندیشوں اور اٹل قسمت اور حرص کے جہنم کی پر شور کشمکش کو اپنے پیروں تلے روند چکا ہے۔ غالباً فلسفے کا یہ بہترین ثمرہ ہے کہ اس کے ذریعے سے ہم لامتناہی اکتساب کے سبق کو فراموش کرتے ہیں جو ایک حرفتی ماحول اس قدر اصرار کے ساتھ دہراتا رہتا ہے۔ فلسفہ ہمیں پہلے ذہنی خیروں کی تلاش کی ہدایت کرتا ہے اور باقی یا تو خود بہ خود مہیا ہو جائیں گی یا ان کی کچھ زیادہ احتیاج نہ ہو گی۔ حکمت کا ایک ٹکڑا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مسرت ہے۔

ٹھیک حکمت کی طرح سے حکومت بھی فلسفے کی کمی کی وجہ سے نقصان اٹھاتی ہے۔ فلسفے کو حکمت سے وہی تعلق ہے جو تدبر کو سیاسیات سے ہے۔ یعنی ایک طرف تو وہ حرکت ہے جس کی مجموعی علم اور تناظر رہبری کر رہے ہیں دوسری طرف بے مقصد انفرادی تلاش ہے۔ جس طرح سے علم کی تلاش انسانوں کی اور ۱۳۹
زندگی کی حقیقی ضروریات کا لحاظ کئے بغیر مدرسیت ہے اسی طرح سے سیاسیات ایک تباہ کن پاگل خانہ بن جاتی ہے جب یہ حکمت اور فلسفے سے علیحدہ ہو جاتی ہے۔

فطری جسم کو عطائیوں کے سپرد کرنا جو عموماً صرف چند نسخے رکھتے ہیں جن پر کہ ان کو بھروسہ ہوتا ہے مگر جو نہ تو بیماری کے سبب کو جانتے ہیں اور نہ مریضوں کے مزاج اور نہ ان کی جسمانی ساخت کو نہ عوارض کے خطرے کو اور نہ علاج کے صحیح طریقوں کو غلطی ہے۔ اور اسی طرح سے مملکتوں کے اجتماعی جسم کو عطائی مدبروں کے سپرد کرنا لازمی طور پر خطرناک ہوگا جب تک کہ ان کے ساتھ ایسے دوسرے لوگ نہ ہوں، جو ٹھوس علمی قابلیت سے آراستہ ہوں .... اگرچہ اس کے متعلق یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے پیشے کی جانبداری کر رہا ہے، جس نے کہ یہ کہا ہے کہ مملکتیں اسی وقت خوش حال ہوں گی جب ان کے بادشاہ فلسفی ہوں گے یا فلسفی بادشاہ ہوں گے" مگر اس کے باوجود تجربے سے اتنی تصدیق ہوتی ہے، کہ بہترین زمانے وہی گزرے ہیں جب حکومتیں ذی علم و حکمت بادشاہوں کے ماتحت رہی ہیں" اور وہ ہم کو ان بڑے بادشاہوں کو یاد دلاتا ہے جنھوں نے روم پر ڈامیشن کے بعد اور کاموڈس سے پہلے حکومت کی ہے۔

اس طرح سے بیکن، فلاطون اور ہم سب کی طرح سے اپنے شوق کی تعریف کرتا ہے، اور اس کو انسان کی نجات کی طور پر پیش کرتا ہے۔ مگر وہ فلاطون سے کہیں زیادہ وضاحت کے ساتھ اختصاصی حکمت اور مخصوص تحقیق کے سپاہیوں اور لشکروں کی ضرورت پر زور دیتا ہے (اور یہ فرق ہی عصر جدید کی آمد کی اطلاع دیتا ہے)۔ کوئی ایک ذہن حتیٰ کہ بیکن تک کل میدان پر حاوی نہیں ہو سکتا تھا، اگرچہ وہ خود المپس کی چوٹی پر سے کیوں نہ دیکھتا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کو امداد کی ضرورت تھی، اور اسے اپنی بے مدد کوہستانی جنگ میں تنہائی بہت شاق تھی۔ وہ اپنے ایک دوست سے پوچھتا ہے کہ تمھارے کام میں کون کون ساتھی ہیں۔ میرے متعلق تو یہ ہے کہ میں بالکل ہی تنہا ہوں۔ وہ ایسے اہل حکمت کا خواب دیکھتا ہے، جو اپنی مخصوص حکمت کی تحقیق مسلسل اتحاد و اشتراک عمل سے مربوط رہتے اور ایک بڑی تنظیم ان کو ایک مقصد پر جمع رکھتی ہے۔ غور کرو کہ ایسے لوگ کیا کچھ نہ کر سکیں گے جن کو وافر فرصت و فراغت

یسر ہو گی اور محنتوں کا ارتباط اور قرنوں کی علمی مساعی کا اجتماع حاصل ہو گا؛ یہ اس لیے
اور بھی ضروری ہے کہ یہ راستہ ایسا نہیں ہے جس پر صرف ایک ہی شخص ایک وقت میں گزر سکتا ہو ۱۴۰
(جیسا کہ استدلال کی صورت میں ہے) بلکہ یہ ایسا راستہ ہے کہ جس میں انسانوں کی
محنتیں (خصوصاً تجربات کے جمع کرنے میں) بہترین کوشش سے جمع و تقسیم ہو سکتی
ہیں، اور پھر ان کو ترکیب دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ انسانوں کو اپنی طاقت کا اسی
وقت علم ہو گا جب بجائے اس کے کہ بڑی تعداد ایک ہی چیز کو کرے، ایک
شخص ایک چیز کا ذمہ دار ہو گا، اور دوسرا دوسری کا۔" حکمت جو کہ علم کی
تنظیم ہے اس کو خود بھی منظم ہونا چاہیے۔

اور یہ تنظیم بین الاقوامی ہونی چاہیے۔ اس کو سرحدوں پر سے آسانی کے ساتھ گزر جانا چاہیے، تاکہ یہ یورپ کو عقلی طور پر ایک بنا سکے۔ "دوسری کمی جو میں پاتا ہوں یہ ہے کہ ایک ہی ملک کی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں بھی باہم ہمدردی اور اتحاد عمل کی کمی ہے، اور یہی حال کل یورپ کے علمی اداروں کا ہے۔ ان تمام یونیورسٹیوں کو چاہیے کہ آپس میں مضامین اور مباحث تقسیم کر لیں، اور تحقیق و اشاعت دونوں میں باہم اتحاد عمل رکھیں۔ اس طرح سے منظم اور مربوط ہو کر یونیورسٹیاں ایسی شاہانہ امداد کے قابل خیال کی جا سکیں گی جو ان کو ایسی چیز بنا دے گی جیسی کہ وہ یوٹوپیا میں ہوں گی۔ یعنے بے تعصب علم کے مرکز جن کی دنیا پر حکومت ہو گی۔ بیکن اس بات کو محسوس کرتا ہے کہ علوم و فنون دونوں میں اساتذہ کو بہت ہی حقیر تنخواہ دی جاتی ہے۔ اور اس کے نزدیک اس صورت حال کا اس وقت تک تدارک نہیں ہو سکتا، جب تک کہ حکومتیں تعلیم کے کاموں کو خود اپنے ہاتھ میں نہ لیں۔ قدیم ترین اور بہترین زمانوں کی حکمت ہمیشہ اس بات کی شاکی رہی ہے، کہ حکومتیں قوانین میں ضرورت سے زیادہ مشغول رہتی ہیں، اور تعلیم کے بارے میں ضرورت سے زیادہ تساہل سے کام لیتی ہیں۔ اس کا سب سے بڑا خواب یہ ہے کہ فطرت کے فتح کرنے اور انسان کی قوت میں وسعت دینے کے لیے حکمت کو اشتراکی بنا دیا جائے۔

اور اس طرح سے وہ جیمس اول سے رجوع کرتا ہے، اور اس پر خوشامد کی ایسی بارش کرتا ہے، جس کا اس کو علم ہے کہ حضور بادشاہ سلامت کو مرغوب ہے۔ جیمس عالم بھی تھا اور بادشاہ بھی بلکہ اس کو اپنے قلم پر اپنے عصائے حکومت یا تلوار سے زیادہ ناز تھا۔ ایسے عالم و فاضل بادشاہ سے کچھ نہ کچھ توقع ہونی چاہئے تھی۔
۱۴۱ بیکن جیمس سے کہتا ہے کہ جو تجاویز میں نے بیان کی ہیں وہ درحقیقت بادشاہوں کے کام ہیں۔ ان کی طرف ایک آدمی کی مساعی کی حالت ایسی ہوتی ہے جیسی کہ چوراہے پر کی تصویر کی جو راستے کی طرف اشارہ تو کرتی ہے مگر اس پر چل نہیں سکتی۔ بلاشبہہ ان شاہی کاموں میں خرچ تو ہوگا، مگر جس طرح سے بادشاہوں کے منشی اور جاسوس خبر رسانی کے معاوضے کے لیے برآوردیں پیش کرتے ہیں اسی طرح آپ فطرت کے جاسوسوں اور مخبروں کو اپنی برآوردیں پیش کرنے دیجئے اگر آپ ان بہت سی چیزوں سے لاعلم نہیں رہنا چاہتے جو جاننے کے لائق ہیں، اور اگر سکندر نے ارسطو کے تصرف میں شکاریوں چڑی ماروں ماہی گیروں وغیرہ کے لیے اس قدر بڑا خزانہ دیدیا تھا، تو اس فیاضی کے وہ لوگ کہیں زیادہ مستحق ہیں جو فطرت کی گتھیوں کو سلجھاتے ہیں۔ ایسی شاہانہ امداد سے یہ عظیم الشان تعمیر جدید چند برس میں مکمل ہوسکتی ہے اور اس کے بغیر اس کام میں برس لگیں گے۔

بیکن کے یہاں جو چیز بہت ہی نئی ہے وہ اس کا شاندار یقین ہے جس کے ساتھ وہ اس امر کی پیشین گوئی کرتا ہے کہ انسان فطرت پر فتحیاب ہوگا۔ "میں فن اور فطرت کی بازی میں ہر چیز لگانے کے لیے تیار ہوں"۔ انسانوں نے جو کچھ اب تک کیا ہے وہ ان چیزوں کی جو کچھ وہ کریں گے محض دھڑوت ہے" مگر یہ عظیم الشان امید کیوں ہے؟ کیا انسان صداقت کو ان دو ہزار برس تک تلاش نہیں کرتے رہے ہیں، کیا اس عرصے میں انھوں نے حکمت کی گلیاں نہیں چھانی ہیں۔ ایک شخص کو اتنی بڑی کامیابی کی کیوں امید ہے جہاں کہ اتنے عرصے کی محنت سے ایسا معمولی نتیجہ مرتب ہوا ہے؟ —— ہاں بیکن جواب دیتا ہے، اگر وہ طریقے جن کو لوگوں نے استعمال کیا ہے غلط اور بیکار رہے ہوں، اگر شاہراہ پر سے بھٹک کر تحقیق ایسے گلی کوچوں میں جا پڑی ہو، جو بیکار ختم ہوجاتے ہوں، تو کیا نتیجہ ہوسکتا تھا نہیں اسی تحقیق اور فکر کے طریقوں میں

اور اپنی حکمت اور منطق کے نظام میں شدید انقلاب کی ضرورت ہے۔ ہمیں ایک نئے دستور العمل (آرگنن) کی ضرورت ہے جو ارسطو کے دستور العمل سے بہتر اور اس بڑے عالم کے لیے زیادہ موزوں ہو۔

اور اس طرح سے بیکن ہم کو اپنی اعلیٰ درجے کی کتاب دیتا ہے۔

۲۔ نیا دستور العمل

بیکن کا سب سے مخالف نقاد کہتا ہے کہ اس کا بہترین کارنامہ جدید دستور العمل (Novum Orgamum) کی پہلی کتاب ہے۔ کسی شخص نے منطق کے اندر ۱۴۲
اس قدر جان نہیں ڈالی، اور استقرا کو ایسی رزمی مہم اور فتح نہیں بنایا۔ اگر ایک شخص کو منطق پڑھنی ہی ہے، تو اس کتاب سے شروع کرنی چاہیے۔ "انسانی فلسفے کا یہ حصہ جو منطق سے بحث کرتا ہے اکثر لوگوں کو ناپسند ہوتا ہے، اور یہ انھیں پرخار موشگافی کے جال کے علاوہ معلوم نہیں ہوتا........ لیکن اگر ہم اشیا کی قدر و قیمت کا صحیح طور پر اندازہ کریں تو عقلی علوم باقی سب کی کنجی ہیں۔"

عرصے سے فلسفہ بنجر رہا ہے، کیونکہ اسے زرخیز بنانے کے لیے ایک نئے طریقے کی ضرورت تھی۔ یونانی فلاسفہ کی سب سے بڑی غلطی یہی تھی کہ وہ نظریے پر بہت زیادہ اور مشاہدے پر بہت کم وقت صرف کرتے تھے۔ مگر فکر کو مشاہدے کا خادم ہونا چاہیے نہ کہ اس کا بدل۔ نئے دستور العمل (Novum Organum) کا پہلا مقولہ ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر قسم کی مابعد الطبیعیات کے خلاف اعلان جنگ ہے کہ انسان فطرت کے کارپرداز و ترجمان ہونے کی حیثیت سے اسی قدر کرتا اور سمجھتا ہے جس قدر کہ نظام فطرت کے متعلق اس کے مشاہدات اس کو اجازت دیتے ہیں...... نہ وہ اس سے زیادہ جانتا ہے اور نہ جاننے کی قابلیت رکھتا ہے اس بارے میں سقراط کے متقدمین متاخرین کی نسبت زیادہ سمجھ دار تھے۔ خصوصاً دیما قریطوس بادلوں کے بجائے واقعات کا شائق تھا۔ اس لیے کچھ

تعجب کی بات نہیں ہے کہ ارسطو کے زمانے سے اب تک فلسفے نے اس قدر کم ترقی کی ہے۔ یہ ارسطو کے طریقے استعمال کرتا رہا ہے۔ ارسطو کی روشنی میں ارسطو سے آگے بڑھنا، یہ خیال کرنے کے مساوی ہے کہ ظلی روشنی اس اصل روشنی کو بڑھا سکتی ہے، جس سے کہ یہ لی گئی ہے۔ اب اس مشین سے جس کو ارسطو نے ایجاد کیا تھا دو ہزار سال کی منطق تراشی کے بعد فلسفہ اس قدر پست ہو گیا ہے کہ اس کی کوئی عزت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ قرون وسطیٰ کے یہ تمام نظریے مقالے اور مباحثے ترک کر دینے اور بھلا دینے چاہییں۔ اپنی تجدید کرنے کے لیے فلسفے کے واسطے یہ ضروری ہے کہ لوح سادہ اور ذہن صاف سے شروع کرے۔

لہٰذا عقل کی صفائی پہلا قدم۔ ہمیں چھوٹے بچوں کی طرح سے بتوں اور تجریدات سے معصوم اور تعصبات اور خیالات پیشیں سے صاف ہو جانا چاہیے۔ ہمیں ذہن کے بتوں کو برباد کر دینا چاہیے۔

ایک بت جس طرح سے کہ بیکن اس لفظ کو استعمال کرتا ہے (جس میں شاید پراٹسٹنٹوں کی ترک بت پرستی کی بھی جھلک ہے) ایک تصویر ہوتا ہے، جس کو حقیقت سمجھ لیا جاتا ہے، یعنی ایک خیال کو غلطی سے ایک شے سمجھ لیا جاتا ہے۔ غلطیاں اس عنوان کے تحت آتی ہیں، اور منطق کا پہلا مسئلہ یہ ہے کہ ان غلطیوں کے منبع کا پتہ لگایا جائے اور ان کی روک تھام کی جائے۔ اب بیکن مغالطات کی تحلیل کرتا ہے جو بجا طور پر مشہور رہے ہے۔ کانڈیلیک نے کہا ہے کہ انسانی غلطی کے اسباب کو بیکن سے بہتر کسی نے نہیں جانا۔ ۱۳۴

یہ غلطیاں حسب ذیل ہیں اول قبیلے کے بت — یعنی وہ مغالطے جو عموماً عالم انسان سے مخصوص ہیں۔ کیونکہ انسان کے احساس کو غلطی سے تمام چیزوں کا معیار سمجھ لیا جاتا ہے (پروٹاگورس کے نزدیک انسان تمام چیزوں کا پیمانہ ہے) اس کے برعکس تمام ادراکات، حواس اور ذہن دونوں کے انسان سے تعلق رکھتے ہیں نہ کہ کائنات سے، اور ذہن انسانی ان غیر ہموار آئینوں کے مشابہ ہے جو اپنے خواص مختلف چیزوں کو دیتے ہیں ...... اور ان کو بگاڑ اور ان کی شکل خراب کر دیتے ہیں۔ ہمارے خیالات اپنی تصویر

نہیں ہوتے بلکہ اپنے معروضات کی تصویر ہوتے ہیں۔ مثلاً" فہم انسانی اپنی خاص نوعیت کی بنا پر اشیا کے اندر اس سے زیادہ نظم و باقاعدگی فرض کر لیتا ہے، جتنی کہ یہ درحقیقت پاتا ہے .... اسی لیے یہ بات مشہور ہو گئی ہے کہ تمام اجرام سماوی مکمل دائروں میں حرکت کرتے ہیں۔" پھر

جب کوئی قضیہ مسلم ہو جاتا ہے (یا تو عام طور پر قبول کر لیے جانے کی بنا پر یا اس لذت کی بنا پر جو اس کی بنا پر ہوتی ہے) تو فہم انسانی ہر شے کو اس پر مجبور کرتا ہے کہ اس کی مزید تائید و تصدیق کرے۔ اور اگرچہ اس سے مخالف نہایت ہی یقینی اور بکثرت امثلہ موجود ہوں، مگر اس کے باوجود خود یا تو ان کو کوئی دیکھتا نہیں، یا ان سے نفرت کی جاتی ہے یا کسی امتیاز کے ذریعے سے شدید اور مضر تعصب کی بنا پر اس سے پیچھا چھڑا لیا جاتا ہے، مگر اس کے ابتدائی نتائج کے اقتدار کو قربان نہیں کیا جاتا۔ اس شخص نے جس کو دیوتاؤں کی قدرت کے تسلیم کرنے کے لیے مندر میں لے جا کر ان الواح کو دکھایا گیا تھا، جنھیں ایسے لوگوں نے عقیدت کے طور پر آویزاں کیا تھا جو سمندر کے خطرات سے بچ گئے تھے، کیا اچھا جواب دیا تھا .... مگر ان لوگوں کی تصاویر کہاں ہیں جو اپنی قسموں کے باوجود ہلاک ہوئے ہیں۔ ہر قسم کے توہم کا بالکل یہی حال ہے ۱۴۴
خواہ یہ نجوم کا ہو یا خوابوں کا ہو، یا شگونوں کا ہو، انتقامی عدالت وغیرہ کا ہو، ان سب میں گمراہ یقین رکھنے والے صرف ان واقعات کو دیکھتے ہیں جن میں یہ پورے ہوتے ہیں، مگر ان کی ناکامی کو نظر انداز کر دیتے ہیں، اگرچہ یہ بہت زیادہ عام ہوتی ہے۔

معاملے کا پہلے اپنے ارادے کے مطابق تصفیہ کر لینے کے بعد انسان پھر تجربے کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اور اپنی مرضی کے مطابق اس کو توڑ مروڑ کے اس کو قیدی کی حیثیت سے جلوس کی صورت میں لے کر نکلتا ہے۔ مختصر یہ کہ فہم انسانی کوئی خالص روشنی نہیں ہے، بلکہ اس میں ارادے اور تاثرات کے میل ملتے رہتے ہیں، اسی سے علوم نکلتے ہیں، جن کو مرضی کے مطابق علوم کہا جا سکتا ہے .... کیونکہ ایک شخص کو ایک چیز کے جس طرح سے

صحیح ہونے کی خواہش ہوتی ہے۔ اسی کو وہ جلدی سے یقین بھی کر لیتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہوتا؟

اس موقع پر بیکن ایک زریں مشورہ دیتا ہے .... عام طور پر فطرت کے ہر طالب علم کو اسے اصول قرار دے لینا چاہیئے کہ جس چیز کو تمہارا ذہن خاص تشفی کے ساتھ لیتا اور اس میں منہمک رہتا ہو اس کو مشتبہ سمجھو۔ اور اس قسم کے مسائل پر بحث کرتے وقت فہم کو استوار اور صاف رکھنے کے لیے اور بھی زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ فہم کو جزئیات سے بعیدی کلیات اور تعمیمات کی طرف اچکنے اور پرواز کرنے سے باز رکھنا چاہیئے .... اس کے لیے پر فراہم نہیں کرنے چاہییں بلکہ اس کے ساتھ وزن لٹکا دینے چاہئیں تاکہ یہ کودنے اور اڑنے سے باز رہے۔ تخیل عقل کا سب سے بڑا دشمن ہو سکتا ہے، حالانکہ اسے صرف اس کا قیاس اختبار ہونا چاہیئے۔

دوسری قسم کی غلطیوں کو بیکن مغالطۂ غار کہتا ہے ـــــ یہ غلطیاں افراد سے مخصوص ہوتی ہیں۔ کیونکہ ہر شخص اپنا علیحدہ بل یا غار رکھتا ہے، جو فطرت کی روشنی کو روکتا اور بد رنگ بناتا ہے۔ یہ اس کی سیرت ہوتی ہے، جو فطرت اور تربیت اور اس کے جسم اور نفس کی کیفیت یا حالت سے بنتی ہے۔ مثلاً بعض اذہان اپنی ساخت کے اعتبار سے تحلیلی ہوتے ہیں اور وہ ہر جگہ صرف فرقوں کو دیکھتے ہیں۔ بعض ترکیبی ہوتے ہیں اور صرف مشابہتوں کو دیکھتے ہیں۔ اس طرح سے ایک طرف تو حکیم اور مصور ہے، اور دوسری طرف شاعر اور فلسفی ہے۔ پھر بعض طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں جو قدیم چیزوں سے غیر محدود شغف رکھتی ہیں، بعض کو جدت کا شوق ہوتا ہے۔ صرف چند ایسے ہوتے ہیں جو حد اعتدال پر قائم رہتے ہیں اور نہ تو ان چیزوں کی دھجیاں بکھیرتے ہیں جن کو قدما نے صحیح طور پر ثابت کر دیا تھا، اور نہ اس زمانے کے لوگوں کی صحیح اختراعات سے نفرت کرتے ہیں صداقت میں فرقہ بندی نہیں ہے۔ ۱۴۵

تیسرے مغالطات سوق ہیں "جو لوگوں کی باہمی تجارت اور میل جول سے

پیدا ہوتے ہیں۔ کیونکہ لوگ آپس میں زبان کے ذریعے سے گفتگو کرتے ہیں، مگر لفظ مجمع کے فہم کے مطابق استعمال کئے جاتے ہیں۔ الفاظ کی ناقص اور نادرست ترکیب سے ذہن میں حیرت انگیز قسم کی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ فلسفی غیر محدود وں سے اسی بے پروا یقین سے پیش آتے ہیں جس طرح سے کہ اہل صرف و نحو مصادر سے پیش آتے ہیں۔ لیکن کیا کوئی شخص جانتا ہے کہ یہ غیر محدود کیا ہے، یا اس نے کبھی وجود رکھنے کی احتیاط سے کام لیا ہے؟ فلسفی کہتے ہیں کہ علت اولی کی کوئی علت نہیں یا حارک اول کو کوئی حرکت نہیں دیتا۔ مگر کیا یہ ترکیبیں ایسی نہیں ہیں جن سے اپنی لاعلمی کے چھپانے کا کام لیا جا رہا ہے، اور جو شاید استعمال کرنے والے کے ضمیر مجرم کا بھی پتا دے رہی ہیں۔ ہر صاف اور دیانت دار شخص جانتا ہے کہ کوئی علت ایسی نہیں ہو سکتی جس کی علت نہ ہو۔ اور نہ کوئی حارک ایسا ہو سکتا ہے جس کو کوئی دوسرا حرکت دینے والا نہ ہو۔ شاید فلسفے میں سب سے تعمیر جدید یہ صرف یہ ہو سکتی ہے کہ ہم دروغ گوئی چھوڑ دیں۔

(۵) آخر میں وہ مغالطے ہیں جو انسان کے ذہن میں فلاسفہ کے مختلف اعتقادات سے منتقل ہو کر آئے ہیں، اور ثبوت کے غلط قوانین بھی ہیں۔ ان کو میں تماشا گاہ کے مغالطے کہتا ہوں۔ کیونکہ میری رائے میں فلسفے کے تمام مسلمہ نظامات محض تمثیلیں ہیں جو اپنی پیدا کی ہوئی دنیا کو غیر حقیقی اور تماشے کے انداز میں ظاہر کرتی ہیں۔ اور اس فلسفی تماشے کی تمثیلوں میں تم وہی چیز دیکھ سکتے ہو، جو شاعروں کے تماشے میں پائی جاتی ہیں ـــــ یعنے وہ کہانیاں جو تماشے کی خاطر سے تصنیف کی جاتی ہیں تاریخ کی سچی کہانیوں کے مقابلے میں زیادہ مربوط و خوشنما ہوتی ہیں۔ دنیا کو جس طرح سے فلاطوں
بیان کرتا ہے وہ محض ایسی دنیا ہے، جس کو فلاطوں نے تعمیر کیا ہے اور دنیا ۱۸۶
کی نہیں بلکہ فلاطوں کی تصویر ہے۔

ہم صداقت کی طرف کبھی کچھ زیادہ ترقی نہیں کر سکتے اگر یہ مغالطے اب بھی ہمارے بہترین افراد کو ہر موڑ پر مبتلائے فریب رکھیں۔ ہمیں استدلال کے لیے طریقوں کی ضرورت ہے اور فہم کے لیے نئے آلات درکار ہیں۔ " اور

جس طرح غرب الہند کے وسیع علاقے کبھی دریافت نہ ہوتے، اگر ان سے پہلے قطب نما ایجاد نہ ہو گیا ہوتا اسی طرح سے کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ فنون کے انکشاف و ترقی نے علوم کے ایجاد و اختراع کرنے کے فن کے معلوم نہ ہونے کی وجہ سے کوئی بہت زیادہ ترقی نہیں کی ہے۔" اور بلا شبہہ یہ بات نہایت اہانت انگیز ہو گی کہ مادی کرے کے علاقوں کی .... تو ہمارے زمانے میں اس قدر تحقیق و انکشاف ہو جائے مگر عقلی کرہ قدیم انکشافات کی تنگ حدود کے اندر بند رہے۔

در اصل ہماری تکالیف کا باعث اعتقاد و استنباط ہے۔ ہمارے کسی نئی حقیقت کے دستیاب نہ ہونے کی یہ وجہ ہے کہ ہم کسی محترم مگر مشکوک قضیے کو نقطۂ آغاز بناتے ہیں، اور خود اس مسئلے کو کبھی مشاہدے اور اختبار کی کسوٹی پر نہیں پرکھتے۔ اب اگر کوئی شخص آغاز یقینات سے کرے گا تو ضروری ہے کہ اس کا ختم شکوک پر ہو گا۔ لیکن اگر وہ آغاز شکوک سے کرنے پر راضی ہو جائے تو ضروری ہے کہ وہ ختم یقینات پر کرے گا" (مگر افسوس یہ بات بالکل لازمی نہیں ہے)۔ یہاں پر ہم کو وہ بات نظر آ رہی ہے جو فلسفۂ جدید کے عنفوان شباب میں بہت عام تھی، اور اس کے اعلان آزادی کا جزو تھی... ابھی تھوڑی دیر میں ڈیکارٹ بھی باقاعدہ شک کی ضرورت پر گفتگو کرے گا، اور کہے گا کہ یہ ایک دیانت دار آدمی کے فکر کے لیے ایسی ضرورت پیش ہے جو جالوں کو صاف کرتی ہے۔

آگے چل کر بیکن حکمی طریقۂ تحقیق کو نہایت عمدگی سے بیان کرتا ہے، صرف سادہ تجربہ باقی رہ جاتا ہے، جس کو اگر اس طرح سے لیا جائے جس طرح سے کہ یہ اب ہے تو یہ اتفاق کہلاتا ہے ("تجربی") اور اگر کوشش سے پیدا کیا جائے تو اختبار کہلاتا ہے، .... تجربے کا صحیح طریقہ پہلی بار شمع کو روشن کرتا ہے" (مفروضہ) اور شمع کی روشنی سے راستہ دکھاتا ہے (یعنے اختبار کو مرتب و متعین کرتا ہے) اس کا آغاز مرتب و منظم تجربے سے ہوتا ہے نہ کہ گڑبڑ ۱۴۷
بے قاعدہ تجربے سے، اس سے کلیات مستنبط کئے جائیں اور ثابت شدہ

کلیات سے نئے اختبارات کیے جائیں۔ (یہاں پر ہم مفروضہ اختبار اور استخراج کی اس ضرورت کو تسلیم کرتا ہوا پاتے ہیں، جس کی نسبت بعض نقادوں کا خیال ہے کہ بیکن نے ان کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا، بعد کو ایک اور عبارت بھی آتی ہے جس میں ابتدائی اختبار کے نتائج کو انگور کی پہلی فصل کہا گیا ہے، مگر اس میں شک نہیں کہ ان کی ضرورت کو ناکافی طور پر تسلیم کیا ہے ہمیں کتابوں روایتوں اور سندوں کے بجائے فطرت کے پاس جانا چاہیے۔ ہمیں فطرت کو شکنجے میں کس کر اسے شہادت پر مجبور کرنا چاہیے اگرچہ یہ اس کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، تاکہ ہم اس کو قابو میں کر کے اپنے مقاصد میں اس سے کام لے سکیں۔ ہمیں ہر جگہ سے عالم کی طبیعی تاریخ جمع کرنی چاہیے، جس کو یورپ کے اہل حکمت کی متحدہ کوشش نے تیار کیا ہے۔ ہم کو استقراء سے کام لینا چاہیے۔

لیکن استقراء محض کل معطیات کے بیان کر دینے کا نام نہیں ہے، اس کو تو لا متناہی اور بے کار خیال کیا جا سکتا ہے۔ مادے کی کوئی مقدار بجائے خود حکمت نہیں بنا سکتی۔ یہ تو ایک کھلے علاقے میں شکار کا پیچھا کرنے کے مساوی ہوگا، ہمیں اپنے شکار کو گرفتار کرنے کے لیے اپنے میدان کو تنگ اور محصور کرنا چاہیے۔ استقراء کے طریقے میں معطیات اصطفاف اور مفروضات کے تخرجے کے فن بھی شامل ہونے چاہئیں۔ اس طرح سے توجیہات کے بتدریج تخرجے سے آخر کار صرف ایک باقی رہ جائے گی۔ اس فن میں غالباً سب سے اہم کم و بیش کا جدول ہے، جس میں ان اشلہ کی فہرست ہوتی ہے جن میں دو وصف یا حالتیں ایک ساتھ گھٹتے یا بڑھتے ہیں اور اس طرح سے ایک ساتھ متغیر ہونے والے مظاہر کے مابین ایک ربط علّی ظاہر ہونے کا قرینہ ہوتا ہے۔ اس طرح سے بیکن سوال کر کے کہ حرارت کیا ہے؟ کسی ایسے عامل کی تلاش کرتا ہے جو حرارت کے بڑھنے سے بڑھتا اور اس کے گھٹنے سے گھٹتا ہو۔ بڑی لمبی تحلیل کے بعد وہ حرارت اور حرکت کے مابین ایک قطعی تضایف پاتا ہے۔ اور اس کا یہ نتیجہ کہ حرارت حرکت کی ایک صورت ہے، علم طبیعی میں اس کے چند مخصوص اضافوں میں سے ایک ہے۔

۱۸۸ معطیات کی جمع و تحلیل پر اس قدر زور دینے کے بعد ہم بیکن کی اصطلاح میں مظہر زیر مطالعہ کی صورت پر آتے ہیں یعنے اس کی مخفی فطرت اور داخلی ماہیت پر۔ بیکن کے یہاں نظریۂ صور فلاطون کے نظریے کے بہت مشابہ ہے۔ یعنے یہ حکمت کی مابعد الطبیعیات ہے۔ "جب ہم صور کا ذکر کرتے ہیں تو ہماری مراد سادہ عمل کے قوانین و قواعد کے علاوہ کسی شے سے نہیں ہوتی جو کسی سادہ فطرت کو مرتب و قائم کرتے ہیں .... لہذا حرارت کی صورت یا روشنی کی صورت کے معنے حرارت کے قانون یا روشنی کے قانون کے علاوہ نہیں ہیں۔" (اسی انداز میں اسپی نوزا کہنے والا تھا کہ دائرے کا قانون اس کا جوہر ہے) کیونکہ اگرچہ فطرت میں انفرادی اجسام کے علاوہ کوئی چیز موجود نہیں ہے، جو جزئی قوانین کے مطابق واضح انفرادی اثرات دکھاتے ہیں، مگر اس کے باوجود علم کے ہر شعبے میں یہی قوانین (ان کی تحقیق ان کا انکشاف اور ان کی ترقی) نظریے اور عمل دونوں کی بنیاد ہیں۔ نظریہ ہو یا عمل ان میں سے ایک دوسرے کے بغیر بیکار اور خطرناک ہے۔ ایسا علم جو کسی کامرانی کا باعث نہ ہو، ایک زرد اور بے دم چیز ہے جو بنی نوع انسان کے شایان شان نہیں ہے۔ ہم اشیا کی صور کے جاننے کی محض صور کی خاطر کوشش نہیں کرتے، بلکہ اس لیے کوشش کرتے ہیں کہ صور یعنے قوانین کو جان کر ہم اشیا کو اپنی خواہش کے مطابق پھر بنا سکیں۔ اسی طرح سے ہم ریاضیات کا مطالعہ اس لیے کرتے ہیں کہ مقداروں کا حساب کر سکیں اور پل تعمیر کر سکیں۔ نفسیات اس لیے پڑھتے ہیں کہ معاشرے کے جنگل میں راستہ معلوم کر سکیں۔ جب حکمت اشیا کی صورتوں کو کافی طور پر دریافت کر سکے گی تو عالم محض ایک خام مواد ہوگا، جس سے انسان جیسا چاہے یوٹوپیا بنائے۔

۳۔ حکمت کا یوٹوپیا

اس طرح پر حکمت کی تکمیل کرنا، اور پھر معاشری نظام کی باگ حکمت کے

سپرد کر دینا ہی کافی یوٹوپیا ہوگا۔ ہمارے لیے بیکن اپنی مختصر اور آخری کتاب دی نیو اٹلانٹس میں، جو اس کی موت سے دو سال پہلے شائع ہوئی تھی، ایسی دنیا کو بیان کرتا ہے۔ ویلس اس کو سب سے بڑی خدمت خیال کرتا ہے جو بیکن نے حکمت کی انجام دی ہے کہ اس نے ہمارے لیے ایسے معاشرے کی تصویر کھینچی ہے جس میں آخر کار حکمت کو اشیا کے مالک ہونے کی صحیح جگہ مل گئی۔ ۱۴۹ یہ تخیل کا ایک شاہی کارنامہ تھا جس نے تین صدی تک علم و ایجاد کی خاطر جہد و افلاس سے جنگ کرنے والوں کی عظیم الشان فوج کے سامنے ایک مقصد رکھا۔ ان چند صفحات میں فرنسیس بیکن کا جوہر اور صورت ہے۔ جو اس کے وجود اور اس کی زندگی کا قانون اور اس کی روح کی مخفی اور مسلسل آرزو ہے۔

فلاطون نے تیمیس میں ایٹلانٹس کا پرانا قصہ بیان کیا تھا جو ایک بر اعظم تھا جو مغربی سمندروں میں غرق آب ہو گیا تھا۔ بیکن اور دوسرے لوگوں نے کولمبس اور کیبٹ کی نئی امریکہ کو اس پرانے ایٹلانٹس کے مطابق سمجھا تھا۔ وہ عظیم الشان بر اعظم غرق آب نہ ہوا تھا بلکہ صرف انسانوں کی سمندر میں جہاز رانی کرنے کی قوت فنا ہو گئی تھی۔ چونکہ اس قدیم ایٹلانٹس کا علم ہو گیا تھا، اور یہ کافی طاقتور نسل سے آباد معلوم ہوتا تھا لیکن جو بیکن کے تخیل کے مطابق یوٹوپیا والوں کی طرح سے شاندار نہ تھے، اس لیے اس نے ایک نئے ایٹلانٹس کا تخیل کیا، جو دور دراز بحر الکاہل میں ایک جزیرہ ہے جس پر سے صرف ڈریک اور میگیلن کا گزر ہوا تھا۔ ایسا جزیرہ جو یورپ اور علم سے اس قدر دور تھا کہ اس میں یوٹوپیائی تخیل کے لیے کافی گنجائش تھی۔

کہانی نہایت ہی ماہرانہ سادگی سے شروع ہوتی ہے جس طرح سے ڈیفو اور سوئفٹ کے افسانے شروع ہوتے ہیں۔ ہم پیرو سے روانہ ہوئے (جہاں ہم پورے سال بھر رہے تھے) اور ہمارا جنوبی سمندر کے ذریعے سے چین اور جاپان جانے کا خیال تھا۔ اچانک سمندر میں ایک عظیم الشان سکون برپا ہوا جس میں جہاز ہفتوں وسیع سمندر پر اس طرح سے خاموش

پڑے رہے جس طرح سے آئینے پر دھبے اور اس اثنا میں مسافروں کا سامان خورد و نوش ختم
ہوتا رہا۔ اور پھر بے پناہ ہواؤں نے جہاز کو بے رحمی سے شمال کی طرف پھینکنا شروع کیا اور
ہم اس جزیرے سے جس کا جنوب میں نشان تھا سمندر کے بے پناہ ویرانے میں جا پڑے۔
خوراک بار بار کم کی گئی اور اہل جہاز پر بیماری کا تسلط ہو گیا۔ آخر کار جب وہ لوگ اپنے آپ کو
مردہ سمجھ چکے تھے' تو انھوں نے اچانک ایک خوبصورت جزیرہ قریب آتے ہوئے دیکھا کنارے پر
جب ان کا جہاز قریب آیا انھوں نے وحشیوں کو نہیں دیکھا بلکہ ایسے آدمیوں کو دیکھا جو سادگی
مگر خوبصورتی کے ساتھ صاف ستھرا لباس پہنے ہوئے تھے اور قطعی طور پر ترقی یافتہ
عقل کے معلوم ہوتے تھے۔ ان کو خشکی پر آنے کی اجازت دی گئی مگر ان سے یہ کہدیا گیا کہ
جزیرے کی حکومت کسی اجنبی کو رہنے کی اجازت نہیں دیتی مگر چونکہ کچھ ملاح علیل تھے اس لیے وہ ۵۰
اس وقت تک ٹھیر سکتے ہیں جب تک کہ یہ سب اچھے ہوں۔

صحت یابی کے ہفتوں میں سیاحوں نے روز بروز نئے ایٹلانٹس کے
راز کو معلوم کرنا شروع کیا۔ باشندوں میں سے ایک کا بیان ہے کہ تقریباً
انیس سو برس ہوئے کہ اس جزیرے میں ایک بادشاہ گزرا تھا جس کی یاد کو
ہم لوگ سب سے زیادہ محترم جانتے ہیں............ اس کا نام سلاموناتھا
اور ہم اس کو اپنی قوم کا پیمبر خیال کرتے ہیں۔ بادشاہ بڑے دل والا تھا اور
وہ اپنی سلطنت اور رعایا کو پر مسرت بنانے پر تلا ہوا تھا۔ اس بادشاہ کے
عمدہ کاموں میں سے ایک کام سب پر فوقیت رکھتا تھا۔ یہ ایک ادارے
یا جماعت کی تخلیق تھی جو مکان سلیمانؑ کہلاتا ہے ہمارے خیال میں یہ
شریف ترین بنیاد ہے جو کبھی زمین پر رکھی گئی ہے اور یہ اس سلطنت
کی قندیل ہے۔

اس کے بعد مکان سلیمانؑ کا بیان آتا ہے' یہ اس قدر پیچیدہ ہے کہ
اس کا کہیں کہیں سے اقتباس نہیں کیا جا سکتا' مگر اس قدر فصیح بھی ہے کہ
میکالے باوجود مخالف ہونے کے یہ کہنے پر مجبور رہے' کہ انسانی تصنیف میں
اس سے زیادہ عالمانہ اور حکیمانہ کوئی عبارت نہیں ہے۔ نئے ایٹلانٹس
میں مکان سلیمانؑ لندن کے پارلیمنٹ کے ایوانوں کی جگہ لے لیتا ہے۔ یہ

جزیرے کی حکومت کام کرتی ہے۔ لیکن یہاں نہ اہل سیاست ہیں اور نہ بدتمیز
'' منتخب اشخاص'' ہیں اور نہ قومی خوشامدی ہیں جیسا کہ کارلائل کہے گا نہ فریق
بندیاں ہیں، نہ انتخابی جماعتیں ہیں، نہ انتخابی معرکے ہیں، نہ باوردی ملازم ہیں نہ
چھاپے خانے ہیں نہ اخباروں کے افتتاحی مقالے ہیں، نہ تقریریں ہیں نہ جھوٹ
ہیں اور نہ انتخابات۔ کسی سرکاری عہدے کے پُر کرنے کے یہ تماشا نما طریقے
ان ایٹلانٹیوں کے دماغ میں کبھی نہیں آتے ہیں۔ لیکن حکمی شہرت کی بلندیوں کی
سڑک سب کے لیے یکساں طور پر کھلی ہوئی ہے، اور صرف وہ لوگ جنھوں نے
سڑک کو طے کیا ہے، حکومت کی مجلسوں میں بیٹھتے ہیں۔ یہ قوم کی حکومت ہے
اور قوم کے لیے جس کو چند چیدہ آدمی چلاتے ہیں، یہ ایسی حکومت ہے جس کو
ماہرین فن انجینیر ہیئت داں ارضیاتی حیاتیاتی، طبیعیاتی کیمیاداں معاشیاتی ۱۵۱
عمرانیاتی نفسیاتی اور فلسفی چلا رہے ہیں۔ یہ کافی پیچیدہ ہے مگر خیال تو کرو کہ
حکومت سیاست دانوں کے بغیر۔

درحقیقت نئے ایٹلانٹس میں کوئی حکومت ہے بھی نہیں۔ یہ حاکم
انسانوں پر حکومت کرنے کے بجائے فطرت کے قابو میں رکھنے میں مصروف
رہتے ہیں "ہماری بنیاد کی غایت علم کے علل اور اشیا کی حرکات کا راز ہیں،
اور سلطنت انسانی کی حدود میں وسعت دینا ہے جس کی وجہ سے تمام چیزیں
ممکن ہو جائیں''، کتاب کا اور رفرینس بیکن کا یہ کلیدی جملہ ہے۔ ہم حاکموں کو
ایسے ادنیٰ کاموں میں مصروف دیکھتے ہیں جیسے ستاروں کے مطالعے میں
اشیا سے صنعتی کاموں کے لیے قوت حاصل کرنے کے انتظام میں مختلف
امراض کے علاج کے لیے گیسوں کی ایجادیں، جراحی کا علم حاصل کرنے
کے لیے جانوروں پر اختبار کرنے میں مختلف انواع کے میل سے نئے پودے
اور نئے حیوانات تیار کرنے میں وغیرہ۔ "ہم جانوروں کی پرواز کی نقل
کرتے ہیں اور کسی حد تک ہم کو ہوا میں اڑنا آگیا ہے، ہمارے پاس پانی
کے اندر جانے کے لیے جہاز اور کشتیاں ہیں''۔ وہاں بیرونی تجارت ہے
مگر غیر معمولی قسم کی۔ جزیرے میں جو کچھ صرف ہوتا ہے وہ وہاں پیدا

ہوجاتا ہے اور جو کچھ پیدا ہوتا ہے وہ صرف ہو جاتا ہے سارے بیرونی منڈیاں حاصل کرنے کے لیے لڑائی کی ضرورت نہیں ہوتی۔" ہمارے یہاں سونے چاندی جواہرات ریشم اور گرم مصالحہ کی تجارت نہیں ہوتی اور نہ کسی دوسری جنس یا سامان کی ہوتی ہے۔ بلکہ صرف خدا کی پہلی مخلوق کی ہوتی ہے جو کہ روشنی ہے۔ دنیا کے تمام حصوں کے نشوونما کی روشنی حاصل کرنا۔ یہ سوداگران نور مکان سلیمانؑ کے رکن ہیں جن کو ہر بارہ سال میں ایک مرتبہ مہذب دنیا کے ہر حصے میں رہنے کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ وہ ان کی زبان سیکھتے ہیں اور ان کے علوم صنعتیں اور ادبیات کو حاصل کرتے ہیں، بارہ سال کے ختم پر واپس آکر اپنی تحقیقات کا حال مکان سلیمانؑ کے سرداروں سے بیان کرتے ہیں اور باہران کی جگہ نئے حکمی محقق چلے جاتے ہیں۔ اس طرح سے دنیا کی بہترین چیزیں بہت ہی جلد نئے ایٹلانٹس میں آجاتی ہیں۔

۱۵۲ یہ تصویر اگرچہ مختصر ہے مگر ہم اس کے اندر پھر ہر فلسفی کے یوٹوپیا کا نقشہ دیکھ لیتے ہیں —— یعنے ایک قوم ہے جو امن معتدل خوشحالی کے ساتھ رہتی ہے اور ان کے بہترین آدمی حکومت کرتے ہیں۔ ہر صاحب فکر بس اسی کا خواب دیکھتا ہے کہ سیاسی آدمی کی جگہ حکیم کو دیدی جائے۔ اتنی ہئیت کی تبدیلیوں کے بعد بھی یہ اب تک خواب ہی کیوں ہے؟ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ مفکر سویا ہوا عقلی ہے کہ معاملات کے اکھاڑے میں نہیں اترتا، اور تصور کو حقیقت میں تعمیر نہیں کرتا۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ تنگ نظر طامع کی سخت حرص فلاسفہ اور اولیا کی نرم اور محتاط آرزوؤں پر ہمیشہ غلبہ رکھے گی۔ یا اس کی وجہ یہ ہے کہ حکمت ابھی بلوغ اور شعوری قوت کو نہیں پہنچی ہے —— یہ کہ ہمارے زمانے میں علمائے طبیعیات و کیمیا اور ماہرین صنعت اس بات کو سمجھنے لگے ہیں کہ صنعت اور جنگ میں حکمت کا بڑھتا ہوا حصہ ان کو معاشری تدبیر میں ایک مرکزی حیثیت دینے والا ہے، اور اس زمانے کی طرف اشارہ کر رہا ہے جب کہ ان کی منظم قوت دنیا کو اس بات پر آمادہ کر دیگی کہ ان کو قیادت کی دعوت دے۔ شاید ابھی حکمت دنیا پر

غلبہ پانے کی اہل نہیں ہوئی ہے، اور شاید تھوڑے ہی عرصے میں یہ اس کی اہل ہو جائے گی۔

انتقاد

فرینسس بیکن کے اس فلسفے کی قدر و قیمت کیا ہے؟ کیا اس کے اندر کوئی چیز نئی ہے؟ میکالے کا خیال ہے کہ استقرا کو جس طرح سے بیکن بیان کرتا ہے، وہ ایک بہت پرانی چیز ہے۔ اس کے خلفشار برپا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، چہ جائیکہ اس کے اوپر کوئی یادگار قائم کی جائے۔ استقرا پر جب سے کہ دنیا کا آغاز ہوا ہے ہر انسان صبح سے شام تک عمل کرتا رہتا ہے۔ جو شخص یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ منس پائی (ایک انگریزی کھانا) میرے مزاج کے خلاف پڑتی ہے کیونکہ اس نے اس کو کھایا تو اس کی طبیعت خراب ہوگئی اور جب نہیں کھایا تو اچھا رہا، اور جب اس کو سب سے زیادہ کھایا تو سب سے زیادہ بیمار رہا ہے اور جب سب سے کم کھایا تو سب سے کم بیمار رہا تو وہ غیر محسوس مگر کافی طور پر نووم ارگینم کے تمام جدولوں کو استعمال کر جاتا ہے۔ لیکن جان اسمتھ اپنے جدول بیش و کم سے مشکل ہی اس قدر صحت کے ساتھ کام لیتا ہے، اور بہت زیادہ قرینہ اس امر کا ہے کہ وہ اپنے طبقۂ اسفل کے بھونچالی اختلالات کے باوجود بھی منس پائی کھاتا رہے۔ اور اگر جان اسمتھ اس قدر عقلمند ہو بھی تو بھی اس سے بیکن کے کمال میں تو کمی نہیں آتی، کیونکہ منطق تو صرف عقلمندوں اور داناؤں کے تجربے اور طریقوں کو مرتب کرتی ہے۔ کوئی علم اس کے علاوہ کر ہی کیا ہے کہ چند افراد کے فن کو اصول کے ذریعے سے ایسی حکمت میں بدل دے جس کی سب کو تعلیم دی جا سکے۔ ۱۵۳

مگر کیا یہ تدوین بیکن کی ہے؟ کیا سقراطی طریقہ استقرائی نہیں ہے۔ کیا ارسطو کی حیاتیات استقرائی نہیں ہے، کیا روجر بیکن استقرائی طریقے پر عمل اور اس کی تلقین، دونوں نہیں کرتا تھا جن کی فرینسس بیکن صرف تلقین ہی کرتا ہے۔

کیا گلیلو نے اس طریق عمل کو جو حکمت نے واقعتاً استعمال کیا ہے، بہتر طریق پر بیان نہ کیا تھا۔ روجر بیکن کے متعلق تو یہ بات سچ ہے مگر گلیلو کے متعلق اس سے کم سچ ہے ارسطو کے متعلق اور بھی کم سچ ہے اور سقراط کے متعلق سب سے کم گلیلو نے حکمت کا طریقہ نہیں بلکہ اس کا مقصد بیان کیا ہے، اور اس کے متبعین کو بتایا مقصد تمام تجربات اور روابط کی ریاضیاتی اور مقداری تدوین ہونی چاہئے۔ ارسطو استقرا سے اس وقت کام لیتا تھا جب اس کے پاس اور کوئی طریقہ باقی نہ رہ جاتا تھا اور جہاں مواد اس لائق نہ ہوتا تھا کہ شاندار عام مسلمات سے خاص نتائج اخذ کئے جا سکیں۔ سقراط استقرا (معطیات کا جمع کرنا) سے اس قدر کام نہ لیتا تھا جتنا کہ تحلیل اور الفاظ و تصورات کی تعریف و امتیاز سے کام لیتا تھا۔

بیکن قطعی جدت کا مدعی نہیں ہے۔ شیکسپیر کی طرح سے وہ ایک نوابی ہاتھ سے لیتا ہے، اور اسی بہانے سے کہ وہ جس چیز کو چھوتا ہے اس کو آراستہ کر دیتا ہے۔ ہر آدمی اپنے ذرائع رکھتا ہے جس طرح سے ہر عضویہ اپنی غذا رکھتا ہے۔ اس کی مخصوص چیز وہ طریقہ ہوتا ہے جس طرح سے کہ وہ اس کو ہضم کرتا ہے، اور اس کو گوشت اور خون میں بدلتا ہے۔ جیسا کہ رالے کہتا ہے کہ "بیکن کسی آدمی کے مشاہدے کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتا بلکہ اپنی مشعل کو ہر شخص کی شمع سے روشن کرنا چاہتا ہے"۔ مگر وہ ان استفادوں کو تسلیم کرتا ہے۔ وہ بقراط کے اس مفید طریقے کا حوالہ دیتا ہے ——— اور اس طرح سے ہم کو یونانیوں کی استقرائی منطق کی اصل جڑ تک پہنچا دیتا ہے۔ اور وہ لکھتا ہے کہ فلاطون استقرا کے ذریعے سے تحقیق کرنے اور جزئیات پر نظر رکھنے کی ایک عمدہ مثال دیتا ہے (جہاں کہ ہم غلطی سے سقراط لکھتے ہیں) مگر ایسے گریزاں انداز میں جو کوئی قوت یا نتیجہ نہیں رکھتی۔ اس نے اپنے متاخرین سے ان احسانات کے متعلق حجت کرنے سے نفرت کی ہوتی اور ہمیں ان کے متعلق مبالغہ کرنے سے نفرت ۱۵۴
کرنی چاہئے۔

مگر پھر کیا بیکن کا طریقہ صحیح ہے؟ کیا یہی وہ طریقہ ہے جو جدید حکمت میں سب سے زیادہ مفید طور پر استعمال ہوتا ہے۔ نہیں، عموماً حکمت نے

جس طریقے سے بہترین نتائج حاصل کئے ہیں وہ جمع معطیات ("طبیعی تاریخ") اور نو ویم آرگینیم کے پیچیدہ جدولوں کے ذریعے سے ان کی تہذیب و ترتیب کا نہیں ہے، بلکہ مفروضہ استخراج اور اختبار کا سادہ طریقہ ہے۔ اسی طرح سے ڈارون کو آبادی پر میلتھس کا مضمون پڑھتے ہوئے یہ خیال پیدا ہوا تھا، کہ میلتھس کے اس مفروضے کو کہ آبادی وسائل معاش کی نسبت زیادہ سرعت کے ساتھ بڑھنے پر مائل ہے، اس مفروضے سے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ غذا کی فراہمی پر آبادی کا دباؤ بڑھنے سے تنازع بقا ہوتا ہے، جس میں صرف اصلح باقی رہتا ہے، اور اس سے ہر نسل میں ہر نوع ماحول کے زیادہ سے زیادہ مطابق ہوتی جاتی ہے اور آخر میں (مفروضے اور استخراج کے ذریعے سے اپنے مسئلے اور میدان مشاہدہ کو محدود کر کے) وہ فطرت کے شگفتہ چہرے کی طرف متوجہ ہوا، اور دس سال تک صبر سے واقعات کا استقرائی امتحان کرتا رہا۔ پھر آئین سٹائین نے اس مفروضے کو خود قائم کیا یا لوئن سے لیا کہ روشنی سیدھی نہیں بلکہ خط منحنی میں سفر کرتی ہے، اور اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ ایک ستارہ (سیدھے خط کے نظریے کے مطابق) جو آسمان میں ایک خاص مقام پر معلوم ہوتا ہے دراصل اس مقام سے ایک طرف کو ہٹا ہوا ہوتا ہے، اور اس نے اس نتیجے کی جانچ کے لیے اختبار اور مشاہدے کی دعوت دی۔ ظاہر ہے کہ مفروضے اور تخیل کا کام اس سے زیادہ ہے، جتنا کہ بیکن نے فرض کیا تھا۔ اور حکمت کا طریق عمل اس سے زیادہ سیدھا اور مختصر ہے جتنا کہ بیکن کی اسکیم میں ہے۔ خود بیکن کو اپنے طریقے کے ایک وقت میں دقیانوسی ہو جانے کا پہلے سے خیال تھا۔ حکمت کا واقعی عمل اس سے بہتر طرق تحقیق دریافت کرے گا جیسا کہ تدبر و سیاست کے دفعوں کے اندر بیان کیا جا سکتا ہے۔ "ان چیزوں کے پختہ ہونے کے لیے قرن چاہئیں۔"

بیکن کی روح کے دوست رکھنے والا بھی یہ تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ذی مرتبت چانسلر حکمت کے لیے قانون بناتے وقت اپنے زمانے کی حکمت ۱۵۵
کے ساتھ رہنے سے قاصر رہا۔ وہ کاپرنیکس کی تردید اور کیپلر اور ٹائکو براہی کو

نظر انداز کرتا تھا۔ گلبرٹ کی اس کے ذہن میں کوئی وقعت نہ تھی، اور ہاروے سے تو لاعلم معلوم ہوتا تھا۔ درحقیقت وہ تحقیق کی نسبت گفتگو کو زیادہ پسند کرتا تھا۔ یا شاید اس کے پاس زحمت طلب تحقیقات کے لیے وقت نہ تھا۔ حکمت اور فلسفے میں جو کام اس نے کیا ہے وہ اس کی موت کے وقت پریشان اور پارہ پارہ پڑا تھا، اور اعادوں تناقضات آرزوؤں اور تمہیدات سے بھرا ہوا تھا، Ars longa, vita brevis کام بہت ہے اور وقت تھوڑا ہے یہ ہر بڑی روح کا حزنیہ ہوتا ہے۔

اس قدر ضرورت سے زیادہ مصروف شخص سے جسے فلسفے کی تعمیر جدید کے لئے ایک پریشان اور پر بار سیاسی زندگی کے وقفوں ہی بہ مشکل گنجائش ملی تھی شیکسپیر کی طویل اور پیچیدہ تصنیف کو منسوب کرنا بیکار قیاس آرائی کرنے والوں کے بے صرفہ مباحثوں میں متعلم کا وقت ضائع کرنے کے مساوی ہے۔ شیکسپیر میں ٹھیک اُسی چیز کی کمی ہے جو لارڈ چانسلر صاحب کی ممتاز خصوصیت ہے یعنے تبحر اور فلسفہ شیکسپیر کو بہت سے علوم سے موثر واقفیت معلوم ہوتی ہے، مگر مہارت کسی میں بھی معلوم نہیں ہوتی۔ وہ سب میں ایک غیر پیشہ ور کی روانی کے ساتھ بولتا ہے۔ وہ نجوم کو تسلیم کرتا ہے۔ "یہ عظیم الشان حکمت .... جس پر ستارے مخفی اثر سے تبصرہ کرتے ہیں"[1] وہ ہمیشہ ایسی غلطیاں کرتا رہتا ہے جو فاضل بیکن سے ممکن نہیں ہو سکتی تھیں۔ اس کا ہیکٹر ارسطو کو اقتباس کرتا ہے اور اس کا کاروِلینس کیٹو کا حوالہ دیتا ہے۔ وہ لبو پرکیلیا کو پہاڑ فرض کرتا ہے، اور سیزر کو اس قدر فاضل تصور کرتا ہے جتنا کہ ایچ جی ویلس سمجھتا ہے۔ وہ اپنی ابتدائی زندگی اور ازدواجی مصائب کے لاتعداد حوالے دیتا ہے۔ وہ ایسی سوقیت فحش اور ضلع جگت کا مرتکب ہوتا ہے۔ جو ایک ایسے معتدل خود فروش میں بالکل قدرتی معلوم ہوتے ہیں جو اپنی اسٹیفرڈ کی پر شور زندگی اور اپنے قصاب کا بیٹا ہونے بالکل بھلا نہیں سکا تھا، مگر جن کی خاموش و سنجیدہ فلسفی سے

---

[1] ۔سانٹ نمبر ۱۵

ہرگز توقع نہیں کی جا سکتی۔ کارلائل شیکسپیر کو سب سے بڑا عاقل کہتا ہے، مگر وہ اس کے بجائے سب سے بڑا صاحب تخیل اور سب سے زیادہ تیز نظر تھا۔ وہ ایسا نفسیاتی ہے کہ اس کی نظر سے کوئی بات بچ نہیں سکتی مگر وہ فلسفی نہیں ہے۔ اپنی زندگی اور بنی نوع انسان کی زندگی کے لیے کوئی فکری عمارت نہیں رکھتا جس کو ایک مقصد نے وحدت بنایا ہو۔ وہ عشق اور اس کے مسائل میں غرق ہے، اور فلسفے کا ماننا نے کی تراکیب کے ذریعے سے صرف اس وقت خیال کرتا ہے، جب وہ دل شکستہ ہوتا ہے اور تمام حالات میں وہ دنیا کو خوشی خوشی قبول کرتا ہے، اس کو تعمیر جدید کا کوئی خیال پریشان نہیں کرتا جس نے فلاطون یا نیٹشے یا بیکن کی زندگی کو بلند مرتبہ بنایا تھا۔ ۱۵۶

بیکن کی عظمت اور اس کی کمزوری ٹھیک اس کے شوق وحدت میں ہے، یعنے اس کی اس خواہش میں کہ اپنی مربوط کن ذہانت کے پر ایک سو علوم پر پھیلا دے۔ اس کو فلاطون جیسا انسان بننے کی آرزو تھی، یعنے ایک بلند ذہانت کا انسان جو ہر چیز کو اس طرح سے دیکھتا ہو کہ گویا ایک بلند چٹان پر سے دیکھتا ہے۔ وہ ان کاموں کے وزن میں دب گیا جو اس نے اپنے اوپر عائد کر لیے تھے۔ وہ ناکام رہا ہے مگر اس کی ناکامی قابل عفو ہے، کیونکہ اس نے اپنے ذمے اتنا بہت سا کام لے لیا تھا۔ وہ حکمت کی موعودہ سرزمین میں داخل نہیں ہو سکا مگر جیساکہ کاولی کے لوح مزار کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے، وہ کم از کم اس کی سرحد پر تو کھڑا ہو سکا جہاں سے وہ اس کے خوبصورت خط و خال کی طرف دور سے اشارہ کر سکتا تھا۔

اس کی کامیابی اس اعتبار سے کچھ کم عظیم الشان نہ تھی کہ بالواسطہ تھی۔ اس کی فلسفی تصانیف اگرچہ اب نہیں پڑھی جاتیں مگر انھوں نے ان عقلوں کو حرکت دی ہے، جو محرک عالم نہیں۔ اس نے اپنے آپ کو رجائیت اور نشاۃ جدیدہ کے عزم کی پرگو آواز بنایا۔ کبھی کوئی شخص دوسرے مفکرین کے لیے اتنا بڑا ہیج نہیں بنا ہے۔ یہ سچ ہے شاہ جیمس نے حکمت کی امداد کے لیے اس کی تجویز کے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور نویم ارگنین کے متعلق کہا تھا کہ

یہ خدا کے امن کی مانند ہے جو ہر قسم کے فہم سے بالاتر ہے۔ مگر بہتر آدمیوں نے ۱۶۶۲ء میں وہ رائل سوسائٹی قائم کی جو دنیا میں اہل حکمت کی سب سے بڑی مجلس بننے والی تھی، اور انھوں نے بیکن کو اپنا نمونہ اور مرکز جوش قرار دیا۔ انھوں نے یہ امید ظاہر کی کہ انگریزی تحقیق کا یہ ارادہ اس یورپی ائتلاف کی طرف لے جائے گا جس کی خواہش "ترقی علم" (Advancement, of Learning) نے ان کو سکھائی ہے۔ اور جب فرانسیسی علم و نور کے بڑے اذہان نے علمی کارناموں کے اس شاہکار یعنی انسائکلوپیڈیا کی ابتدا کی تو انھوں نے اس کو فرینسس بیکن کے نام سے معنون کیا۔ دیباچے میں ڈیڈرو کہتا ہے کہ اگر ہم نے اس کام کو کامیابی سے انجام دیا ہے تو اس کے لیے ہم سب سے زیادہ چانسلر بیکن کے مرہون منت ہوں گے، جس نے علوم و فنون کے ایک عام لغت کی اس وقت تجویز کی تھی جب ان میں سے کوئی چیز بھی موجود نہ تھی۔
۱۵۷ اس عجیب و غریب شخص نے ایسے وقت میں جب کہ جو کچھ معلوم ہے اس کی تاریخ لکھنا ناممکن تھا، ایسے امور کے متعلق لکھا جن کا جاننا ضروری تھا۔ ڈالمبیر نے بیکن کو سب سے بڑا سب سے عام سب سے گویا اور فصیح فلسفی کہا۔ کانوینشن نے بیکن کی تصانیف کو حکومت کے صرف پر چھپوا دیا۔ برطانوی فکر نے اپنی تمام تر روش میں فلسفۂ بیکن کا اتباع کیا ہے۔ اس کے اس رجحان نے کہ عالم کا تصور دیماقریطوسی میکانیکی انداز میں کیا جائے اس کے محرر پیشی ہابس کو مکمل مادیت کے لئے نقطۂ آغاز دیا۔ اس کے استقرائی طریقے نے لاک کو ایسی تجربی نفسیات کا تصور بخشا جو مشاہدے سے محدود اور مذہب و مابعد الطبیعیات سے آزاد ہو۔ اس کے اشیا اور اثمار پر زور دینے کا اظہار بینتھم کے مفید اور خیر کے ایک قرار دینے میں ہوا۔

جہاں کہیں قابو حاصل کرنے کے جذبے نے صبر و رضا کے جذبے پر غلبہ پایا ہے بیکن کا اثر محسوس کیا گیا ہے۔ وہ ان تمام یورپ والوں کی آواز ہے جنھوں نے ایک براعظم کو جنگل سے علم و حکمت کے خزانے میں بدلا ہے۔ بیکن کہتا تھا کہ انسان سیدھے کھڑے ہونے والے حیوان نہیں ہیں

بلکہ وہ لافانی دیوتا ہیں۔ خالق نے ہم کو ایسی روحیں عطا کی ہیں جو تمام عالم کے مساوی ہیں، مگر اس کے ساتھ ہی وہ ایسی ہیں کہ ایک عالم ان کی سیری کے لیے کافی نہیں۔ انسان کے لیے ہر شے ممکن ہے۔ ابھی وقت نہیں ملا ہے۔ ہم کو چند صدیاں دو، تو ہم تمام چیزوں پر قابو حاصل کر لیں گے اور ان کو دوبارہ بنا لیں گے۔ شاید آخر کار ہم شریف ترین سبق سیکھ لیں کہ آدمی کو آدمی سے نہیں لڑنا چاہیئے بلکہ ان رکاوٹوں سے لڑنا چاہیے جو انسان کی کامیابی میں حائل ہوں بیکن ایک نہایت ہی عمدہ ٹکڑے میں لکھتا ہے کہ بنی نوع انسان کی خواہش کی اگر تین قسمیں کی جائیں تو کوئی غلطی نہ ہو گی پہلی خواہش ان لوگوں کی ہے جو اپنے ملک کی قوت کو اپنے ملک میں ترقی دینا چاہتے ہیں یہ خواہش عامیانہ اور ادنیٰ درجے کی ہے۔ دوسری ان لوگوں کی ہے جو اپنے ملک کی قوت اور اس کے غلبہ کو انسانوں پر وسعت دینا چاہتے ہیں۔ اس میں یقیناً شان زیادہ ہے مگر طمع کم نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص خود نسل انسانی کی قوت اور اس کے غلبے کو کائنات پر وسعت دینے کی کوشش کرے تو اس کی
۱۵۸ خواہش بلاشبہہ دونوں خواہشوں سے زیادہ مفید اور شریف ہے"
بیکن کی قسمت میں یہ تھا کہ ان مخالف خواہشوں کا شکار ہو جو اس کی روح کے لیے کشمکش کر رہی تھیں۔

۶۔ تمہ

"بڑے مرتبے پر انسان تین طرح سے نوکر ہوتے ہیں۔ وہ اپنے بادشاہ کے نوکر ہوتے ہیں وہ اپنی شہرت کے نوکر ہوتے ہیں، اور وہ اپنے کاروبار کے نوکر ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ نہ تو اپنی ذات کے اعتبار سے آزاد ہوتے ہیں اور نہ اپنے عمل میں نہ اپنے وقت میں۔ .... اپنے مرتبے سے ترقی کرنا محنت کا کام ہے، اور تکلیفوں سے انسان زیادہ بڑی تکلیفوں پر پہنچتے ہیں،

اور بعض اوقات اس میں دناءت ہوتی ہے اور لوگ ذلتوں سے عزتوں تک پہنچتے ہیں۔ ہر جگہ پر پھسلن ہوتی ہے، اور جب ترقی معکوس شروع ہوتی ہے تو یا تو انسان بالکل ہی معرض زوال میں آجاتا ہے یا کم غیر معروف ہو جاتا ہے۔ بیکن کے تتمہ کا خلاصہ کس قدر افسوس ناک ہے۔

گوئٹے نے کہا ہے کہ ایک شخص کی کمزوریاں تو اس کے زمانے سے ماخوذ ہوتی ہیں مگر اس کی نیکیاں اور اس کی عظمت خود اس کی ذات کی ہوتی ہے مورخ کو یہ بات ذرا انصاف کے خلاف معلوم ہوتی ہے مگر بیکن کے معاملے میں یہ غیر معمولی طور پر انصاف کے مطابق ہے۔ ایبٹ ان اخلاق کو بہت نہایت کاوش کے ساتھ تحقیق کر کے بیان کرنے کے بعد کہتا ہے کہ ایلزبتھ کے دربار میں جتنے لوگ پیش پیش تھے وہ خواہ مرد ہوں یا عورت سب کے سب مشیولی کے شاگرد تھے۔ روجر اشیم نے ان باتوں کو نظم کیا ہے جن کا ملکہ کے دربار میں چلن ہے۔

مکاری جھوٹ خوشامد دیدہ دلیری یہ چار طریقے ہیں جن سے لوگ
باتوقیر ہو سکتے۔ اگر تجھے ان میں سے کوئی نہیں آتا تو چل دے اور گھر بیٹھ۔

اس زمانے میں یہ دستور تھا کہ جج ان لوگوں سے جن کے مقدمے
ان کی عدالتوں میں چلتے تھے، تحائف لیا کرتے تھے۔ اس بارے میں بیکن اپنے
زمانے سے بالاتر نہ تھا اور اس کی اس عادت نے کہ وہ اپنی چند سال آیندہ کی
آمدنی پہلے سے صرف کر ڈالتا تھا، اس کو دیانتداری کی لذت سے ناآشنا رکھا۔ ۱۵۹
اس کی طرف کسی کی توجہ نہ ہوتی مگر اسیکس کے واقعے سے اس کے لوگ دشمن ہو گئے
تھے، نیز اس کی اس عادت سے کہ وہ اپنے مخالفین پر اپنی تقریر کے ذریعے سے
ضربیں لگانے کے لیے تیار رہتا تھا۔ ایک دوست نے اس کو متنبہ کیا تھا کہ
دربار میں یہ بات ہر شخص کے منہ پر ہے کہ جس طرح سے تمھاری زبان بعض لوگوں
کے حق میں ہنٹر ثابت ہوئی ہے اسی طرح سے ان کی زبان تمھارے لیے ہوگی۔
مگر اس نے انتباہوں کی پروا نہ کی۔ بادشاہ کے یہاں اس کا رسوخ اچھا تھا۔
۱۶۱۸ء میں وہ ویرولم کا بیرن ویرولم بنا دیا گیا اور ۱۶۲۱ء سینٹ البنس کا وی کاونٹ

تین سال سے وہ چانسلر تھا۔

پھر اچانک وار ہوا۔ ۱۶۲۱ئہ میں ایک غیر مطمئن فریق مقدمہ نے اس پر یہ الزام لگایا کہ اس نے مقدمے کے تصفیے کے لیے روپیہ لیا تھا۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ مگر بیکن نے فوراً معلوم کر لیا کہ اگر اس کے دشمنوں نے اس پر زور دینا چاہا تو وہ اس کے زوال کا باعث ہو سکتے ہیں۔ وہ خانہ نشین ہو کر واقعات کا انتظار کرنے لگا۔ جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ اس کے تمام دشمن اس کی برطرفی کا مطالبہ کر رہے ہیں، تو اس نے بادشاہ کے پاس اپنے اعتراف جرم اور عاجزانہ اطاعت سے مطلع کر دیا۔ جیمس نے نئی اور کامیاب پارلیمنٹ کے دباؤ سے جس کے مقابلے میں بیکن نے ضرورت سے زیادہ شدت کے ساتھ اپنی مدافعت کی تھی اس کو ٹاور بھیج دیا۔ لیکن بیکن کو دو دن کے بعد رہا کر دیا گیا، اور وہ بھاری جرمانہ جو اس پر عائد کیا گیا تھا، اس کو بھی بادشاہ نے معاف کر دیا۔ اس کا غرور پوری طرح ٹوٹنے نہ پایا تھا۔ اس نے کہا کہ میں ان ججوں میں جو ان پچاس سال میں انگلستان میں گذرے ہیں سب سے زیادہ منصف جج تھا مگر یہ فیصلہ پارلیمنٹ میں جو ہوا ہے وہ ان تمام فیصلوں میں سب سے زیادہ حق بجانب تھا جو ان دو سو سال کے اندر پارلیمنٹ میں ہوئے ہیں۔"

اس نے اپنی زندگی کے بقیہ پانچ سال گوشہ نشینی اور اپنے گھر کے سکون میں گزارے، مگر فلسفہ کے علمی مشغلے سے لذت حاصل کرتا رہا۔ ان پانچ سال میں اس نے اپنی سب سے بڑی لاطینی کتاب De Angmentis Scientiarum لکھی مضامین میں اضافہ کر کے شائع کیا، اور رسالہ Sylva Sylvaxum اور ہنری ہفتم کی تاریخ تصنیف کی۔ اس کو اس بات کا بہت افسوس تھا کہ میں نے سیاسیات کو پہلے کیوں نہ چھوڑ دیا اور اپنا تمام وقت ادب اور حکمت کو کیوں نہ دیدیا۔ آخر لمحے تک وہ کام میں مشغول رہا اور اس طرح سے جان دی جیسے کہ میدان جنگ میں دی جاتی ہے۔ موت پر جو اس کا مضمون ہے اس میں اس نے ۱۶۰
اس طرح سے مرنے کی خواہش ظاہر کی سچائی کے ساتھ مشغلہ حکمی میں اس طرح سے مصروف ہو جیسے کہ ایک سپاہی دشمن کا تعاقب کرتا ہوا سخت زخمی ہو جانے پر

ذرا دیر کے لیے اپنی چوٹ بھی محسوس نہیں کرتا۔ سیزر کی طرح سے اس کی خواہش مقبول ہوئی۔

مارچ ۱۶۲۶ء میں لندن سے ہائی گیٹ کو گھوڑے پر جا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں یہ سوال آیا کہ برف سے ڈھک دینا گوشت کو سڑنے سے کس حد تک روک سکتا ہے۔ اس نے اس معاملے کا فوراً امتحان کر لینا چاہا۔ ایک جھونپڑی میں ٹھیر کر اس نے ایک مرغی خریدی، اس کو مار کر اس کو برف سے بھر دیا۔ یہ سب کرتے وقت اس پر سردی اور کمزوری کا غلبہ ہوا۔ یہ دیکھ کر اب مجھ میں شہر گھوڑے پر سوار ہو کر واپس جانے کی طاقت نہیں ہے۔ اس نے لوگوں کو ہدایت کی کہ اس کو قریب ہی لارڈ ارنڈیل کے مکان پر پہنچا دیا جائے۔ وہاں وہ بستر علالت پر پڑ گیا۔ مگر ہنوز وہ زندگی سے مایوس نہ ہوا تھا۔ اس نے نہایت خوشی کے ساتھ لکھا کہ وہ تجربہ بہت ہی خوبی سے کامیاب ہوا۔ مگر یہ اس کا آخری تجربہ تھا۔ اس کی گوناگوں زندگی کے بحرانی بخار نے اس کو جلا ڈالا تھا۔ اب وہ بالکل جل چکا تھا اور اس قدر کمزور تھا کہ بیماری کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا، جو رفتہ رفتہ اس کے قلب تک پہنچ گئی۔ آخر کار نو اپریل ۱۶۲۶ء کو اس نے اس دنیا کو خیرباد کہا۔

۱۶۱

باب ۴

اسپی نوزا

۱۔ تاریخی و سیرتی

۱۔ یہود کا رزمیہ

منتشر ہونے کے بعد سے یہود کی کہانی یورپی تاریخ کے رزمیوں میں سے ہے۔ رومیوں کی فتح بیت المقدس (۷۰ء) کے بعد اپنے قدرتی وطن سے نکل کر فرار و تجارت کی بنا پر یہ تمام اقوام اور تمام براعظموں میں پھیل گئے۔ بڑے مذہبوں (عیسویت اور اسلام) جو ان کی کتب مقدسہ اور ان کی یادوں سے پیدا ہوئے تھے، کے متبعین نے ان کو ستایا اور قتل کیا۔ جاگیری نظام کی بنا پر زمین کی ملکیت سے اور انجمنوں کی بنا پر صنعت و حرفت میں حصہ لینے سے محروم رہے۔ گنجان یہودی محلوں اور محدود مشاغل میں بند رہے، لوگوں نے پریشان کیا اور بادشاہوں نے لوٹا۔ اپنی مالیات و تجارت سے قصبے اور شہر بنائے جو تمدن کے لیے اس قدر ضروری ہیں، محروم اور برادری سے خارج رہے توہین و تذلیل کے شکار ہوئے ——— مگر اس کے باوجود بغیر کسی سیاسی قوت کے معاشری وحدت

کے لیے بلا کسی قانونی دباؤ کے، اس حیرت انگیز قوم نے اپنے جسم و روح کو اپنی نسلی اور تمدنی وحدت کو باقی رکھا ہے اور اپنی قدیم ترین رسوم و روایات کی نہایت ہی محبت کے ساتھ حفاظت کی ہے، اور صبر و استقلال کے ساتھ اپنی رہائی کے دن کا انتظار کیا ہے، اور پہلے سے زیادہ تعداد میں نکلی ہے، اور ہر میدان میں اپنے طباعوں کے کارناموں کی بدولت مشہور ہوئی ہے، اور دو ہزار سال کی آوارہ گردی کے بعد اس کو اپنا قدیم اور نہ فراموش ہونے والا وطن کامیابی کے ساتھ پھر واپس ملا ہے۔ ان تکالیف کی شوکت ان مناظر کے تنوع اور اس تکمیل کی شان اور
۱۶۲ انصاف کا کونسی تمثیل مقابلہ کر سکتی ہے۔ کونسا افسانہ اس حقیقت کے رومان کا مقابل ہو سکتا ہے۔

شہر مقدس کی فتح سے کئی صدی پہلے سے انتشار شروع ہو چکا تھا ٹائر سدن اور دوسرے بندرگاہوں کے ذریعے سے یہودی بحیرۂ روم کے کونے کونے میں پھیل گئے، ایتھنز انطاکیہ اسکندریہ کارتھیج روم مارسیلز حتیٰ کہ دور دراز اسپین تک معبد کی بربادی کے بعد تو انتشار نے ایک عام ہجرت کی شکل اختیار کر لی۔ آخر کار یہ حرکت دو سمتوں میں ہوئی۔ ایک دریائے ڈینیوب اور دریائے رہائن کے ساتھ ساتھ اور وہاں سے بعد کو پولینڈ اور روس کی جانب اور دوسرے اسپین و پرتگال کے فاتح عربوں کے ساتھ (۷۱۱ء)۔ وسط یورپ میں یہودیوں نے خود کو تاجروں اور ساہوکاروں کی حیثیت سے ممتاز کیا۔ اندلس میں بخوشی عربوں کا ریاضیاتی طبی علم اور فلسفہ حاصل کر لیا اور قرطبہ برشلونہ اور سیوائل کے شہرۂ آفاق مدرسوں میں اپنی تہذیب و شائستگی کو نشو و نما دیا۔ یہاں پر بارھویں اور تیرھویں صدیوں میں یہودیوں نے قدیم اور مشرقی تہذیب کو مغربی یورپ کی طرف منتقل کرنے میں ممتاز حصہ لیا۔ قرطبہ ہی میں موسیٰ ابن میمون نے (۱۱۳۵ - ۱۲۰۴) جو اپنے عہد کا سب سے بڑا طبیب تھا، توارۃ کی مشہور تفسیر رہبر پریشان لکھی۔ برشلونہ میں ہسدے کریکاز (۱۳۷۰ - ۱۴۳۰) نے ایسی بدعتیں نکالیں جن سے تمام عالم یہود ہل گیا۔

اسپین کے یہود پھلتے پھولتے رہے یہاں تک کہ فرڈیننڈ نے ۱۴۹۲ء میں غرناطہ فتح کر لیا اور عرب آخر کار نکال دیئے گئے۔ جزیرہ نما کے یہودیوں کی

وہ آزادی چھن گئی، جو ان کو نرم اسلامی حکومت میں حاصل تھی۔ مذہبی عدالت
(انکویزیشن) نے ان کو دبوچ لیا، اور ان کو اختیار دیا گیا کہ یا تو بپتسمہ لیں اور
عیسائی بنیں ورنہ مال واسباب ضبط اور جلاوطنی اختیار کریں۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ
کلیسا یہود کا بہت زیادہ مخالف تھا۔ روم کے پاپاؤں نے بار بار مذہبی عدالت
کے مظالم کے خلاف احتجاج کیا۔ مگر شاہ اسپین کا خیال یہ تھا کہ اس بیرونی نسل
کی جوڑی ہوئی دولت سے اپنے ہمیانی کی جسامت بڑھائے۔ جس سال کولمبس
نے امریکہ کو دریافت کیا تھا تقریباً اسی سال فرڈی ننڈ نے یہود کو دریافت کیا۔ ۱۶۳

اکثر یہود نے سخت تر صورت کو قبول کیا، اور اپنے لیے پناہ کی جگہ
تلاش کی۔ بعض نے جہاز لیا اور جنیوا اور دوسرے اطالی بندرگاہوں میں داخل
ہونے کی کوشش کی۔ ان کے داخلے سے انکار کیا گیا، اور وہ بیش از بیش بدحالی
اور بیماری میں آگے گئے یہاں تک کہ وہ ساحل افریقہ پر پہنچے۔ یہاں پر بہت
سے اس لیے قتل کر ڈالے گئے کہ خیال تھا کہ یہ لوگ جواہرات نگل گئے ہیں۔
کچھ کو وینس میں جگہ مل گئی، کیونکہ یہ جانتا تھا کہ اس کا بحری تفوق کس قدر
اس کے یہودیوں کا مرہون منت تھا۔ بعض نے کولمبس کی مالی امداد کی، جو شاید
انھیں کی نسل کا آدمی تھا، اس امید میں کہ یہ مشہور عالم جہاز راں ان کے لیے
نیا وطن تلاش کر دے گا۔ ان کی ایک بڑی تعداد اس زمانے کے کمزور جہازوں
میں سوار ہو کر بحر اوقیانوس انگلستان و فرانس جو دونوں دشمن تھے کے بیچ سے
گزر کر ہالینڈ پہنچی اور اس چھوٹی مگر عالی حوصلہ قوم نے ان کو کسی حد تک خوش آمدید
کہا۔ ان میں ایک خاندان پرتگالی یہودیوں کا تھا جس کا نام اسپینی نورا تھا۔

اس کے بعد سے اسپین کو زوال ہوا، اور ہالینڈ نے ترقی کی یہودیوں
نے اپنا پہلا عبادت خانہ امسٹرڈم میں ۱۵۹۸ئہ میں بنایا۔ اور جب پچھتر برس کے
بعد انھوں نے ایک اور عبادت خانہ بنایا جو یورپ میں سب سے زیادہ شاندار
ہے، تو عیسائی ہمسایوں نے اس میں ان کی مالی امداد کی۔ اگر یہودی سوداگروں
اور مذہبی لوگوں کی اس تعداد سے اندازہ کیا جائے جن کو ریمبرینٹ نے
لافانی بنا دیا ہے، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہودی اب خوش تھے، مگر سترھویں صدی

کے وسط کے قریب واقعات کی یکساں ہیں، روانی معبد کے اندر ایک تلخ مناقشے سے خلل پیدا ہوا۔ یوریل اے کاسٹا ایک جوشیلا نوجوان تھا بعض دوسرے یہود کی طرح سے اس پر نشاۃ جدیدہ کا ارتیابی اثر ہوا۔ اس نے ایک کتاب لکھی جس میں آیندہ زندگی کے عقیدے پر نہایت شدت سے حملہ کیا۔ یہ انکاری روش قدیم تر یہودی تعلیم کے خلاف نہ تھی۔ مگر یہود کی مذہبی جماعت نے اس کو مجبور کیا کہ اس سے علی الاعلان تائب ہو، کہ کہیں اس سے وہ قوم ناراض نہ ہو جائے جنھوں نے اس قدر فیاضی کے ساتھ ان کو خوش آمدید کہا تھا۔ اور ہر اس بدعت کے شدت سے مخالف ہو گئے جس سے اس عقیدے پر ضرب لگتی تھی جو عیسایت کا اصل جوہر معلوم ہوتا تھا۔ توبہ کا طریقہ اس بات کا طالب ہوا کہ خود دار منصف معبد کے دروازے کے بیدھے میں لیٹ جائے اور عبادت
۱۶۴ کرنے والے اس کے جسم پر سے گزریں۔ یہ توہین اس کی برداشت سے باہر تھی۔ یوریل گھر لوٹا۔ اپنے ستانے والوں کی سخت ہجو لکھی اور اپنے کو گولی مار لی[1]۔

یہ ۱۶۴۷ء کا واقعہ ہے، اس وقت باروخ اسپی نوزا دورجدید کا سب سے بڑا یہودی، اورجدید فلاسفہ میں سے سب سے بڑا فلسفی پندرہ برس کا لڑکا تھا، اور معبد کے محبوب طالب علموں میں سے تھا۔

ب۔ اسپی نوزا کی تعلیم

یہود کے اس رزمیے نے اسپی نوزا کے ذہن کے پائین کو پر کیا تھا۔ اور اس کو اٹل طور پر، اگرچہ جماعت سے خارج، یہودی بنایا تھا۔ اگرچہ اس کا

---

[1] ۔ گٹزکو نے اس کہانی کو تمثیل کی صورت میں لکھا ہے جو یورپی تماشوں میں اب اپنی جگہ رکھتا ہے۔

باپ کامیاب تاجر تھا مگر اس کی طبیعت اس قسم کی زندگی کی طرف مائل نہ تھی۔ اس نے اپنا وقت معبد کے اندر اور اس کے گرد صرف کرنے کو ترجیح دی اور اپنی قوم کے مذہب اور تاریخ کے متعلق واقفیت حاصل کی۔ وہ بہت عمدہ طالبعلم تھا، اور بزرگ اس کو اپنی قوم اور مذہب کی آیندہ روشنی خیال کرتے تھے۔ وہ بہت جلد توراۃ سے گزر کر تلمود کی دقیق تفسیروں پر آگیا اور یہاں سے میمندی لوی بن جرسون ابن ازراہسدے کریسکاس پر آگیا اور اس کا گوناگوں شوق اس کو ابن جبرول کے تصوفی فلسفے اور قرطبہ کے موسے کے علم مخفی کی پیچیدگیوں تک لے گیا۔

موسے کے یہاں یہ دیکھ کر اس پر بہت اثر ہوا کہ وہ خدا اور کائنات کو ایک کہتا ہے۔ اسی تصور کو اس نے ابن جرسون کے یہاں پایا جو عالم کی ابدیت کی تعلیم دیتا تھا، اور ہسدے کریسکاس کے یہاں جس کا یہ خیال تھا کہ مادی کائنات خدا کا جسم ہے۔ اس نے میمندی کے یہاں ابن رشد کے اس خیال کی نیم موافق بحث پڑھی تھی کہ بقائے دوام غیر شخصی ہے۔ مگر اس نے رہبر پریشاں میں رہبری کی نسبت پریشانی زیادہ پائی۔ کیونکہ یہ مشہور یہودی عالم سوال زیادہ قائم کرتا تھا مگر جواب کم دیتا تھا۔ اور اسپی نوزا نے دیکھا کہ عہد نامۂ قدیم کے تناقضات و شکوک میمندی کے جوابات کے فراموش ہونے کے بعد بھی عرصے تک باقی رہے۔ ایک مذہب کے سب سے ہوشیار حامی اس کے سب سے بڑے دشمن ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کی موشگافیاں شک اور ذہن میں تحریک پیدا کردیتی ہیں۔ اگر میمندی کی تحریرات کا یہ حال تھا تو ابن ازرا کی تفسیر میں تو اور بھی زیادہ تھا، کیونکہ اس میں پرانے مذہب کے ادق مسائل کو زیادہ صفائی کے ساتھ پیش کیا گیا تھا اور بعض اوقات یہ کہہ کر چھوڑ دیا گیا تھا کہ اس کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔ اسپی نوزا جتنا پڑھتا اور غور کرتا گیا اتنا ہی اس کے قطعی یقینات حیرت اور شک میں بدلتے گئے۔ 165

اس کو یہ شوق ہوا کہ یہ معلوم کیا جائے کہ عیسائی ارباب فکر نے خدا اور انجام انسانی کے عظیم الشان مسئلوں پر کیا لکھا ہے۔ اس نے ایک

ڈچ فاضل وان ڈن اینڈے سے لاطینی پڑھنی شروع کردی، اور تجربے اور علم کے وسیع تر حلقے میں جانے لگا۔ اس کا نیا استاد خود بھی کسی حد تک بدعتی تھا، مذاہب اور حکومتوں پر نکتہ چینی کرتا رہتا تھا، اور ایک من چلا آدمی تھا، جو اپنے کتب خانے سے نکل کر شاہ فرانس کے خلاف ایک سازش میں شریک ہو گیا اور ۱۶۷۴ء میں سولی کی زینت بن گیا۔ اس کے ایک خوبصورت لڑکی تھی، جو اسپی نوزا کی توجہ حاصل کرنے کے لیے لاطینی کی کامیاب رقیب بن گئی تھی۔ ایسی ترغیب سے تو اس زمانے کا کالج کا طالبعلم بھی لاطینی پڑھنے پر رضامند ہو جائے گا۔ لیکن وہ نوجوان خاتون اس قدر علمی ذوق نہ رکھتی تھی کہ اصل موقع کو ہاتھ سے جانے دیتی۔ جب ایک اور منگیتر قیمتی تحائف لے کر آیا تو اس کی اسپی نوزا سے دلچسپی ختم ہو گئی۔ بلاشبہ اسی وقت سے ہمارا ہیرو فلسفی بن گیا۔

بہر حال اس نے لاطینی کو زیر کر لیا، اور لاطینی کے ذریعے سے وہ قدیم اور قرون وسطیٰ کے یورپی فکر کی میراث سے مستفید ہونے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے سقراط فلاطون اور ارسطو کا مطالعہ کیا تھا مگر وہ ان پر سالماتیہ دیماقریطوس ابیقورس لیوکریشیس کو ترجیح دیتا تھا۔ اور رواقیہ نے تو اس پر اپنا امٹ نشان چھوڑا ہے۔ اس نے مدرسی فلاسفہ کا مطالعہ کیا، اور ان سے ان کی اصطلاحات نہیں بلکہ ان کا ہندسی طریقۂ بیان بھی لیا، یعنے برہان اولیٰ تعریف مقالہ ثبوت شرح فرع۔ اس نے برونو (۱۵۴۸ - ۱۶۰۰) کا مطالعہ کیا، وہ شاندار باغی جس کی آگ کو کوہ قاف کی تمام برف بھی نہ بجھا سکی جو ملک بملک پھرا اور جس نے ہر مذہب کی سیر کی، مگر ہمیشہ اسی دروازے سے لوٹ آیا جس سے وہ 166
داخل ہوا تھا۔ یعنے تلاش کرتا ہوا، اور حیرت کرتا ہوا، اور جس کو مذہبی عدالت نے آخر کار یہ حکم سنایا تھا، اس کو اتنی رحمدلی کے ساتھ مار ڈالا جائے جتنا کہ ممکن ہے اور بغیر خون بہائے ہوئے۔ اس رومانی ایطالوی میں تصورات کی کس قدر کثرت تھی۔ سب سے پہلے تو سب سے بڑے تصور وحدت ہی کو لو۔ تمام حقیقت مادے علت اور اصل کے اعتبار سے ایک ہے۔ اور خدا اور یہ حقیقت ایک ہی ہیں۔ حقیقت کا ہر ذرہ غیر منفک طور پر جسمی اور نفسی ہوتا ہے۔

لہذا فلسفے کا مقصد یہ ہے کہ کثرت میں وحدت کا ادراک کرے یعنے ذہن کا مادے میں، اور مادے کا ذہن میں، اس ترکیب کو دریافت کرے جس میں مخالف اور متناقض ملتے اور ضم ہوتے ہیں اور عام وحدت کے بلند ترین علم تک بلند ہو جو خدا کی محبت کا علمی مرادف ہے۔ ان تصورات میں سے ہر ایک اسپی نوزا کے فکر کا جزو بنا۔

آخر میں اور سب سے بڑھ کر وہ ڈیکارٹ (۱۵۹۶ـ۱۶۵۰) جدید فلسفے میں ذہنی اور تصوری روایت کے باپ (بیکن خارجی اور حقیقی روایات کا باپ تھا) سے متاثر ہوا۔ اس کے فرانسیسی متبعین اور انگریز معاندین کے نزدیک ڈیکارٹ کے یہاں مرکزی تصور شعور کی اولیت ہے، یعنے اس کا بظاہر صریح دعویٰ یہ ہے کہ ذہن اپنے آپ کو اور کسی شے سے زیادہ فوری طور پر اور بلا واسطہ جانتا ہے۔ اور اس کو خارجی عالم کا علم صرف اس ارتسام سے ہوتا ہے جو اس کا ذہن پر حس اور ادراک کی صورت میں پڑتا ہے۔ لہذا فلسفے کا آغاز انفرادی ذہن اور ذات سے ہونا چاہیے (اگرچہ اس کے علاوہ اور ہر چیز پر شبہہ کرنا چاہیے) اور اسے اپنی پہلی دلیل کو تین لفظوں میں قائم کرنا چاہیے "میں خیال کرتا ہوں لہذا میں ہوں (Cogito, ergo sum)۔ غالباً اس نقطۂ آغاز میں کچھ نشأۃ جدیدہ کی انفرادیت تھی۔ بلاشبہہ اس میں بعد کے تفلسف کے لیے مداری کی پوری زنبیل بھر نتائج تھے۔ اب علمیات کا عظیم الشان کھیل شروع ہوا، جو لائبنز لاک برکلے ہیوم اور کانٹ میں تین صدی کی جنگ بن گیا کہ ۱۶۷
اس نے فلسفۂ جدید کو تقویت بھی پہنچائی اس کو برباد بھی کیا۔

لیکن ڈیکارٹ کے فکر کے اس پہلو سے اسپی نوزا کو دلچسپی نہ تھی۔ وہ اپنے آپ کو علمیات کے گورکھ دھندے میں گم نہ کرنا چاہتا تھا۔ جو شے اس کی دلچسپی کا باعث ہوئی وہ ڈیکارٹ کے یہاں ایک یکجنسی جوہر کا تصور تھا، جو تمام مادی صورتوں کی تہ میں مضمر ہوتا ہے، اور ایک دوسرے یکجنسی جوہر کا تصور جو ذہن کی تمام صورتوں کی تہ میں مضمر ہوتا ہے۔ حقیقت کو دو اصلی جوہر دں میں متفرق کر دینا، اسپی نوزا کے وحدتی جذبے کے خلاف تھا، اور (اس) نے

اس کے فکری ذخائر پر نتیجہ خیز جرثومے کا سا کام دیا۔ ڈیکارٹ میں اور جو چیز اس کی کشش کا موجب ہوئی وہ ڈیکارٹ کی یہ خواہش تھی کہ تمام دنیا کی سوائے خدا اور روح کے میکانیکی اور ریاضیاتی قوانین سے توجیہ کی جائے ___ اس تصور کی اصل لیونارڈو اور گلیلو میں تھی، اور شاید یہ اٹلی کے شہروں میں، مشینوں اور صنعت و حرفت کی ترقی کا نتیجہ تھا۔ ڈیکارٹ کہتا تھا کہ ابتداءً خدا نے ایک دھکا دیدیا (تقریباً اسی طرح سے جس طرح دو ہزار سال پہلے اینکزاغورث نے کہا تھا) باقی ہستی ارضیاتی اور تمام غیر دھاتی اعمال اور ترقیات کی توجیہ ایک یکجنس جوہر سے ہو سکتی ہے، جو پہلے منتشر صورت میں موجود تھا (لاپلاس اور کانٹ کا سحابی مفروضہ) اور ہر حیوان کا ہر لمحہ حتیٰ کہ انسانی جسم کا میکانیکی حرکت ہے، مثلاً دوران خون یا اضطراری حرکت۔ تمام عالم اور ہر شخص ایک مشین ہے، لیکن عالم سے خارج خدا ہے اور جسم کے اندر روح ہے۔

یہاں پر ڈیکارٹ ٹھیر گیا۔ مگر اسپی نوزا شوق سے بڑھے چلا گیا۔

۳۔ تکفیر

یہ ذہنی مقدمات تھے خارجی طور پر خاموش، مگر داخلی طور پر پریشان نوجوان کے جب وہ ۱۶۵۶ء میں (وہ پیدا ۱۶۳۲ء میں ہوا تھا) اکابران کنیسہ کے سامنے بدعت کے الزام کی بنا پر طلب کیا گیا۔ انھوں نے اس سے سوال کیا کیا یہ سچ ہے کہ تم نے اپنے دوستوں سے یہ کہا ہے کہ خدا کا جسم ہو سکتا ہے۔ یعنے یہ عالم مادی، اور یہ کہ فرشتے ممکن ہے کہ اوہام ہوں، اور روح محض جان ہو۔ اور یہ کہ عہد نامۂ قدیم میں بقائے روح کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ ۱۶۸

ہمیں یہ تو معلوم نہیں کہ اس نے کیا جواب دیا۔ ہم کو صرف اس قدر معلوم ہے کہ اس کو اس شرط پر پانچسو ڈالر سالانہ پیش کئے گئے تھے کہ وہ اپنے کنیسہ اور مذہب سے وفادار رہے، اگر دل سے نہیں تو ظاہری طور پر ہی۔ اس نے اس پیش کش سے انکار کردیا اور ۲۷ جولائی ۱۶۵۶ء کو تمام سنجیدہ عبرانی رسومات کے ساتھ مرتد قرار دیا گیا۔ "لعنت نامے کے پڑھتے وقت قرنا کی طویل آواز رفتہ رفتہ پست ہوتی گئی، رسم کے آغاز پر روشنیاں تیزی سے جل رہی تھیں۔ جیسے جیسے

رسم آگے بڑھتی گئی روشنیاں ایک ایک کرکے بجھا دی گئیں یہاں تک کہ آخر میں سب سے آخری روشنی بجھا دی گئی (جس کے معنے یہ تھے مرتد کی روحانی زندگی فنا ہو گئی ہے) اور جماعت کامل تاریکی میں رہ گئی۔

دان وَلوٹین نے وہ ضابطہ نقل کیا ہے جو مرتد قرار دینے کے وقت استعمال ہوا تھا۔

مذہبی مجلس کے سردار اس امر کا اعلان کرتے ہیں بروخ اسپی نوزا کی غلط رائے اور غلط کرداری کا اچھی طرح سے یقین ہونے کے بعد انھوں نے مختلف طریقوں اور مختلف مواعید کے ذریعے سے اسے اس کی غلط راہ سے ہٹانے کی کوشش کی۔ مگر چونکہ اس کو کسی بہتر خیال پہ لانے میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں بلکہ اس کے برعکس ان کو ہر روز ان خوفناک بدعات کا بہتر سے بہتر ثبوت ملتا جارہا ہے، جن کا وہ قائل ہے، اور اس دیدہ دلیری کا جس سے کہ وہ ان کو پھیلا رہا ہے، اور بہت سے معتبر اشخاص نے اسپی نوزا مذکور کے سامنے اس کی شہادت دی ہے، اس لیے اس کو ان کا مجرم قرار دیا جاتا ہے۔ کل معاملہ مذہبی مجلس کے سرداروں کے سامنے پیش ہو چکا ہے۔ اور یہ فیصلہ کیا جاتا ہے، جس پر مجلس مذکور کے ارکان رضامندی ظاہر کر چکے ہیں کہ اسپی نوزا مذکور کو لعنتی قرار دیا جائے اور بنی اسرائیل سے اس کے تعلق کو منقطع کر دیا جائے، اور موجودہ ساعت سے اس کو مندرجہ ذیل بد دعا کے ساتھ زیر لعنت رکھا جائے۔

فرشتوں اور اولیا کے فیصلے کے ساتھ ہم بروخ اسپی نوزا کو لعنتی مرتد ناپاک اور مردود قرار دیتے ہیں، کل مقدس ملت اس فیصلے کو قبول کرتی ہے۔ ۱۶۹
کل مقدس کتابوں کی موجودگی میں ہم اس کو وہ بد دعا دیتے ہیں جو ایلی شا نے بچوں کو دی تھی، اور وہ تمام بد دعائیں دیتے ہیں جو کتاب اور قانون میں موجود ہیں۔ خدا کرے کہ اس پر شب و روز سوتے جاگتے، باہر جاتے اور اندر آتے لعنت ہو۔ خدا اس کو کبھی معاف نہ کرے اور نہ اس کی توبہ قبول ہو۔ خدا کی آتش غضب اس شخص کے خلاف ہمیشہ جلتی رہے اور وہ تمام لعنتیں جو کتاب مقدس

ہیں مذکور رہیں، اس پر پڑتی رہیں، اور اس کے نام آسمان کے نیچے سے محو کردیں خدا اس کو ہمیشہ کے لیے بنی اسرائیل سے جدا کردے، اور زمین و آسمان کی تمام لعنتیں جو کتاب مقدس میں مذکور ہیں، اس پر لد جائیں۔ اور خدا تم سب کو یعنی جو اپنے رب کا فرمانبردار ہو نجات دے۔

پس آیندہ سے اس سے نہ تو کوئی بات کرے اور نہ خط و کتابت کرے نہ اس کا کوئی کام انجام دے، نہ اس چھت کے نیچے رہے جس میں وہ موجود ہو، اور نہ اس سے چار کیوبٹ کے فاصلے پر آئے نہ ایسی تحریر کو پڑھے جس کو اس نے لکھوایا ہو، یا اس نے لکھا ہو۔

ہمیں کنیسہ کے سرداروں کے متعلق حکم لگانے میں جلدی سے کام نہ لینا
چاہیے کیونکہ ان کے سامنے ایک نازک صورت حال تھی۔ اس میں شک نہیں کہ
وہ خود پر یہ الزام عائد کرانا نہیں چاہتے تھے کہ وہ بدعت سے اسی قدر تعصب
رکھتے ہیں جس قدر کہ عدالت مذہبی (Inquisition) جس نے ان کو اسپین سے
جلاوطن کیا تھا۔ مگر انھیں اس امر کا احساس تھا کہ ان کے ولندیزی میزبانوں کی
احسان مندی اس بات کی طالب ہے کہ اس شخص کو خارج کردیں جس کے شکوک
مذہب عیسوی پر بھی اسی قدر کاری ضرب لگاتے تھے جس قدر کہ یہودیت پر۔
اس وقت اعتزال (Protestantism) ایسا وسیع الخیال اور رواں فلسفہ نہ تھا
جتنا کہ یہ اب ہو گیا ہے۔ مذہبی لڑائیوں نے ہر گروہ کو اپنے خاص مسلک پر اٹل طور پر
راسخ کردیا تھا اور یہ اس وجہ سے اور بھی عزیز ہو گیا تھا کہ اس کی مدافعت میں
کچھ ہی عرصہ پہلے خون بہایا جا چکا تھا۔ ولندیزی حکام ایسی یہودیوں کی جماعت
کے متعلق خیال کیا کریں گے جس نے ایک نسل میں ایک اوسٹا اور اس کے بعد کی نسل میں
اسپی نوزا پیدا کردیا تھا۔ علاوہ برایں بڑوں کے نزدیک مذہبی ہمنوائی امسٹرڈم کے 170
یہود کی مختصر سی جماعت کو انتشار سے محفوظ رکھنے کے لیے ضروری تھی اور یہ بقائے
وحدت، اور دنیا میں بکھرے ہوئے یہود کی بقا کی آخر صورت تھی۔ اگر وہ اپنی علیحدہ
ریاست اپنا علیحدہ قانون، اور قوت و طاقت کے اپنے علیحدہ ادارے داخلی اتحاد
اور خارجی احترام کو جبراً نافذ کرنے کے لیے رکھتے، تو زیادہ بے تعصبی سے کام

لے سکتے تھے۔ مگر ان کا مذہب ان کے لیے حب الوطنی اور مذہب دونوں تھا کنیسہ ان کی معاشری اور سیاسی زندگی اور مذہبی رسوم و عبادت دونوں کا مرکز تھا۔ اور کتاب مقدس جس کی صداقت کو اسپی نوزا نے ٹھکرا دیا تھا، ان کی قوم کا ہلکا پھلکا وطن تھا۔ ان حالات کے تحت انھوں نے بدعت کو بغاوت اور بے تعصبی کو خودکشی خیال کیا۔

کوئی شخص یہ خیال کر سکتا ہے، کہ انھیں ان خطرات کا بہادری سے مقابلہ کرنا چاہئے تھا، مگر دوسرے کے متعلق انصاف سے فیصلہ کرنا اتنا ہی دشوار ہے جتنا کہ اپنی کھال سے نکل کر باہر آجانا۔ شاید بیناسیہ بن اسرائیل یہود امسٹرڈم کے روحانی پیشوا کو کوئی ایسا مصالحت آمیز ضابطہ مل سکتا تھا جس میں کنیسہ اور فلسفی دونوں کو باہمی مصالحت کے ساتھ رہنے کی جگہ مل جاتی۔ لیکن بڑا پیشوا اس وقت انگلستان میں تھا اور کرامویل کو اس بات پر آمادہ کر رہا تھا کہ وہ انگلستان کو یہودیوں کے لیے کھول دے۔ مقدر ہی میں یہ تھا کہ اسپی نوزا دنیا بھر کا ہو۔

۴۔ گوشہ نشینی اور انتقال

اس نے ارتداد کو خاموش شجاعت کے ساتھ یہ کہتے ہوئے قبول کیا کہ "یہ مجھے کسی ایسی بات کے کرنے پر مجبور نہیں کرتا جو مجھکو کسی صورت میں بھی نہ کرنی چاہئے تھی"، مگر یہ تاریکی میں سیٹی بجانے کے مانند تھا، درحقیقت نوجوان طالب علم نے اپنے آپ کو سختی اور بے رحمی کے ساتھ تنہا پایا۔ تنہائی سے زیادہ کوئی شئے خوفناک نہیں ہے، اور اس کی بھی بہت کم صورتیں اس قدر دشوار ہیں، جتنا کہ ایک یہودی کا اپنی تمام قوم سے علحدہ ہو جانا۔ اسپی نوزا اپنے پرانے عقیدے کا نقصانات تو برداشت کر ہی چکا تھا، اپنے ذہنی ماضیہ کو اس طرح سے اکھاڑ کر پھینک دینا ایک بڑا عمل جراحی ہے اور اس کے بہت سے زخم رہ جاتے ہیں۔ اسپی نوزا اگر کسی دوسرے آغوش میں چلا جاتا اور دان راسخ عقائد میں سے کوئی اور عقیدہ قبول کر لیتا جن پر لوگ ایسی گایوں کی طرح سے جمع تھے، جو گرمی کی خاطر ایک

دوسرے سے سر جوڑے بیٹھی ہوں، تو اس کو ایک ممتاز شریک نو کی حیثیت سے اس منزلت کا کچھ نہ کچھ جز ول جاتا، جو وہ اپنے خاندان اور نسل سے قطعاً خارج کر دیے جانے کی بنا پر کھو چکا تھا مگر اس نے کوئی دوسرا مذہب اختیار نہیں کیا اور اپنی زندگی تنہا گزاری۔ اس کے باپ نے جو اپنے بیٹے کی عبرانی قابلیت کے متعلق یہ آس لگائے بیٹھا تھا کہ وہ سب سے بڑھ جائے گی اس کو گھر سے نکال دیا۔ اس کی بہن نے تھوڑے سے ترکے کے متعلق اس کو دھوکا دینا چاہا[1] اس کے پہلے دوست اس سے منہ چھپاتے تھے۔ اس وجہ سے کوئی تعجب کا مقام نہیں کہ اسپی نوزا میں ظرافت نہیں ہے، اور کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ جب کبھی وہ قانون کے محافظوں کا خیال کرتا ہے تو کچھ تلخ کامی کے ساتھ بول پڑتا ہے۔

"جو لوگ معجزات کے اسباب کی تلاش کرنا چاہتے ہیں اور فطری چیزوں کو فلسفیوں کی حیثیت سے سمجھنا چاہتے ہیں، اور احمقوں کی طرح سے ان کی جانب استعجاب سے گھورتے رہنا نہیں چاہتے ان کو جلدی بدعتی اور فاسق خیال کر لیا جاتا ہے، اور جن لوگوں کی عوام فطرت اور معبودوں کے ترجمان ہونے کی حیثیت سے پرستش کرتے ہیں وہ ان لوگوں کے بدعتی اور فاسق ہونے کا اعلان کر دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ جانتے ہیں کہ ایک بار جب جہالت کو ٹھکرا دیا جائے گا تو وہ استعجاب بھی رخصت ہو جائے گا جو ان کے اقتدار کی بقا کا واحد ذریعہ ہے[2]۔"

ارتداد کے بعد انتہائی تجربہ بھی جلد ہی ہو گیا۔ ایک رات جب کہ اسپی نوزا سڑک پر ٹہل رہا تھا، تو ایک مقدس بدمعاش جو اپنے مذہب کو قتل سے ثابت کرنا چاہتا تھا، نوجوان طالب علم پر برہنہ خنجر سے حملہ آور ہوا۔ اسپی نوزا تیزی سے

---

[1] اس نے عدالت میں چارہ جوئی کی اور مقدمہ جیتا، اور پھر میراث سے بہن کے حق میں دست بردار ہو گیا۔

[2] اخلاقیات حصۂ اول ضمیمہ۔

مڑ گیا اور اس کی گردن پر صرف ایک خفیف سا زخم آیا۔ اس پر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ
اس دنیا میں بہت کم ایسی جگہیں ہیں جہاں انسان سلامتی کے ساتھ فلسفی بن سکتا ہے،
وہ امسٹرڈم کے باہر ایک خاموش کمرے میں جو اوٹرڈک روڈ پر تھا، رہنے
کے لیے چلا گیا۔ غالباً اسی وقت اس نے اپنا نام باروخ سے بینی ڈکٹ کر دیا۔ اس
کا میزبان اور اس کی بیوی مینونائٹ فرقے کے عیسائی تھے، اور وہ کسی حد تک
ایک بدعتی کو سمجھ سکتے تھے۔ وہ اس کے غمگین مگر مہربان چہرے کو پسند کرتے تھے
(کیونکہ جو لوگ بہت تکلیف اٹھا چکتے ہیں وہ یا تو بدمزاج ہو جاتے ہیں، یا بہت ہی
خوش مزاج ہو جاتے ہیں) جب کبھی وہ شام کو اپنے کمرے سے اتر کر نیچے آجاتا تھا،
اور ان کے ساتھ مل کر پائپ پیتا تھا، اور اپنی باتوں کو ان کی سادہ گفتگو
کے مطابق کر لیتا تھا تو وہ خوش ہوتے تھے۔ بسر اوقات کے لیے اس نے پہلے ۱۷۲
تو خان ڈن انڈے کے مدرسے میں بچوں کو تعلیم اور پھر عینک کے شیشوں پر
جلا کرنے کا پیشہ اختیار کر لیا، گویا منعکس چیزیں اس کے رجحان کے مطابق
تھیں۔ اس نے عینک سازی کا پیشہ اس وقت سیکھا تھا جب وہ ملت یہود میں
شامل تھا۔ یہ عبرانی قاعدہ تھا کہ ہر طالب علم کو کوئی نہ کوئی دستکاری سیکھنی
چاہیے۔ نہ صرف اس وجہ سے کہ مطالعہ اور دیانتدارانہ تعلیم سے شاذ و نادر
ہی معاش حاصل ہو سکتی ہے، بلکہ جیسا کہ گمالیل نے کہا ہے، کہ کام انسان کو نکوکاری
کی راہ پر قائم رکھتا ہے۔ برخلاف اس کے ہر تعلیم یافتہ شخص جو کسی پیشے کے
حاصل کرنے سے قاصر رہے آخر کار بدمعاش بن جاتا ہے۔"

پانچ سال بعد (۱۶۶۰ء) اس کا میزبان لیڈن کے قریب رہائن برگ
میں منتقل ہو گیا۔ اسپی نوزا بھی اس کے ساتھ چلا گیا۔ مکان اب تک باقی ہے
اور یہ سڑک اسپی نوزا کے نام سے منسوب ہے، یہ زمانہ سادہ معاشرت اور
بلند تخیل کا زمانہ تھا۔ بار بار ایسا ہوتا کہ وہ دو دو تین تین دن اپنے کمرے سے
باہر نہ آتا اور اس کا سادہ کھانا بھی اسی کے پاس آجایا کرتا۔ عینک کے شیشے
عمدگی سے بنائے جاتے تھے، مگر اس قدر مسلسل نہ بنائے جاتے تھے کہ ان سے
اسپی نوزا قوت لایموت سے زیادہ حاصل کر سکتا۔ اسے حکمت اس قدر عزیز

تھی کے وہ ایک کامیاب آدمی نہیں بن سکتا تھا۔ کالی رَس جو ان مکانات میں اسپی نوزا کے بعد رہا ہے، اور جس نے اس فلسفی کی سوانح عمری ان لوگوں کے بیانات سے مرتب کی ہے جو اس کو جانتے تھے کہتا ہے ''وہ اپنا ہر سہ ماہی کا حساب مرتب کرنے میں بہت محتاط تھا، اور ایسا وہ اس لیے کرتا تھا کہ وہ اس سے کم یا زیادہ صرف نہ کرے جتنا کہ اس کو ہر سال خرچ کرنا ہوتا تھا اور گھر کے لوگوں سے اکثر کہا کرتا تھا کہ میری مثال اس سانپ کی سی ہے جو اپنی دم کو منہ میں لے کر گنڈلی بناتا ہے، اور اس کے کہنے سے اس کا منشا یہ ہوتا تھا کہ سال کے ختم پر اس کے پاس کچھ بھی نہیں بچا ہے''[1] مگر اپنے سادہ انداز میں وہ خوش تھا ایک شخص اس کو نصیحت کر رہا تھا، اور کہہ رہا تھا کہ عقل پر نہیں بلکہ وحی والہام پر عقیدہ رکھو، اس کو اس نے جواب دیا کہ اگرچہ میں بعض اوقات اس ثمر کو جو میں اپنی سمجھ سے چنتا ہوں، غیر حقیقی بھی پاؤں، مگر پھر بھی یہ میرے لیے موجب تسکین وتشفی ہوگا۔ کیونکہ ثمر کے جمع کرنے میں، میں خوش ہوتا ہوں اور اپنے دن آہ و افسوس میں نہیں گزارتا بلکہ سکون اطمینان و خوشی میں گزارتا ہوں[2]

ایک بڑا دانا کہتا ہے کہ اگر نپولین اسپی نوزا کی برابر ہوشیار و ذہین ہوتا تو ۱۷۳
اس نے گمنامی میں زندگی بسر کی ہوتی اور چار کتابیں تصنیف کی ہوتیں[3]۔

اسپی نوزا کی جو تصویریں ہم تک پہنچی ہیں، ان کے متعلق کالی رَس کے بیان کا اضافہ کر سکتے ہیں۔ وہ کسی قدر سانولا تھا، اس کے بال سیاہ اور گھونگر والے تھے، بھویں لمبی اور سیاہ تھیں، اس لیے دیکھنے والا اس کو دیکھ کر آسانی سے پہچان سکتا تھا کہ وہ پرتگالی یہودیوں کی نسل سے ہے۔ لباس کے متعلق یہ ہے کہ وہ اس کے متعلق بہت بے پروا تھا، اور یہ ذلیل ترین شہری کے لباس سے بہتر نہ تھا۔ حکومت کے نہایت ہی سر برآوردہ مشیروں میں سے ایک

۱۔ یانگ اسپی نوزا کی سوانح حیات اور اس کا فلسفہ طبع لندن ۱۸۹۹ء صفحہ ۳۹۳۔

۲۔ (Epistle) صفحہ ۳۴۔

۳۔ اناطول فرانس (M. Bergeret in Paris) طبع نیویارک ۱۹۲۱ء صفحہ ۱۸۰۔

شخص اس سے ملنے کے لیے گیا اور اس کو بہت ہی میلا صبح کا لبادہ پہنے ہوئے دیکھا، اس پر اس نے فلسفی کو ملامت کی اور دوسرا لبادہ پیش کیا۔ اسپی نوزا نے جواب دیا کہ آدمی لبادہ پہنکر کچھ بہتر نہیں ہو جاتا اور کم قیمت یا بے قیمت چیزوں کو قیمتی غلاف میں لپیٹنا بیکار رہے[۵۱] اسپی نوزا کا فلسفہ لباس ہمیشہ اس قدر مرتاضانہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ "ہم بے ہنگام یا گندے رہنے سے حکیم نہیں بن سکتے کیونکہ حلیے کی طرف سے بے تکلف بے پروائی برتنا ادنیٰ درجے کی روح کی علامت ہے، جس میں حقیقی دانائی کو شایان شان مسکن نہیں ملتا، اور حکمت صرف پریشانی اور بدنظمی سے دوچار ہوتی ہے"[۵۲]

رہائن سبرگ کے اسی پانچ سالہ قیام کے دوران میں اسپی نوزا نے اصلاح عقل پر چھوٹا سا رسالہ لکھا (De Intellectus Emendatione) اور ایک کتاب اخلاق پر تصنیف کی جس کا نام اخلاق کا ہندسی ثبوت (Ethica More Geometrico Demanstrata) تھا۔ یہ دوسری کتاب ۱۶۶۵ء میں تمام ہو گئی تھی۔ لیکن دس سال تک اسپی نوزا نے ان کے شائع کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ۱۶۶۸ء میں ایڈرین کوربا (Adrian koerbagh). اسپی نوزا کی سی رائیں چھپوانے کی پاداش میں دس سال کے لیے قید کیا جا چکا تھا جہاں وہ اٹھارہ ماہ کی سزا بھگتنے کے بعد انتقال کر گیا۔ جب ۱۶۷۵ء میں اسپی نوزا اس خیال سے امسٹرڈم گیا کہ اب وہ بلا کسی خطرے کے اپنی تصنیف شائع کر سکتا ہے، تو وہ اپنے دوست اولڈن برگ کو لکھتا ہے، "یہ افواہ پھیلادی گئی کہ میری ایک کتاب شائع ہونے والی ہے جس میں میں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خدا کا وجود ہی نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ اس خبر کو اکثر لوگوں نے صحیح باور کر لیا۔ بعض اہل مذہب نے (جو غالباً اس خبر کے مصنف بھی تھے) اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میرے خلاف بادشاہ اور حکام کے یہاں مقدمہ ۱۷۴

۵۱۔ پاکک صفحہ ۴۲۹۔
۵۲۔ ڈنیس صفحہ ۷۲۔

دائر کردیا .... مجھے اپنے بعض معتبر احباب سے اس صورت حال کی خبر مل گئی جنھوں نے مجھے اس کا بھی یقین دلایا کہ علمائے دین ہر جگہ میری تاک میں لگے ہوئے ہیں' اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ اپنی کتاب کی اشاعت کو اس وقت تک کے لیے ملتوی کردوں جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ واقعات کیا شکل اختیار کرتے ہیں۔[1]

اخلاقیات اسپی نوزا کے انتقال ۱۶۷۷ء ہی کے بعد شائع ہوسکی۔ اس کے ساتھ سیاسیات پر ایک نامکمل رسالہ تھا۔ یہ تمام کتابیں لاطینی میں تھیں کیونکہ سترھویں صدی میں یورپ میں فلسفہ وحکمت کی عام زبان ہی تھی۔ ایک مختصر کتاب "خدا اور انسان" ولندیزی زبان میں "فان ولائٹین" نے ۱۸۵۲ء میں دریافت کی۔ غالباً یہ اخلاقیات کے لیے ابتدائی خاکا تھا۔ اسپی نوزا نے اپنی زندگی میں صرف دو کتابیں شائع کیں' فلسفۂ ڈیکارٹ کے اصول ۱۶۶۳ء' رسالۂ مذہب و مملکت جو ۱۶۷۰ء میں بلانام کے شائع ہوا۔ اس کو فوراً ممنوع الاشاعت کتابوں کی فہرست میں داخل ہونے کی عزت بخشی گئی۔ اور حکام نے اس کی اشاعت بند کردی۔ اس امداد سے اس کی ایسے سرادراق کے تحت جو اس کو طبی کتاب یا تاریخی تذکرہ ظاہر کرتے تھے بے حد اشاعت ہوئی۔ لاتعداد کتابیں اس کی تردید میں شائع ہوئیں۔ ایک میں اسپی نوزا کو سب سے ناپاک ملحد جو اس وقت سطح زمین پر رہتا ہے کہا گیا۔ کالی رس ایک اور رد کا ذکر کرتا ہے جو بے قیاس قیمت کا خزانہ ہے جو کبھی ضائع نہ ہوگا........ مگر اس کا صرف اسی قدر ذکر باقی ہے۔ اس سرزنش کے علاوہ اسپی نوزا کو بہت سے خطوط بھی ملے جن میں اس کی اصلاح کی کوشش کی گئی تھی' ایک سابقہ شاگرد البرٹ برغ کا خط جس نے کیتھولک مذہب اختیار کرلیا تھا' نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

۱۷۵ "تم یہ فرض کرتے ہو کہ تمھیں آخر کار سچا فلسفہ دستیاب ہوگیا ہے۔ تمھیں یہ کس طرح سے معلوم ہوا کہ تمھارا فلسفہ ان سب فلسفوں سے بہتر ہے' جن کی دنیا میں کبھی تعلیم دی گئی ہے' یا اس وقت تعلیم دی جاتی ہے یا آیندہ تعلیم دی جائے گی'

---

[1] (Epistle) صفحہ ۱۹۔

آیندہ کیا اختراع ہو سکتا ہے، اس کا تو ذکر نہیں، کیا تم نے ان تمام فلسفوں کو جانچ لیا ہے (قدیم و جدید دونوں) جن کی یہاں ہندوستان اور تمام دنیا میں تعلیم دی جاتی ہے۔ اور اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ تم نے ان سب کو جانچ لیا ہے تو تمھیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ تم نے بہترین کو انتخاب کیا ہے .... تم اپنے کو تمام اسقفوں نبیوں رسولوں شہیدوں مجتہدوں اور کلیسا کے اعتراف کرانے والوں سے بالاتر سمجھنے کی کس طرح سے جرأت کرتے ہو۔ بدبخت انسان! تو زمین کا کیڑا، تو راکھ اور کیڑوں کی غذا بن جانے والا تو حکمت ابدی کا اپنے ناقابل بیان کفر سے کیونکر مقابلہ کرتا ہے۔ تیرے پاس اس احمقانہ مجنونانہ افسوسناک اور لعنتی نظریے کی کیا بنیاد ہے۔ کس شیطانی غرور کی بنا پر تو ایسے اسرار کے متعلق حکم لگاتا ہے، جن کو خود کیتھولک ناقابل فہم بتاتے ہیں۔ وغیرہ"[1]

اسں کا اسپی نوزا نے جواب دیا

تم یہ فرض کرتے ہو کہ تم نے آخر کار بہترین مذہب یا بہترین معلم دریافت کر لئے ہیں، اور ان پر ایمان لے آئے ہو تمھیں یہ کیس طرح سے معلوم ہوا کہ یہ ان لوگوں میں بہترین ہیں جنھوں نے مذاہب کی تعلیم دی ہے یا اب دیتے ہیں یا آیندہ دیں گے۔ کیا تم قدیم و جدید تمام مذاہب کو جانچ چکے ہو، جن کی یہاں ہندوستان اور ساری دنیا میں تعلیم دی جاتی ہے اور اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے، کہ تم ان کو اچھی طرح سے جانچ چکے ہو تو تمھیں یہ کیونکر معلوم ہوا کہ تم نے بہترین کو انتخاب کیا ہے۔[2]

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نرم مزاج فلسفی موقع پر استقلال سے کام لے سکتا تھا۔

تمام خطوط ایسے تکلیف دہ نہ تھے۔ ان میں سے اکثر پختہ علمیت اور بڑے مرتبے کے لوگوں کے تھے۔ ان خط بھیجنے والوں میں سب سے ممتاز ہنری اولڈن برگ

[1] (Epistle) صفحہ ۷۳۔

[2] (Epistle) صفحہ ۷۴۔

(جو انگلستان کی رائل سوسائٹی یا مجلس شاہی جو اسی زمانے میں قائم ہوئی تھی سیکرٹری تھا) فان ٹیکبر نہاوس ایک نوجوان جرمن موجد امیر ہوئے گینس ولندیزی حکیم (سائنٹسٹ) لائبنٹس فلسفی جو اسپی نوزا سے ۱۶۷۶ء میں ملنے کے لیے آیا تھا) لوئی میرس ہیگ کا ایک طبیب (اور سائمن ڈی ورائی امسٹرڈم کا ایک دولت مند تاجر تھے آخر الذکر اسپی نوزا کو اس قدر پسند کرتا تھا کہ اس نے اسپی نوزا سے ایک ہزار ڈالر ہدیے کے طور پر قبول کرنے کی درخواست کی۔ اور بعد کو جب ڈی ورائی وصیت کرنے لگا تو اس نے اپنی پوری دولت اسپی نوزا کے لیے چھوڑ دینی چاہی، مگر اسپی نوزا نے اس کو آمادہ کیا کہ وہ اپنی دولت اپنے بھائی کے لیے چھوڑے۔ جب اس تاجر کا انتقال ہوا تو یہ معلوم ہوا کہ اس نے اپنے وصیت نامے میں یہ لکھا تھا کہ اس کی جائداد کی آمدنی میں سے ۵۰۰ ڈالر اسپی نوزا کو دیے جائیں۔ اسپی نوزا پھر یہ کہہ کر انکار کرنا چاہتا تھا کہ فطرت تھوڑے سے پر قانع ہے اور اگر وہ قانع ہے تو میں بھی قانع ہوں، لیکن آخر کار اسے ۱۵۰ ڈالر سالانہ قبول کر لینے پر آمادہ کر لیا گیا۔ ایک اور دوست جان ڈی وٹ جو ولندیزی جمہوریت کا حاکم عدالت تھا، اس نے حکومت کی جانب سے اس کا ۵۰ ڈالر سالانہ مقرر کر دیا، آخر کار خود جلیل القدر بادشاہ لوئی چہاردہم نے اس کے لیے ایک معقول وظیفہ مقرر کرنا چاہا مگر اس شرط کے ساتھ کہ اسپی نوزا اپنی آیندہ کتاب اس کے نام سے معنون کرے مگر اسپی نوزا نے مہذب پیرائے میں اس سے انکار کر دیا۔

اپنے دوستوں اور نامہ نگاروں کو خوش کرنے کے لیے اسپی نوزا اُوربرگ حوالی ہیگ میں ۱۶۶۵ء میں منتقل ہو گیا، اور ۱۶۷۰ء میں خود ہیگ میں۔ ان آخری برسوں میں اس کو جان ڈی وٹ سے بہت محبت ہو گئی تھی اور جب ڈی وٹ اور اس کے بھائی کو عوام نے سڑکوں میں قتل کر ڈالا جو ان کو ولندیزی فوج کے فرانسیسیوں سے ۱۶۷۲ء میں شکست کھانے کا سبب خیال کرتے تھے اور اس کی اسپی نوزا کو اطلاع ہوئی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور اگر اسے جبراً نہ روکا گیا ہوتا، تو وہ ایک دوسرے انطونی

کی طرح سے نکل کھڑا ہوتا اور موقع واردات پر آکر جرم کے خلاف اظہار ناراضی کیا کرتا۔ اس کے کچھ ہی بعد شاہزادۂ کانڈی فرانسیسی حملہ آور فوج کے قائد نے اسپی نوزا کو اپنی قیام گاہ پر بلایا، اور اس کو فرانس کی جانب سے ایک وظیفۂ شاہی کی اطلاع دی اس کے بعض ثنا خوانوں کو بلایا جو شہزادے کے ساتھ تھے۔ اسپی نوزا نے جو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قوم پرست نہیں بلکہ ایک "اچھا یورپی تھا" خط جنگ کو عبور کرنے اور کانڈی کی قیام گاہ پر جانے میں کوئی مضائقہ
۱۸۷ نہ خیال کیا۔ جب وہ ہیگ واپس آیا تو اس کے کانڈی کی قیام گاہ پر جانے کی خبر پھیلی، اور لوگوں میں ناراضی پھیل گئی اسپی نوزا کے میزبان فان ڈی اسپک کو اپنے مکان پر حملے کا اندیشہ ہوا۔ لیکن اسپی نوزا نے اس کو یہ کہہ کر اطمینان دلا دیا، کہ "میں آسانی کے ساتھ بغاوت کے شبہے سے اپنی برأت ثابت کر سکتا ہوں .... لیکن لوگوں میں اگر میں نے تمھیں ستانے کا خفیف سا رجحان بھی پایا، اگر تمھارے مکان کے سامنے انھوں نے جمع ہو کر شور بھی کرنا شروع کیا تو میں نیچے اتر آؤں گا، اگرچہ وہ میرے ساتھ اسی طرح سے پیش آئیں جس طرح سے غریب ڈی وٹ کے ساتھ آئے تھے[۱]۔" مگر جب مجمع کو معلوم ہوا کہ اسپی نوزا محض فلسفی ہے، تو انھوں نے اس کو بے ضرر خیال کیا، اور ہنگامہ فرو ہو گیا۔

ان چھوٹے چھوٹے واقعات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسپی نوزا کی زندگی اس قدر فلاکت زدہ اور الگ تھلگ نہ تھی جتنا کہ اس کو عام طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ اس کو کسی حد تک مالی اطمینان حاصل تھا، اور وہ با اثر اور ہم مذاق دوست بھی رکھتا تھا۔ یہ امر کہ باوجود مرتد قرار دیے جانے کے وہ اپنے معاصرین کا احترام حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا، اس واقعے سے ظاہر ہے کہ ۱۶۷۳ء میں اس کو جامعۂ ہائیڈل برگ میں فلسفے کی صدارت پیش کی گئی اور اس پیش کش کے الفاظ بہت زیادہ تعریفی تھے، جس میں اسپی نوزا سے تفلسف کی

۱؎ ولیس صفحہ ۶۷۔

کامل آزادی کا وعدہ کیا گیا تھا، مگر ساتھ ہی یہ بھی ظاہر کیا گیا تھا کہ رفعت مآب کو یقین ہے کہ اسپی نوزا اس آزادی سے مملکت کے مسلمہ مذہب پر اعتراض کرکے ناجائز فائدہ نہ اٹھائے گا۔ اسپی نوزا نے اس کا اپنے خاص انداز میں جواب دیا۔

جناب محترم۔ اگر مجھے کبھی کسی فن میں پروفیسری کے فرائض قبول کرنے کی خواہش ہوتی تو میری خواہشیں اس عہدے کو قبول کرکے جو جناب مستطاب شاہزادہ پلیٹین آپ کے ذریعے سے پیش کرنے کی عزت بخش رہے ہیں کافی طور پر آسودہ ہو گئی ہوتیں۔ اس پیش کش کی قدر و منزلت میری نظر میں اس وجہ سے اور بھی بڑھ گئی ہے کہ اس میں تفلسف کی آزادی بھی عطا کی گئی ہے .... مگر مجھے یہ علم نہیں کہ ٹھیک وہ حدود کونسی ہیں جن میں اس آزادی تفلسف کو روکنا بھی ہو گا تاکہ میں مملکت کے مسلمہ مذہب میں خلل انداز نہ ہوں۔ لہذا جناب میں اس سے زیادہ کسی دنیاوی منزلت کا خواہاں نہیں ہوں جو مجھے اس وقت حاصل ہے، اور اس سکون کی خاطر سے جو اپنے خیال کے مطابق کسی اور طرح سے حاصل نہیں ہو سکتا، مجھے معلمی کا پیشہ اختیار کرنے سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ ۱۷۸

خاتمے کا وقت ۱۶۷۷ء میں آگیا۔ اس وقت اسپی نوزا کی عمر صرف چوالیس برس کی تھی۔ مگر اس کے دوست جانتے تھے کہ اس کی زندگی کے کچھ زیادہ دن باقی نہیں ہیں۔ وہ مدقوق والدین کی اولاد تھا، اور گوشہ نشینی کی زندگی اور غبار آلود فضا سے جس میں اس نے محنت کی تھی اس ابتدائی نقص کی تلافی نہ ہو سکتی تھی تنفس کی دشواری روز بروز بڑھتی گئی اور اس کے حساس پھیپھڑے خراب ہوتے چلے گئے۔ وہ اپنی قبل از وقت موت پر تو راضی برضا ہو چکا تھا، مگر اس کو اندیشہ تھا تو صرف اتنا کہ کہیں اس کی وہ کتاب ضائع نہ ہو جائے جس کو وہ اپنی زندگی میں شائع کرنے کی جرأت نہ کر سکا تھا۔ اس نے مسودے کو ایک چھوٹی سی لکھنے کی میز میں رکھ دیا اور میز کو مقفل کرکے کنجی اپنے میزبان کے حوالے کر دی،

اور کہہ دیا کہ میرے مرنے کے بعد کنجی اور میز دونوں جان ریورٹز امسٹرڈم کے پبلشر کے حوالے کر دی جائے۔

۲۰ فروری کو اتوار کے روز وہ خاندان جس کے ساتھ اسپی نوزا رہتا تھا، اسپی نوزا کے یہ کہنے کے بعد کہ وہ غیر معمولی طور پر علیل نہیں ہے گرجا کو گیا۔ اس کے ساتھ صرف ڈاکٹر میر رہا۔ جب وہ لوگ گرجا سے واپس آئے تو انھوں نے فلسفی کو اس کے دوست کے بازووں میں مردہ پایا۔ بہت سے لوگوں نے اس کا ماتم کیا۔ کیونکہ سیدھے سادے عوام اس سے اس کی نیکی اور شرافت کی وجہ سے اتنی ہی محبت کرتے تھے جتنے کہ اہل علم اس کی حکمت کی وجہ سے اس کی عزت کرتے تھے۔ فلسفی اور حکام عدالت عوام کے ساتھ اس کے آخری آرام گاہ تک جانے میں شریک ہوئے اور مختلف عقیدوں کے لوگ اس کی قبر پر یکجا ہوئے۔

نیٹشے نے کسی جگہ کہا ہے کہ "آخری عیسائی نے صلیب پر جان دی" وہ اسپی نوزا کو بھول گیا تھا۔

۲ ۔ رسالۂ مذہب و مملکت

اب ہم اس کی چاروں کتابوں کا اس ترتیب کے ساتھ مطالعہ کرتے ہیں جس ترتیب میں اس نے ان کو تصنیف کیا تھا۔ رسالۂ مذہب و مملکت (The Tractatus Theologico-Politicus) شاید اس زمانے میں ہمارے لیے سب سے کم دلچسپ ہے کیونکہ بلند تر انتقاد کی تحریک نے جس کا اسپی نوزا نے آغاز کیا تھا، ان قضایا کو جن کی خاطر اس نے اپنی زندگی خطرے میں ڈالی تھی زبان زد عوام کر دیا ہے۔ ایک مصنف کے لیے اپنی بات کا ضرورت سے زیادہ قطعی طور پر ثابت کرنا قرین دانشمندی نہیں ہے۔ اس کے نتائج تمام تعلیم یافتہ دماغوں میں جاری و ساری ہو جاتے ہیں۔ ۱۷۹

اور اس کی تصانیف میں وہ اسرار باقی نہیں رہتا، جو ہمیشہ ہم کو اس کی جانب مائل کرتا ہے۔ یہی حال والٹیر کا رہا ہے اور یہی اسپی نوزا کے رسالۂ مذہب و مملکت کا۔

کتاب کا اصل اصول یہ ہے کہ تورات و انجیل کی زبان عمداً استعاری اور تمثیلی رکھی گئی ہے نہ محض اس وجہ سے کہ یہ بلند ادبی رنگ اور ترصیع اور مبالغہ آمیز بیانی ترکیبوں کے مشرقی رجحان کے مطابق ہے، بلکہ اس وجہ سے بھی کہ انبیا اور رسول تمثل کو برانگیختہ کر کے اپنی تعلیم کے سمجھانے کے لیے خود کو عام ذہن کی استعدادوں اور رجحانوں کے مطابق بنانے کے لیے مجبور تھے۔" جتنی کتب مقدسہ ہیں وہ سب کی سب دراصل پوری قوم کے لیے لکھی گئی تھیں۔ اسی لیے مضامین کا تا بہ امکان عوام کے فہم کے مطابق ہونا ضروری تھا، کتب مقدسہ اشیا کی ان کے ثانوی اسباب سے توجیہ نہیں کرتیں۔ بلکہ ان کو اس ترتیب اور اس انداز سے بیان کر دیتی ہیں جس میں لوگوں خصوصاً غیر تعلیم یافتہ لوگوں کے دلوں میں عبارت کی تحریک پیدا کرنے کی سب سے زیادہ قوت ہوتی ہے .... ان کا مقصد عقل کو قائل کرنا نہیں ہوتا بلکہ تمثل کو مائل کرنا اور اس پر مستولی ہو جانا۔ اسی وجہ سے معجزات کا تذکرہ بکثرت ہوتا ہے اور خدا کا ذکر بار بار آتا ہے عوام خیال کرتے ہیں کہ خدا کی قوت و قدرت کا سب سے زیادہ واضح طور پر ایسے واقعات سے اظہار ہوتا ہے، جو غیر معمولی اور اس تصور کے خلاف ہوتا ہے جو انھوں نے فطرت کا قائم کیا ہے .... درحقیقت وہ یہ فرض کرتے ہیں کہ خدا اس وقت تک بیکار ہے جب تک فطرت اپنے مقررہ انداز میں عمل کرتی ہے اور اسی طرح سے فطرت کی قوت اور فطری اسباب اس وقت تک بیکار ہیں جب تک خدا عامل و باکار ہے۔ اس طرح سے وہ ایک دوسرے سے علیحدہ قوتوں کا تصور کرتے ہیں، یعنے خدا کی قوت اور فطرت کی قوت۔ (یہاں پر اسپی نوزا کے فلسفے کا بنیادی تصور داخل ہوتا ہے کہ خدا اور فطرت کے اعمال ایک ہیں)۔ لوگ یہ یقین کرنا پسند کرتے ہیں، کہ خدا ان کی خاطر ۱۸۰

فطری واقعات کی ترتیب کو توڑ دیتا ہے، اسی لیے یہود نے دوسروں کو اور شاید خود کو اس بات سے متاثر کرنے کے لیے کہ یہود خدا کے مقبول بندے ہیں، دن کے بڑھنے کی ایک اعجازی تعبیر کی۔ اسی قسم کے واقعات ہر قوم کی ابتدائی تاریخ میں بکثرت پائے جاتے ہیں، سنجیدہ اور لفظاً صحیح بیان روح کو متاثر نہیں کرتے۔ اگر موسیٰؑ نے یہ کہا ہوتا کہ مشرقی ہوا نے ان کے لیے بحر قلزم میں راستہ بنا دیا (جیسا کہ ایک بعد کی عبارت سے ہماری سمجھ میں آتا ہے) تو اس سے ان لوگوں کے دلوں پر کوئی اثر نہ ہوا ہوتا، جن کی وہ رہبری کر رہے تھے۔ پھر رسولوں نے معجزوں کے قصوں سے اسی بنا پر کام لیا جس بنا پر انھوں نے تمثیلات سے کام لیا تھا۔ عوام کے ذہن کی مطابقت کے لیے یہ بھی ضروری تھا۔ اس قسم کے لوگوں کا فلاسفہ اور حکما کے مقابلے میں جو اثر زیادہ ہوا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ بانیان مذہب اپنے پیغام کی نوعیت اور خود اپنی جذبی شدت کی بنا پر زبان کی استعاری اشکال کے اختیار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

اسپی نوزا کہتا ہے کہ بائبل کی اگر اس اصول پر تفسیر کی جائے تو اس کے اندر عقل کے خلاف کوئی چیز نہ ملے گی۔ لیکن اگر لفظی ترجمانی کی جائے تو یہ اغلاط تناقضات اور صریح محالات سے پر ہے ــــ مثلاً جیسے تورات کو موسیٰؑ نے لکھا تھا۔ فلسفیانہ تفسیر تمثیل اور شاعری کی دھندمیں سے بڑے مفکرین اور زعما کے گہرے فکر کو بے نقاب کرتی ہے۔ اس کی وجہ سمجھ میں آجاتی ہے کہ کتاب مقدس کا لوگوں پر اس قدر دیرپا اور بے پایاں اثر کیوں ہے۔ دونوں قسم کی تفسیریں اپنا ایک علٰحدہ محل اور مصرف رکھتی ہیں، عوام ہمیشہ ایسے مذہب کے طالب ہوں گے، جو تمثال کے ذریعے سے ظاہر کیا گیا ہو، اور فوق الفطرت سے گھرا ہوا ہو۔ اگر اس قسم کے ایک مذہب کی شکل برباد ہو جائے تو وہ دوسری پیدا کرلیں گے۔ لیکن فلسفی جانتا ہے کہ خدا اور فطرت ایک ہی وجود ہے جو ایک غیر متغیر قانون کے مطابق لازمی طور پر عمل کرتا ہے۔ وہ اس عظیم الشان قانون کا احترام کرے گا اور اس پر کاربند ہوگا۔

۱۸۱ وہ جانتا ہے کہ کتاب مقدس میں خدا کو مقنن اور بادشاہ جو کہا گیا ہے، اور اس کو عادل اور رحیم وغیرہ کے جو لقب دیے گئے ہیں، تو محض عوام کے فہم اور ان کے ناقص علم کے لحاظ سے دیے گئے ہیں۔ فی الحقیقت خدا اپنی فطرت کے لزوم سے عمل کرتا ہے، اور اس کے فیصلے ابدی حقائق ہیں۔ اسپی نوزا عہد نامۂ قدیم وجدید میں کوئی امتیاز نہیں کرتا، اور یہودی اور عیسائی مذہب کو ایک ہی خیال کرتا ہے۔ اس کے نزدیک جب عام نفرت اور غلط فہمی دور ہو جائے گی، اور فلسفی تفسیر مخالف مذہبوں کی تہ تک پہنچ جائے گی، تو دونوں مذہب ایک ہی ہو جائیں گے۔ "مجھے اکثر اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ جو لوگ مذہب عیسائی کے مدعی ہوتے ہیں یعنے محبت خوشی امن عفت اور سب انسانوں سے حسن سلوک کے وہ اس قدر بغض و عناد کے ساتھ جھگڑیں، اور روزانہ ایک دوسرے کی طرف اس قدر سخت نفرت کا اظہار کریں کہ ان کے مذہب کا مابہ الامتیاز وہ فضائل نہیں معلوم ہوتے جن کے وہ مدعی ہیں، بلکہ بغض و عناد و نفرت معلوم ہوتے ہیں۔" یہود کے باقی رہ جانے کی زیادہ تر وجہ ان کی جانب سے عیسائیوں کی یہی نفرت ہے۔ مظالم کا شکار ہونے سے ان میں وہ وحدت اور شیرازہ بندی پیدا ہو گئی جو مسلسل نسلی بقا کے لیے ضروری ہے۔ اگر ان پر مظالم نہ ہوتے تو وہ اقوام یورپ کے ساتھ مل جل گئے ہوتے، اور انھوں نے ان میں شادی بیاہ کر لیے ہوتے اور ان اکثریتوں میں ضم ہو گئے ہوتے جن سے وہ ہر جگہ گھرے ہوئے ہیں۔ مگر اس کی کوئی وجہ نہیں کہ فلسفی یہودی اور فلسفی عیسائی ان سب خرافات کے ترک ہو جانے کے بعد باہم مذہبی اعتبار سے اس قدر متفق نہ ہو جائیں کہ وہ امن و اتحاد کے ساتھ رہ سکیں۔

اس مقصد کی تکمیل کے لیے پہلا قدم یہ ہے کہ مسیح کی نسبت ایک مفاہمت کر لی جائے۔ مشتبہ اعتقادات سے قطع نظر کر لو، تو یہودی بہت جلد مسیح کو اکابر انبیا میں سے تسلیم کر لیں گے۔ اسپی نوزا مسیح کی الوہیت کو تسلیم نہیں کرتا،

مگر وہ ان کو انسانوں میں اول درجے پر رکھتا ہے۔ "خدا کی ابدی حکمت نے اپنے آپ کو تمام چیزوں میں ظاہر کیا ہے، مگر زیادہ ذہن انسانی میں اور سب سے زیادہ مسیحؑ کے ذہن میں ظاہر کیا ہے۔" "مسیحؑ صرف یہودی کو نہیں بلکہ کل بنی نوع
۱۸۲ انسان کو تعلیم دینے کے لیے مبعوث کیے گئے تھے۔ اسی لیے انھوں نے خود کو عوام کے فہم کے مطابق بنایا اور اکثر اوقات تمثیلات کے ذریعے سے تعلیم دی۔ اس کے نزدیک مسیحؑ کی اخلاقیات تقریباً حکمت کے مرادف ہے۔ ان کا ادب واحترام کر کے انسان خدا کی عقلی محبت تک بلند ہو جاتا ہے۔ ایسے شریف و عالی مرتبہ وجود کو اگر اعتقادات کی رکاوٹ سے آزاد کر دیا جائے جو محض اختلاف اور مباحثے کا باعث ہوتے ہیں، تو وہ سب انسانوں کو اپنے گرد جمع کر لے گا، اور شاید اس کے نام سے ایسی دنیا جو زبان و شمشیر کی خودکشی کی جنگوں سے پارہ پارہ ہو جا رہی ہے، مذہبی وحدت اور اخوت کا امکان پا سکے۔

۳۔ اصلاحِ عقل

اسپی نوزا کی دوسری کتاب کو کھولتے ہی ہم شروع ہی میں فلسفیانہ ادب کے جواہرات میں سے ایک جوہر پر پہنچ جاتے ہیں۔ اس میں اسپی نوزا ہم کو بتاتا ہے کہ اس نے فلسفے کے لئے ہر چیز کو کیوں خیرباد کہہ دیا۔

"جب تجربہ مجھے سکھا چکا کہ تمام وہ چیزیں، جو معمولی زندگی میں اکثر اوقات پیش آتی رہتی ہیں بیکار و بے سود ہیں، اور جب میں نے دیکھا کہ تمام وہ چیزیں جن سے میں ڈرتا تھا اور جو مجھ سے ڈرتی تھیں، اپنے اندر اس کے علاوہ کوئی بھلائی یا برائی نہیں رکھتیں کہ ذہن ان سے متاثر ہوتا ہے، تو میں نے آخر کار فیصلہ کیا کہ آیا کوئی ایسی چیز ہے، جو درحقیقت اچھی ہو سکتی ہے، اور اپنی اچھائی کو منتقل کر سکتی ہے، جس سے ذہن اور سب چیزوں کو چھوڑ کر متاثر ہو، میں کہتا ہوں کہ میں نے یہ دریافت کرنے کا فیصلہ کیا کہ آیا میں

ابدی طور پر مسلسل اور برترین مسرت سے لذت اندوز ہونے کی استعداد کو دریافت اور حاصل کر سکتا ہوں .... میں دیکھ سکتا تھا کہ دولت اور عزت سے بہت فوائد حاصل ہو سکتے ہیں، اور اگر میں نے سنجیدگی کے ساتھ ایک نئی چیز کا انکشاف کرنا چاہا، تو ان چیزوں کے حصول میں رکاوٹ ہو گی۔ .... لیکن یہ چیزیں جتنی بھی زیادہ حاصل ہوتی ہیں، اتنی ہی لذت زیادہ ہوتی ہے، اور اتنی ہی ان کے بڑھانے کی ہوس ہوتی ہے۔ اور اگر کسی وقت ہماری امید بر نہیں آتی تو ہم کو شدید ترین الم ہوتا ہے۔ شہرت کے اندر بھی یہ نقص ہے، کہ اگر ہم اس کو حاصل کرنا چاہیں تو ہمیں اپنی زندگی کو ایسا بنانا چاہیے کہ یہ لوگوں کی پسند کے مطابق ہو جائے۔ جس بات کو عوام
ناپسند کریں اس سے بچنا چاہیے اور جس کو وہ پسند کریں اس کی کوشش ۱۸۳
کرنی چاہیے .... لیکن صرف ابدی اور غیر محدود چیز کی محبت ذہن کو ایسی لذت بخش سکتی ہے، جو ہر قسم کے الم سے محفوظ ہو .... سب سے بڑی چیز اس اتحاد کا علم ہے، جو ذہن کو کل فطرت کے ساتھ ہوتا ہے ...... ذہن کو جس قدر علم ہوتا ہے، اسی قدر بہتر طریق پر یہ اپنی قوتوں اور فطرت کے نظام کو سمجھتا ہے، اور جتنے بہتر طریق پر یہ اپنی قوتوں یا طاقت کو سمجھتا ہے، اتنے ہی بہتر طریق پر یہ اپنی رہبری کے قابل ہو گا یا اپنے لیے اصول قائم کر سکے گا۔ اور جتنا زیادہ یہ فطرت کے نظام کو سمجھے گا اتنا ہی آسانی کے ساتھ یہ اپنے آپ کو غیر ضروری چیزوں سے آزاد کر سکے گا یہی کل طریقہ ہے۔

پس صرف علم ہی قوت اور آزادی ہے۔ اور پائدار مسرت صرف علم کی تلاش اور فہم کی خوشی ہے۔ فی الحال ایک فلسفی کو انسان اور شہری تو رہنا چاہیے۔ تلاش صداقت کے زمانے میں اس کا طرز زندگی کیسا ہونا چاہیے۔ اسپی نوزا کردار کا ایک سادہ اصول قائم کرتا ہے، اور جہاں تک ہم جانتے ہیں، اس کا طریق زندگی اس کے کلیۃً مطابق تھا۔

(ا) لوگوں سے اس انداز میں گفتگو کرنا کہ وہ اس کو سمجھ سکیں، اور ان کے لیے وہ تمام چیزیں کر دینا جو ہمارے مقاصد کے اصول میں حائل

نہوں۔ (۲) صرف ان لذتوں سے بہرہ مند ہونا جو بقائے صحت کے لیے ضروری ہیں۔ (۳) صرف اس قدر روپے کی خواہش کرنا جو ضروریات کے لیے کافی ہو......... یعنے جو بقائے حیات وصحت کے لیے کافی ہو' اور صرف ایسے دستوروں کے مطابق عمل کرنا جو اس مقصد کے منافی نہوں جس کی ہم کو تلاش ہے[1]

لیکن اس جستجو کے شروع کرنے سے پہلے متدین اور روشن دماغ فلسفی فوراً ایک مسئلے پر آکر یہ کہتا ہے۔ میں یہ کس طرح سے جانتا ہوں کہ میرا علم علم ہے' اور میرے حواس جس مواد کو میری عقل تک پہنچاتے ہیں' اس پر کیسے بھروسا کیا جاسکتا ہے۔ اور میری عقل حس کے مواد سے جن نتائج تک پہنچتی ہے ان پر کیسے اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم اپنے آپ کو سواری کے حوالے کریں کیا اس کو جانچ لینا مناسب نہ ہوگا؟ کیا ہمیں اس کے مکمل کرنے کی ممکنہ کوشش نہیں کر لینی چاہیے۔ بیکن کے انداز میں اسپی نوزا کہتا ہے' کہ "سب چیزوں سے پہلے عقل کی اصلاح اور اس کی صفائی کا کوئی طریقہ ایجاد ہونا چاہیے"[2] ہمیں علم کی مختلف صورتوں میں نہایت ہوشیاری کے ساتھ امتیاز کرنا چاہیے اور صرف بہترین پر اعتماد کرنا چاہیے۔ ۱۸۴

پس پہلا علم سماعی ہے جس سے مثلاً میں اپنی تاریخ ولادت جانتا ہوں۔ دوسرا مبہم تجربہ یا ادنی معنے میں تجربی علم ہے مثلاً جب ایک طبیب ایک علاج کو اختباری امتحانات کے حکمی بیان سے نہیں بلکہ ایک عام اثر سے جانتا ہے کہ یہ عموماً کامیاب ہوا ہے۔ تیسرا فوری استنباط یا وہ علم ہے جس تک استدلال سے پہنچتے ہیں' مثلاً جب میں سورج کے متعلق یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ یہ ایک بہت ہی بڑا جسم ہے کیونکہ بُعد سے اشیا کا ظاہری فصل کم ہو جاتا ہے' اس قسم کا علم دوسری دو قسموں پر تفوق رکھتا ہے۔ مگر براہ راست تجربے سے اس کی اچانک تردید ہو جانے کا ڈر لگا رہتا ہے۔ مثلاً حکمت نے سیکڑوں

---

[1] (De Emendatiene) ایوری مین ایڈیشن صفحہ ۲۳۱۔

[2] ایضاً

برس سے ایتھر کے لیے دلائل پیش کیے ہیں جو اچھے طبیعی کے یہاں اب بالکل نامقبول ہیں۔ لہذا بلند ترین علم چوتھی قسم کا ہے جو فوری استنباط اور براہ راست ادراک سے حاصل ہوتا ہے، مثلاً جیسے اس تناسب کے دیکھنے سے لا : ۳ :: ۴ : ۲ ہم کو فوراً ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ ہندسہ ۶ ہے۔ یا جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کل جزو سے بڑا ہوتا ہے اسپی نوزا کے نزدیک جو لوگ ریاضیات کے ماہر ہوتے ہیں وہ اقلیدس کے بیشتر حصے کو اسی طرح وجدانی طریق پر جانتے ہیں۔ مگر وہ افسوس کے ساتھ اعتراف کرتا ہے کہ وہ چیزیں جن کو میں ابتک اس علم سے جان سکا ہوں بہت ہی کم ہیں۔

اخلاقیات میں اسپی نوزا علم کی پہلی دو صورتوں کو ایک میں تحویل کر دیتا ہے، اور وجدانی علم کو اشیا کے ابدی پہلوؤں اور اضافات کا علم کہتا ہے جس کی گویا ایک فقرے میں فلسفے کی تعریف ہو جاتی ہے۔ لہذا وجدانی حکمت اشیا اور واقعات کی تہ میں ان کے قوانین اور ابدی اضافات کا پتا لگانے کی کوشش کرتی ہے۔ اسی سے اسپی نوزا "نظام زمانی" یعنی عالم اشیا و حوادث اور "نظام ابدی" یعنی عالم قوانین و ساخت کے مابین اساسی امتیاز کرتا ہے، جو اس کے کل فلسفے کی بنیاد ہے۔ اب ہم اس امتیاز کا ذرا غور سے مطالعہ کرتے ہیں۔

"خیال رہے کہ یہاں علتوں اور حقیقی اشیا کے سلسلے سے میری قابل تغیر اشیا کا انفرادی سلسلہ مراد نہیں ہے۔ بلکہ مقررہ اور ابدی چیزوں کا سلسلہ مراد ہے۔ کیونکہ انسان ۱۸۵
اپنے ضعف کی بنا پر متغیر اشیا کے ایک سلسلے پر غور نہیں کر سکتا، نہ صرف اس وجہ سے کہ ان کی تعداد شمار سے باہر ہے، بلکہ اس وجہ سے بھی کہ ایک ہی شے میں ایسے بہت سے حالات ہو سکتے ہیں، جن میں سے ہر ایک شے کے وجود کی علت ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس میں شک نہیں کہ جزئی اشیا کا وجود ان کی اصل ماہیت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، اور ابدی حقیقت نہیں ہے۔ مگر ہمیں تغیر پذیر اشیا کے انفرادی سلسلوں کے سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے، کیونکہ ان کی اصل ماہیت صرف مقررہ اور ابدی اشیا میں

مل سکتی ہے اور ان قوانین سے مل سکتی ہے، جو ان اشیا پر ان کے حقیقی ضابطوں کی حیثیت سے ثبت ہوتے ہیں جن کے مطابق تمام انفرادی چیزیں بنتی اور ترتیب پاتی ہیں، نہ صرف یہ بلکہ یہ انفرادی اور تغیر پذیر اشیا ان مقررہ اشیا پر اس درجہ مبنی ہوتی ہیں کہ ان کے بغیر نہ تو ان کا وجود ہو سکتا ہے اور نہ تعقل کیا جا سکتا ہے[۱]۔"

اگر ہم اس عبارت کو اسپی نوزا کے شاہکار کا مطالعہ کرتے وقت ذہن میں رکھیں تو یہ خود بخود واضح ہو جائے گا، اور اخلاقیات کی بہت سی ایسی باتیں جو ہمت شکن حد تک پیچیدہ ہیں، سادہ ہو کر سمجھ میں آجائیں گی۔

۴۔ اخلاقیات

فلسفۂ جدید کا سب سے قیمتی کارنامہ ہندسی انداز میں ہے، تاکہ فکر اقلیدس کی طرح سے واضح ہو جائے۔ مگر نتیجہ اس قدر مجمل اور غیر واضح ہے کہ اس کی ہر سطر کی تفسیر کے لیے ایک تلمود کی ضرورت ہے۔ اہل مدرسہ نے اپنے فکر کو اس طرح مرتب کیا تھا مگر اس قدر صفائی کے ساتھ نہیں، اور صفائی میں ان کو اپنے پہلے سے متعین کیے ہوئے نتائج سے بھی امداد ملی تھی۔ ڈیکارٹ نے کہا تھا کہ فلسفہ اس وقت تک قطعی نہیں ہو سکتا، جب تک یہ خود کو ریاضیات کی صورت میں ظاہر نہ کرے۔ مگر اس نے اپنے نصب العین کو عملی جامہ پہنانے

[۱]۔ دیکھو بیکن کی (Novum Organum) حصۂ دوم فقرہ۔ ۱۱۲ صفحہ ۲۵۹ کیونکہ اگرچہ فطرت میں انفرادی اجسام کے علاوہ اور کسی شے کا وجود نہیں ہے، جو جزئی قوانین کے مطابق صاف اثرات کو دکھاتے ہیں، مگر اس کے باوجود علم کے ہر شعبے میں یہی قوانین (ان کی تحقیق انکشاف و ترقی) نظریے اور عمل کی بنیاد ہیں، اساسی طور پر تمام فلاسفہ متفق ہیں۔

کی کبھی کوشش نہ کی تھی۔ اسپی نوزا اس خیال پر ایسے ذہن کے ساتھ آیا جو ریاضیات میں ایسی مہارت رکھتا تھا، جو ہر قسم کے شدید حکمی عمل کی بنیاد ہونے کے لیے کافی تھی، اور اس کے ساتھ ہی وہ کاپرنیکس کیپلر گلیلو کے کارناموں سے متاثر تھا۔ ہمارے کمزور ذہنوں کے لیے تو نتیجہ ایسا ہے کہ مادہ اور صورت دونوں غور کرتے کرتے تھک جائیں۔ اور ہم خود کو یہ کہہ کر تشفی دینے پر مائل ہوتے ہیں کہ یہ فلسفیانہ ہندسۂ فکر کی مصنوعی شطرنج ہے جس میں کلیات تعریفات مسائل اور ثبوت اس طرح سے مقرر کر دیے گئے ہیں جس طرح سے شطرنج میں بادشاہ، فیل، گھوڑے اور پیدل مقرر کر دیے جاتے ہیں، اور یہ ایک منطقی گورکھ دھندا ہے، جس کو اسپی نوزا نے تنہائی میں جی بہلانے کے لیے ایجاد کیا تھا، ترتیب و باقاعدگی ہمارے اذہان کے طبعاً خلاف پڑتی ہے۔ ہم تخیل کے گمراہ کن راستوں پر چلنے کو ترجیح دیتے ہیں، اور اپنے فلسفوں کا جالا اپنے خوابوں کی بنیاد پر بنتے ہیں۔ مگر اسپی نوزا کو صرف ایک خواہش مجبور کر رہی تھی اور وہ یہ کہ دنیا کی ناقابل برداشت ابتری کو وحدت اور باقاعدگی میں بدل دے۔ اس کو جنوب والوں کی طرح سے حسن کی حرص نہ تھی بلکہ وہ شمال والوں کی طرح صداقت کا بھوکا تھا۔ اس کا صناع لطیف خالص معمار تھا، جس کا صرف یہ مقصد تھا کہ ایک نظام فکر کی کامل موزونی صورت کے ساتھ تعمیر کرائے۔ 186

دور جدید کا طالب علم اسپی نوزا کی اصطلاحات پر ٹھوکر کھائے گا اور بگڑے گا۔ وہ لاطینی میں لکھ رہا تھا، اور اپنے فکر کو جو اساسی طور پر جدید ہے قرون وسطیٰ کی اور مدرسی اصطلاحات میں بیان کرنے پر مجبور تھا اس کے علاوہ فلسفے کی کوئی زبان نہ تھی جو اس زمانے میں سمجھی جاتی۔ اس لیے وہ لفظ جوہر استعمال کرتا ہے، جہاں کہ ہم کو حقیقت یا ماہیت لکھنا چاہیے کامل لکھتا ہے جہاں کہ ہم کو مکمل لکھنا چاہیے، نصب العین لکھتا ہے جہاں کہ ہم کو معروض لکھنا چاہیے۔ موضوعی طور پر کی جگہ معروضی طور پر لکھتا ہے، اور معروضی طور پر کی جگہ صوری طور پر لکھتا ہے دوڑ کے اندر

یہ رکاوٹیں ہیں جو کمزور کو پست ہمت کردیں گی مگر قوی میں اور جوش پیدا کردیں گی۔

مختصر یہ کہ اسپی نوزا پڑھنے کی چیز نہیں بلکہ مطالعے کی چیز ہے ہمیں اس کی طرف اس طرح سے آنا چاہئے' جس طرح سے اقلیدس کی طرف آتے ہو یعنے یہ تسلیم کرکے کہ ان دو سو مختصر صفحات کے اندر ایک شخص نے اپنی پوری زندگی کے فکر کو بھر دیا ہے' جس میں سے انتہائی کوشش سے حشو و زوائد بالکل حذف کردیے گئے ہیں۔ یہ نہ خیال کرو کہ سرسری طور پر پڑھنے سے اس کے مغز تک پہنچ جاؤ گے۔ فلسفے کی کوئی تصنیف اس قدر مختصر کبھی نہیں لکھی گئی کہ بغیر نقصان کے اس کو سرسری طور پر پڑھ ہی نہ سکتے ہوں۔ ہر حصہ ماقبل کے
حصے پر مبنی ہے۔ بعض صریح اور بظاہر غیر ضروری دعویٰ شاندار منطقی ۱۸۷
استدلال کے کونے کا پتھر ثابت ہوتا ہے۔ تم کسی اہم فصل کو کامل طور پر اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک تم نے کل کو پڑھ کر اس پر غور نہ کرلیا ہو' اگرچہ جاکوبی کا یہ بیان مبالغہ آمیز ہے کہ جس شخص کے اخلاقیات کی صرف ایک سطر بھی پوری طرح سے سمجھ میں نہ آتی ہو' اس نے اسپی نوزا کو سمجھا ہی نہیں۔ اسپی نوزا اپنی کتاب کے دوسرے حصے میں کہتا ہے یہاں پر پڑھنے والا ضرور پریشان ہوگا۔ اور اسے ایسی بہت سی چیزیں یاد آئیں گی جن کی وجہ سے وہ بالکل رک جائے گا۔ اس لیے میں اس سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے ساتھ آہستہ آہستہ چلے اور ان چیزوں کے متعلق پوری کتاب کے ختم کرنے سے پہلے کوئی رائے قائم نہ کرے[1]۔ ساری کتاب کو ایک وقت نہ پڑھو بلکہ اس کے تھوڑے تھوڑے سے حصے مختلف نشستوں میں پڑھو۔ اور ختم کرنے کے بعد یہ خیال کرو کہ تم نے اس کو سمجھنا اب شروع کیا ہے۔ اس کے بعد کوئی شرح پڑھو مثلاً اسپی نوزا مصنفۂ پالک یا مطالعۂ اسپی نوزا مصنفۂ مارٹینو یا بہتر یہ ہے کہ دونوں کو پڑھ ڈالو۔ اس کے بعد اخلاقیات کو پھر پڑھو اس وقت تم کو یہ ایک نئی کتاب معلوم ہوگی دوسری مرتبہ ختم کرنے کے بعد

۱۔ حصہ مسئلۂ یاز دہم تعلیق۔

تم فلسفے کے ہمیشہ عاشق رہو گے۔

فطرت اور خدا

پہلا صفحہ ہی تم کو مابعد الطبیعیات کے گرداب عظیم میں لا ڈالتا ہے۔ ہماری مابعد الطبیعیات کی جدید عملی (یا مجنونانہ) نفرت ہم پر غلبہ پالیتی ہے اور ایک لمحے کے لیے ہم چاہتے ہیں کہ ہم اسپی نوزا کے علاوہ اور کوئی کتاب پڑھتے ہوتے۔ لیکن مابعد الطبیعیات جیساکہ ولیم جیمس نے کہا ہے' اشیا کے مفہوم پر اصلی صفائی کے ساتھ غور کرنے اور یہ دریافت کرنے کی کوشش کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے' کہ نظام حقیقت کے اندر ان کی اصل ماہیت کیا ہے' یا جیساکہ اسپی نوزا کہتا ہے کہ ان کا اصل جوہر کیا ہے' اس طرح سے کل حقیقت کو باوحدت بنانا' اور سب سے بلند پایہ تعمیم تک پہنچنا' جس پر ایک عملی انگریز کے نزدیک بھی فلسفہ مشتمل ہوتا ہے۔ خود حکمت جو اس قدر مغرورانہ انداز میں مابعد الطبیعیات سے اظہار نفرت کرتی ہے' اپنے فکر کے اندر مابعد الطبیعیات کو مسلم جانتی ہے اور اتفاقاً جس مابعد الطبیعیات کو یہ مسلم مانتی ہے وہ اسپی نوزا ہی کی مابعد الطبیعیات ہے۔

188 اسپی نوزا کے فلسفے میں تین بنیادی اصطلاحیں ہیں۔ جوہر صفت اور ہیئت۔ صفت سے ہم سادگی کی خاطر ذرا دیر کے لیے قطع نظر کیے لیتے ہیں۔ ہیئت کوئی خاص انفرادی شے یا واقعہ کوئی خاص صورت یا شکل ہوتی جو حقیقت عارضی طور پر اختیار کرتی ہے۔ تم تمہارا جسم تمہارے افکار تمہاری جماعت تمہاری نوع تمہارا کرہ یہ سب ہیئتیں ہیں۔ یہ سب کسی ایسی ابدی ناقابل تغیر حقیقت کی صورتیں یا ماہیتیں ہیں جو ان کی تہ میں یا ان کے پس پردہ ہے۔

یہ حقیقت کیا ہے؟ اسپی نوزا اس کو جوہر کہتا ہے۔ آٹھ نسلیں

گزر چکی ہیں، اور اصطلاح کے مفہوم پر وہ جنگ وجدل ہوئی ہے کہ کتابیں کی کتابیں تصنیف ہو گئی ہیں۔ اگر ہم اس معاملے کو ایک پیرا گراف میں سلجھانے سے قاصر رہیں تو اس پر ہم کو ہمت نہ ہارنی چاہئے۔ مگر ایک غلطی سے ہم کو بچے رہنا چاہئے۔ جوہر کے معنے کسی شے کے مادے کے نہیں ہیں مثلاً جیسے ہم لکڑی کو کرسی کا مادہ کہتے ہیں۔ ہم اسپی نوزا کے مطلب تک اس وقت پہنچتے ہیں جب ہم اس تقریر کے جوہر کا ذکر کرتے ہیں۔ اگر ہم مدرسی فلاسفہ کی طرف لوٹیں۔ جن سے اسپی نوزا نے یہ اصطلاح لی ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اس کو یونانی لفظ (ousia) کے ترجمے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ جو (einai) کا اسم حال ہے جس کے معنے ہونے کے ہیں، اور داخلی وجود یا ماہیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ پس جوہر وہ ہے جو ہے (اسپی نوزا کتاب پیدائش کے موثر فقرے کو نہ بھولا تھا، کہ "میں وہ ہوں جو ہوں")، وہ جو ابدی اور غیر متغیر طور پر ہے، اور جس کی اور ہر شے کو عارضی صورت یا ہئیت ہونا چاہئے۔ اب اگر ہم عالم کی اس تقسیم جوہر و ہئیت کا اس تقسیم سے مقابلہ کریں جو اسپی نوزا نے "اصلاح عقل" میں کی ہے یعنے ایک طرف قوانین اور غیر متغیر اضافات ابدی نظام اور دوسری طرف وقت سے پیدا ہونے والی اور فانی اشیاء کا نظام عارضی، تو ہم تسلیم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ اسپی نوزا جوہر سے یہاں تقریباً وہی مراد لیتا ہے جو وہاں ابدی نظام سے مراد لیتا ہے۔ اگر عارضی طور پر اس کو لفظ جوہر کا ایک عنصر فرض کرلیں، تو یہ زندگی کی اس ساخت کی طرف اشارہ کرنے لگتا ہے، جو تمام حوادث و اشیا کی تہ میں ہے اور جو عالم کی اصل روح ہے۔

لیکن آگے چل کر اسپی نوزا لفظ جوہر کو فطرت اور خدا کے مطابق قرار دیتا ہے اہل مدرسہ کے طریق کے مطابق وہ فطرت کا دو پہلوؤں سے تعقل کرتا ہے۔ اول ایک فعلی اور حیاتی عمل کی حیثیت سے جس کو فطرت خالق کہتا ہے جس کو برگسان (elan Vital) یا ارتقائے تخلیقی کہتا ہے ۱۸۶

دوسرے اس عمل کے انفعالی عمل کی حیثیت سے یعنے فطرت مخلوق یا فطرت کا مواد و ما فیہ اس کے جنگل اس کی ہوائیں اس کے پانی اس کے پہاڑ اس کے کھیت اور اس کی ہزار ہا دوسری صورتیں' بعد کی صورت میں تو وہ فطرت جوہر اور خدا کے ایک ہونے سے انکار کرتا ہے' اور پہلے معنے میں وہ ان کے ایک ہونے کا مدعی ہے۔ جوہر اور رینیتیں' ابدی نظام' اور عارضی نظام' فعلی فطرت اور انفعالی فطرت خدا اور عالم یہ سب کی سب اسپی نوزا کے نزدیک مرادف تقسیمیں ہیں' ان میں سے ہر ایک کائنات کو جوہر اور عرض میں تقسیم کر دیتی ہے۔ یہ بات کہ جوہر غیر مادی ہے' یعنے یہ صورت ہے اور مادہ نہیں ہے اور اس کو فکر اور مادے کے اس مخلوط اور ہیجان مرکب سے کوئی تعلق نہیں ہے جو بعض حضرات نے فرض کر رکھا ہے' جوہر کو فطرت تخلیقی کے مرادف قرار دینے اور فطرت انفعالی یا مادی سے ممیز کرنے سے بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ اسپی نوزا کے خطوط سے ایک عبارت نقل کی جاتی ہے' یہ اس کے مفہوم کے سمجھنے میں معین ہوگی۔

''میری خدا اور فطرت کے متعلق اس سے بالکل مختلف رائے ہے جو بعد کے عیسائی عموماً رکھتے ہیں۔ کیونکہ میرے نزدیک خدا تمام اشیا کی خارجی نہیں بلکہ داخلی علت ہے۔ میں کہتا ہوں کہ سب چیزیں خدا کے اندر ہیں سب چیزیں خدا میں زندہ ہیں اور اس میں حرکت کرتی ہیں۔ اس بارے میں رسول پال اور شاید زمانۂ قدیم کے تمام فلاسفہ مجھ سے متفق ہیں' اگرچہ ایک اعتبار سے میرا خیال ان سے کچھ مختلف ہے۔ میں تو یہ کہنے کی بھی جرأت کر سکتا ہوں کہ میرا خیال وہی ہے جو قدیم عبرانیوں کا تھا' بعض روایات سے اگرچہ وہ بہت کچھ مسخ ہو گئی ہیں یہ مستنبط ہوتا ہے۔ مگر جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ میری غرض یہ ثابت کرنا ہے کہ خدا اور فطرت جس سے وہ جسمی مادے کے ایک انبار کو سمجھتے ہیں' ایک چیز ہیں وہ بالکل غلطی پر ہیں' میری ایسی کوئی نیت نہ تھی[1]''

[1] ۔ خط نمبر ۲۱ ۔

پھر "مذہب اور مملکت" میں وہ لکھتا ہے، خدا کی مدد سے میری مراد
190 مقررہ اور اٹل نظام فطرت یا فطری حوادث کا سلسلہ ہے [1] فطرت کے
کلی قوانین اور خدا کے ابدی فیصلے میرے نزدیک ایک ہی چیز ہیں۔ "خدا
کی غیر محدود فطرت سے سب چیزیں اسی لزوم کے ساتھ اور اسی طرح سے
عالم وجود میں آتی ہیں، جس طرح سے ایک مثلث کی فطرت سے ابد سے ابد تک
یہ مترشح ہوتا ہے کہ اس کے تینوں زاویے مل کر دو قائموں کے مساوی
ہوتے ہیں [2]، جو نسبت دائرے کے قوانین کو کل دائروں سے ہوتی ہے
وہی نسبت خدا کو عالم سے ہے۔ جوہر کی طرح سے خدا علی سلسلہ یا عمل ہے یعنے وہ
شرط جو تمام اشیا کی تہ میں مضمر ہوتی ہے، عالم کا قانون اور اس کی ساخت
ہیئتوں اور اشیا کی مقرون کائنات کو خدا سے وہی نسبت ہے جو پل کو
اپنے نقشے اپنی ساخت اور ریاضیات اور مکانیک کے ان قوانین سے
ہوتی ہے جن کے مطابق یہ بنتا ہے۔ ان کے بغیر یہ قائم نہیں رہ سکتا بلکہ
گر جائے گا۔ اور پل کی طرح سے عالم بھی اپنی ساخت اور اس کے قوانین
سے قائم ہے، یہ خدا کے ہاتھ میں تھمی ہوئی ہے۔

خدا کا ارادہ اور فطرت کے قوانین چونکہ ایک ہی حقیقت ہیں جس کو
صرف مختلف الفاظ میں ادا کیا جاتا ہے لہذا تمام حوادث و واقعات غیر متغیر
قوانین کا میکانیکی عمل ہیں، اور ایک غیر ذمہ دار مطلق العنان حاکم کے
اشارات نہیں جو ستاروں میں بیٹھا ہوا اپنے حسب منشا حکم چلاتا ہو۔
جو مکانیت ڈیکارٹ کو صرف مادے اور جسم میں نظر آتی تھی اسپی نوزا
کو وہ خدا اور ذہن میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ جبریت کا عالم ہے جس میں
تدبیر کو دخل نہیں ہے۔ چونکہ ہم شعوری غایتوں کے لیے عمل کرتے ہیں اس لیے
ہم سمجھتے ہیں کہ تمام اعمال کے پیش نظر اس قسم کی غایتیں ہوتی ہیں۔ اور چونکہ

[1] - باب ۳ -
[2] - اخلاقیات حصہ اول صفحہ ۱۷ تعلیق -

ہم انسان ہیں اس لیے ہم یہ فرض کرتے ہیں کہ تمام واقعات وحوادث کا مقصد انسان ہے، اور سب چیزوں کا مقصد یہ ہے کہ انسان کی اغراض کو پورا کریں مگر یہ ہمارے اور بہت سے افکار کی طرح سے انسان کو مرکز بنانے کا دھوکا ہے۔ ہماری سب سے بڑی غلطیوں کی جڑ یہ ہے کہ ہم اپنے انسانی معیارات وترجیحات کو کائنات خارجی تک ممتد کر لیتے ہیں۔ اسی سے ہمارے لیے مسئلۂ شر پیدا ہوتا ہے۔ ہم زندگی کی برائیوں اور خدا کی اچھائیوں کے مابین مطابقت پیدا کرنا چاہتے ہیں، اور ایوبؑ نے جو سبق دیا تھا اس کو بھول جاتے ہیں کہ
191 خدا ہماری چھوٹی سی خیر اور چھوٹے سے شر سے بالاتر ہے۔ خیر و شر انسانی اور اکثر اوقات انفرادی مذاق و مقاصد سے تعلق رکھتے ہیں، اور ان کی ایسی کائنات کے لیے کوئی حقیقت نہیں جس کے لیے افراد آنی وجود ہوتے ہیں اور جس میں متحرک انگلی ایک نسل کی تاریخ کو بھی گویا پانی پر لکھتی ہے۔

"لہذا فطرت کے اندر جب کبھی ہم کو کوئی چیز مضحکہ خیز، مہمل، بری معلوم ہو، تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہم کو اشیا کا صرف جزئی علم ہوتا ہے، اور بہ حیثیت مجموعی کل فطرت کے نظام و ترتیب سے ہم زیادہ تر ناواقف ہوتے ہیں، اور اس کی یہ بھی وجہ ہوتی ہے کہ ہم ہر شے کو اپنی عقل کے مطالبات کے مطابق مرتب دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگرچہ فی الحقیقت جس چیز کو ہماری عقل برا کہتی ہے، وہ فطرت کلی کے نظام و قوانین کے اعتبار سے بری نہیں ہوتی، بلکہ صرف ان قوانین کے اعتبار سے بری ہوتی ہے، جو محض ہماری فطرت سے تعلق رکھتے ہیں.............. اچھے اور برے کی اصطلاحات کے متعلق یہ ہے کہ یہ بذات خود کسی قطعی شے کی طرف اشارہ نہیں کرتے........ کیونکہ ایک ہی شے ایک ہی وقت میں اچھی بری اور ایسی ہو سکتی ہے جو نہ اچھی ہو اور نہ بری ہو۔ کیونکہ گانا افسردہ کے لیے اچھا ہوتا ہے، اور سوگواروں کے لیے برا ہوتا ہے اور مردوں کے لیے نہ اچھا ہوتا ہے اور نہ برا۔"

نیک و بد ایسے تعصبات ہیں جن کو ابدی حقیقت تسلیم نہیں کر سکتی

"صحیح طریقہ یہ ہے کہ دنیا غیر محدود کی پوری فطرت کی تشریح کرے، نہ کہ صرف
انسان کے جزوی نصب العینوں کی۔ جو حال نیک و بد یا اچھے اور برے
کا ہے وہی حال حسن و قبح کا ہے۔ یہ بھی ذہنی اور شخصی اصطلاحیں ہیں، جن کو
اگر کائنات کی طرف پھینکا جائے تو یہ بغیر تسلیم کی ہوئی واپس ہونگی۔ "میں
متنبہ کئے دیتا ہوں کہ میں فطرت سے خوبصورتی یا بدصورتی باقاعدگی یا ابتری کچھ منسوب
نہیں کرتا۔ صرف ہمارے تمثل کی نسبت سے اشیا خوبصورت یا بدصورت
منظم یا پریشان کہلائی جا سکتی ہیں"۔ "مثلاً اگر وہ حرکت جو ہمارے اعصاب کو
اشیا کے دیکھنے سے حاصل ہوتی ہے صحت کے لئے مفید ہے، تو اشیا خوبصورت
کہلاتی ہیں اور اگر مضر ہے تو بدصورت کہلاتی ہیں"۔ ایسی عبارتوں میں اسپی نوزا
افلاطون سے آگے بڑھ جاتا ہے، جس کا خیال تھا کہ اس کے جمالیاتی احکام ۱۹۲
تخلیق کے قوانین اور خدا کے ابدی فیصلے ہونے چاہئیں۔

کیا خدا شخص ہے۔ خدا اس لفظ کے انسانی معنے میں ہرگز شخص نہیں
ہے۔ اسپی نوزا عوام کے عقیدے کا ذکر کرتا ہے جو اب بھی خدا کو مونث نہیں
بلکہ مذکر تصور کرتا ہے" اور وہ ایسے تصور کے رد کر دینے میں کافی طور پر حامی
نسواں ہونے کا ثبوت دیتا ہے، جو زمین پر عورت کے مرد کے تابع و ماتحت
ہونے کا پرتو ہے۔ ایک شخص کے خط کا جواب دیتے ہوئے، جس نے خدا
کے غیر شخصی تصور پر اعتراض کیا تھا، اسپی نوزا ایسے الفاظ میں لکھتا ہے
جو قدیم یونانی ارتیابی زینافینز کو یاد دلاتے ہیں۔

جب تم کہتے ہو کہ میں خدا کے لیے دیکھنے سننے مشاہدہ کرنے ارادہ کرنے
وغیرہ کے اعمال کو جائز نہیں سمجھتا، تو تم نہیں جانتے کہ میرا خدا کس قسم کا ہے اس
لئے میں یہ قیاس کرتا ہوں کہ تمہارے نزدیک اس سے بڑا کوئی کمال
نہیں ہو سکتا جس کی مذکورۂ بالا صفات سے توجیہ ہو سکے۔ مجھے اس پر
حیرت نہیں ہے۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ اگر ایک مثلث بول سکتا، تو وہ ضرور
یہ کہتا کہ خدا کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ یہ مثلث ہے۔ اور اگر دائرے کو
گویائی حاصل ہو گئی ہوتی تو وہ کہتا کہ خدا کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ

وہ گول ہے، اور اس طرح سے ہر ایک اپنی صفات خدا سے منسوب کرے گا۔
الحاصل خدا کی فطرت سے ان معمولی معنے میں جن میں کہ یہ انسانی اوصاف خدا سے منسوب کیے جاتے ہیں نہ تو عقل کا تعلق ہے اور نہ ارادے کا۔ بلکہ خدا کا ارادہ تمام اسباب و قوانین کا مجموعہ ہے؛ اور خدا کی عقل کل ذہن کا اسپی نوزا کے تصور کے مطابق "خدا کی عقل وہ تمام ذہنیت ہے جو زمان و مکان میں بکھری ہوئی ہے، یعنے وہ منتشر شعور جو عالم میں زندگی پیدا کرتا ہے۔" تمام چیزیں ذی روح ہیں، اگرچہ ان کے ذی روح ہونے کے مدارج میں کتنا ہی فرق کیوں نہ ہو۔ زندگی یا ذہن، ہر اس شے کا جس کو ہم جانتے ہیں ایک رخ یا پہلو ہے، مادی امتداد یا جسم دوسرا پہلو ہے۔ یہ دو پہلو یا صفتیں (جیسا کہ اسپی نوزا ان کو کہتا ہے) ہیں جن کے ذریعے سے ہم جوہر یا خدا کے اعمال کا ادراک کرتے ہیں۔ اس معنی میں خدا (جو اشیا کے تحول کے پس پردہ عام عمل اور ابدی حقیقت ہے) کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے، کہ اس کے ذہن اور جسم دونوں ہیں۔ خدا نہ مادہ ہے، اور نہ ذہن ہے بلکہ ذہنی اور ملکزاتی اعمال جن سے عالم کی دوگونہ تاریخ بنی ہے، اور ان کے اسباب و قوانین خدا ہیں۔ ۱۹۳

۲۔ ذہن اور مادہ

لیکن ذہن کیا ہے؟ اور مادہ کیا ہے؟ کیا ذہن مادی ہے جیسا کہ تخیل سے بے بہرہ لوگ فرض کرتے ہیں یا جسم محض ایک تصور ہے جیسا کہ بعض تخیلی لوگ فرض کرتے ہیں؟ ذہنی عمل دماغی عمل کی علت ہے، یا معلول ہے، یا یہ جیسا کہ میلی برانشی کا خیال ہے ایک دوسرے سے بے تعلق اور آزاد ہیں اور صرف حسن اتفاق سے متوازی ہو گئے ہیں۔
اسپی نوزا جواب دیتا ہے کہ نہ تو ذہن مادی ہے اور نہ مادہ ذہنی ہے،

دماغی عمل فکر کی نہ تو علت ہے اور نہ اس کا معلول ہے، اور نہ دونوں ایک دوسرے سے بے تعلق اور متوازی ہیں۔ کیونکہ دو عمل اور دو علیحدہ علیحدہ چیزیں نہیں ہیں۔ صرف ایک عمل ہے جس کو داخلی طور پر دیکھو تو فکر ہے، اور خارجی طور پر دیکھو تو حرکت ہے۔ صرف ایک چیز ہے، جس کو اگر اندر سے دیکھا جائے تو ذہن ہے، اور باہر سے دیکھا جائے تو مادہ ہے، مگر درحقیقت یہ دونوں کی ایسی وحدت اور دونوں کا ایسا مجموعہ ہے جس سے ان کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ذہن اور جسم ایک دوسرے پر عمل نہیں کرتے کیونکہ ایک دوسرے سے مختلف نہیں بلکہ ایک ہیں۔ "جسم ذہن کو خیال کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا اور نہ ذہن جسم کو حرکت کرنے یا ساکن رہنے یا کسی اور حالت پر مجبور کر سکتا ہے" اور اس کی محض یہ وجہ ہے[۱] کہ ذہن کا فیصلہ اور جسم کی خواہش ایک چیز ہیں[۲]" اور اس طرح سے تمام دنیا با وحدت طور پر .... دہری ہے۔ جہاں کہیں خارجی مادی عمل ہے، وہ حقیقی عمل کا صرف ایک رخ ہے، جس کے متضائف پوری طرح سے دیکھنے والے کو ایک داخلی عمل بھی معلوم ہوگا، اگرچہ بہ اعتبار کمیت یہ اس ذہنی عمل سے کتنا ہی مختلف کیوں نہ ہو، جو ہم اپنے اندر پاتے ہیں۔ داخلی اور ذہنی عمل ہر نوبت پر خارجی کا اور "مادی" عمل کے مطابق ہوتا ہے۔ "تصورات کا نظم و ربط وہی ہوتا ہے، جو اشیا کا ہوتا ہے"، لیے جوہر فکری اور جوہر ممتد ایک ہی چیز ہیں جن کو اب ایک "صفت" یا پہلو کے ذریعے سے سمجھا جاتا ہے اور اب دوسری صفت یا پہلو کے ذریعے سے۔ بعض یہودیوں نے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کو محسوس کیا ہے اگرچہ مبہم طور پر محسوس کیا ہے، کیونکہ انھوں نے کہا ہے کہ خدا اور اس کی عقل اور وہ اشیا جن کا اس کی عقل سے تعقل ہوتا ہے ایک ہی شے ہیں[۳]۔ ۱۹۴

۱۔ اخلاقیات فقرہ ۳، ۲۔

۲۔ ۲ — ۱۷۔

۳۔ ایضاً تعلیق۔

اگر ذہن کو وسیع معنے میں نظام عصبی اور اس کے تمام حصوں کے مطابق سمجھا جائے، تو جسم کے ہر تغیر کے ساتھ ایک متضائف تغیر "ذہن" کے اندر بھی ہو گا جس طرح افکار اور ذہنی اعمال ذہن کے اندر مربوط و مرتب ہوتے ہیں، ٹھیک اسی طرح سے جسم میں اس کے تغیرات اور اشیا کے تغیرات جو جسم کو حسوں کے ذریعے متاثر کرتے ہیں، اپنی ترتیب کے مطابق مربوط و مرتب ہوتے ہیں" اور جسم کو کوئی ایسی بات پیش نہیں آسکتی جس کا ذہن کو ادراک نہ ہو جاتا ہو، اور شعوری یا غیر شعوری طور پر محسوس نہ کر لیتا ہو۔ جس طرح سے محسوس ہونے کے اعتبار سے جذبہ ایک کل کا جزو ہے جس کی وہ تغیرات بنیاد ہوتے ہیں جو دوران خون تنفس اور ہضم کے نظامات میں ہوتے ہیں، اسی طرح سے ایک تصور جسمانی تغیرات کے ساتھ ایک پیچیدہ عضوی عمل کا جزو ہوتا ہے۔ ریاضیاتی غور و فکر کے خفیف ترین اجزا بھی جسم کے اندر اپنا متضائف رکھتے ہیں (کیا حامیان کرداریت (Behaviarists) نے انسان کے افکار کا آلات صوت کے غیر ارادی ارتعاشات کے ضبط کرنے سے پتا چلانے کا دعویٰ نہیں کیا جو ہر قسم کے فکر کے ہمراہ ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں)

جسم و ذہن کے امتیاز کو اس طرح سے دور کرنے کی کوشش کر لینے کے بعد اسپی نوزا عقل و ارادے کے فرق کو ایک فرق کمیت کے مسئلے میں تحویل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ذہن کے اندر عقل اور ارادے کی علیحدہ علیحدہ استعدادیں نہیں چہ جائیکہ تمثل اور حافظے کی۔ ذہن ایسا عامل نہیں ہے جو تصورات پر عمل کرتا ہو۔ بلکہ یہ تو خود تصورات کے عمل اور ان کے سلسلے پر مشتمل ہوتا ہے۔ عقل سلسلۂ تصورات کے لیے محض ایک مجرد اور مختصر اصطلاح ہے۔ اور ارادہ سلسلۂ اعمال دینیات ۱۹۵
کے لیے ایک مجرد اصطلاح ہے۔ "عقل اور ارادہ کسی خاص تصور یا ارادے سے وہی نسبت رکھتا ہے جو حجریت کسی خاص پتھر سے رکھتی ہے۔" ارادہ اور عقل ایک ہی چیز ہیں، کیونکہ نیت محض ایک تصور ہوتی ہے جو اختلافات کی کثرت سے (یا شاید مخالف تصورات کے نہ ہونے سے) شعور میں اتنی دیر رہتا ہے کہ

عمل میں منتقل ہو جاتا ہے۔ ہر تصور اگر مخالف تصور اس کو روک نہ دے تو عمل میں منتقل ہوتا ہے۔ خود تصور باوحدت عضوی عمل کی پہلی منزل ہوتا ہے جس کا خارجی عمل تکمیل ہے۔

جس چیز کو اکثر ارادہ کہا جاتا ہے، یعنی وہ تسویقی قوت جو شعور میں ایک تصور کی مدت کو متعین کرتی ہے، اس کو خواہش کہنا چاہئے۔ یہ انسان کی ما بہ لا امتیاز صفت ہے۔ خواہش ایک اشتہا یا جبلت ہوتی ہے، جس کا ہم کو شعور ہوتا ہے۔ مگر جبلتوں کے لیے یہ ضروری نہیں کہ ہمیشہ شعوری خواہش کے واسطے سے عمل کیا کریں جبلتوں کی تہ میں بقائے نفس کی مبہم اور گوناگوں سعی ہوتی ہے۔ اسپی نوزا کو یہ اسی طرح سے تمام انسانی اور تحت انسانی فعلیت میں نظر آتی ہے، جس طرح سے شوپنہائر اور نیٹشے زندہ رہنے اور قوت حاصل کرنے کے ارادے کو ہر جگہ دیکھنے والے تھے۔ فلاسفہ میں بہت کم اختلاف ہوتا ہے۔

"ہر شے اپنی حد تک اپنے وجود کو باقی رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ اور وہ کوشش جس سے ایک شے اپنے وجود کو باقی رکھنا چاہتی ہے، اس شے کی حقیقی روح کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتی" وہ قوت جس سے ایک شے اسے باقی رکھنے کی کوشش کرتی ہے، اس کے وجود کا مغز اور جوہر ہوتا ہے۔ ہر جبلت فطرت کی ایسی تدبیر ہوتی ہے جس سے فرد (یا جیسا کہ ہمارا تنہا زندگی بسر کرنے والا کنوارا اضافہ کرنے سے قاصر رہتا ہے، نوع یا جماعت) باقی رہتا ہے۔ لذت و الم ایک جبلت کی تشفی یا اس کی راہ میں رکاوٹ ہوتے ہیں، وہ ہماری خواہشوں کے اسباب نہیں بلکہ ان
196 کے نتائج ہوتے ہیں۔ ہم اشیا کی اس لیے خواہش نہیں کرتے کہ یہ ہمارے لیے لذت بخش ہوتی ہیں، بلکہ وہ ہمارے لیے اس وجہ سے باعث لذت ہوتے ہیں، کہ ہم کو ان کی خواہش ہوتی ہے۔ اور ہم کو ان کی اس لیے خواہش ہوتی ہے کہ ہم ان کی خواہش پر مجبور ہوتے ہیں۔

لہذا اختیار کا وجود نہیں ہے۔ بقا کی ضروریات جبلت کا تعین کرتی ہیں جبلت خواہش کا تعین کرتی ہے، اور خواہش فکر و عمل کا تعین کرتی ہے۔ "ذہن کے فیصلے خواہشوں کے علاوہ نہیں ہوتے، جو مزاجوں کے اعتبار سے مختلف

ہوتے ہیں"۔ "ذہن کے اندر کوئی مطلق یا مختار ارادہ نہیں ہوتا، بلکہ ذہن کو کسی شے
کے ارادہ کرنے پر ایک علت مجبور کرتی ہے، اور اس علت کا تعین دوسری علت سے
ہوتا ہے اور اسی طرح سے یہ سلسلہ لاتناہی طور پر چلا جاتا ہے۔ انسان اپنے آپ کو
با اختیار خیال کرتے ہیں، کیونکہ ان کو اپنی نیتوں اور خواہشوں کا شعور ہوتا ہے، مگر
انہیں ان اسباب وعلل کا علم نہیں ہوتا، جن کی بنا پر وہ خواہش کرتے ہیں"۔ اسپی نوزا
اختیار کے احساس کو ایک پتھر سے تشبیہ دیتا ہے، جو فضا میں سے گزرتے ہوئے یہ خیال
کرتا ہے کہ میں اپنی گردش کا خود تعین کرتا ہوں اور اس جگہ اور اس وقت کا خود
انتخاب کرتا ہوں جس پر میں زمین پر گروں گا۔

چونکہ انسانی افعال ایسے مقررہ قوانین کے تابع ہوتے ہیں، جیسے ہندسے
کے ہیں، اس لیے نفسیات کا ہندسی شکل میں، اور ریاضیاتی خارجیت کے ساتھ
مطالعہ ہونا چاہئے۔ "میں انسانوں کے متعلق اس انداز میں بحث کروں گا، گویا
میں خطوط مستوی اور مکعب شکلوں سے بحث کر رہا ہوں"۔ "میں نے جو عرق ریزی
کی ہے وہ افعال انسانی کا مذاق اڑانے یا ان پر ماتم کرنے یا لعنت بھیجنے کے لیے
نہیں کی ہے، بلکہ ان کو سمجھنے کے لیے کی ہے، اور اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر میں
نے انسانی جذبات وعواطف کا فطرت انسانی کے معائب کی حیثیت سے نہیں بلکہ
ایسے خواص کی حیثیت سے مطالعہ کیا ہے، جو اس سے اسی قدر مناسبت رکھتے
ہیں، جس قدر حرارت، برودت، طوفان، برق و رعد فضا کی فطرت سے مناسبت
رکھتے ہیں"۔ موضوع بحث پر اس طرح غیر جانب داری کے ساتھ غور کرنے ہی سے
اسپی نوزا کے مطالعۂ فطرت کو وہ تفوق حاصل ہوا ہے، جس کی بدولت فروڈ
اس کو فطرت انسانی کا مکمل ترین مطالعہ کہتا ہے، جو تاحال کسی اخلاقی فلسفی نے
کیا ہے۔ جبلّی کی تحلیل کی تعریف کرنے کا ٹین کو اس سے بہتر کوئی اور طریقہ نہیں ملا کہ
اس نے اس کو اسپی نوزا کی تحلیل سے تشبیہ دیدی۔ اور جانیس میولر نے جبلت ۱۹۷
وجذبے کے موضوع پر آکر لکھا ہے "جذبات کے ایک دوسرے سے تعلق کے متعلق
ان کے عضویاتی شرائط سے قطع نظر کرکے اس سے بہتر بیان پیش کرنا ناممکن ہے
جو اسپی نوزا نے لاثانی تبحر کے ساتھ پیش کیا ہے"۔ اور یہ مشہور عضویاتی اسس

انکسار کے ساتھ جو عموماً حقیقی بزرگی کا لازمہ ہوتا ہے، اخلاقیات کی تیسری کتاب کا بالتفصیل اقتباس کرتا ہے۔ کردار انسانی کی اس تحلیل کے ذریعے سے اپنی نوزا آخر کار اس مسئلہ تک آتا ہے سے اس کا شاہکار موسوم ہے۔

۳۔ عقل و اخلاق

دراصل اخلاقیات کے تین نظام ہیں، اور معیاری سیرت اور اخلاقی زندگی کے تین نصب العین ہیں۔ ایک بدھ اور مسیح کا ہے، جو نسوانی فضائل پر زور دیتا ہے، اور سب انسانوں کو یکساں طور پر قیمتی تصور کرتا ہے۔ برائی کا توڑ بھلائی سے کرتا ہے، فضیلت کو محبت کے مطابق کہتا ہے اور سیاسیات میں غیر محدود جمہوریت کی طرف مائل ہے۔ دوسرے ماکیاویلی اور نیٹشے کی اخلاقیات ہے، جو مردانہ فضائل پر زور دیتی ہے۔ یہ انسانوں کی عدم مساوات کو تسلیم کرتی ہے۔ مقابلے کے خطرات اور فتح و حکومت کو پسند کرتی ہے، فضیلت کو قوت کے مرادف کہتی ہے اور موروثی اشرافیہ کو بلند مرتبہ دیتی ہے۔ تیسرے سقراط افلاطون و ارسطو کی اخلاقیات ہے، یہ زنانہ یا مردانہ فضائل کے عام اطلاق سے انکار کرتی ہے۔ اس کے نزدیک صرف ذی علم اور پختہ ذہن مختلف حالات کا لحاظ کر کے فیصلہ کر سکتا کہ کب محبت کو حکومت کرنی چاہیئے اور کب قوت کو۔ اس لیے یہ فضیلت کو عقل کے مطابق قرار دیتی ہے، اور حکومت میں اشرافیہ اور جمہوریہ کے امتزاج کی حامی ہے۔ اسپی نوزا کی اخلاقیات کا امتیاز یہ ہے کہ اس کی اخلاقیات غیر شعوری طور پر ان بظاہر تین مخالف فلسفوں کو ملا کر ایک موزوں وحدت تیار کر دیتی ہے۔ اس کی بدولت وہ ہم کو اخلاق کا ایسا نظام دیتا ہے، جو جدید فکر کا بہت ہی بلند پایہ کارنامہ ہے۔

وہ آغاز اس طرح سے کرتا ہے کہ مسرت کردار کا منتہا ہے، اور مسرت کی تعریف بہت ہی سادہ کرتا ہے کہ یہ لذت کے موجود ہونے اور الم کے موجود نہ ہونے کا نام ہے۔ لیکن لذت و الم مطلق نہیں بلکہ اضافی حدود ہیں وہ لذت سے انسان کی حالت

میں ایک "تغیر ہوتا ہے، کم حالت تکمیل سے زیادہ حالت تکمیل کی جانب" "خوشی انسان کی قوت کے بڑھنے سے ہوتی ہے"[۵] "الم انسان میں بیشتر حالت تکمیل سے کمتر حالت تکمیل کی جانب تغیر ہوتا ہے۔ میں تغیر کہتا ہوں کیونکہ خود لذت تکمیل نہیں ہے۔ اگر ایک شخص اس تکمیل کے ساتھ پیدا ہوتا جس کو وہ حاصل کرتا ہے، تو اس کو جذبۂ لذت نہ ہوتا۔ اور اس کی ضد اس کو اور بھی زیادہ واضح بنا دیتی ہے"۔ تمام خواہشیں تکمیل و قوت کی طرف جانے یا تکمیل قوت کی طرف سے واپس آنے کے راستے ہیں اور تمام جذبے تکمیل و قوت کی طرف یا ان سے دور حرکتیں ہیں۔

"جذبے سے میری مراد جسم کے وہ تغیرات ہیں جن سے جسم کی قوت عمل زیادہ یا کم ہوتی ہے یا ان کی اعانت و مزاحمت ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ان تغیرات کے تصورات بھی"۔ (جذبے کا یہ نظریہ جیمس اور لانگے کے ناموں سے مشہور ہے، مگر ان دونوں نفسیاتیوں میں سے کسی نے بھی اس کو اس صفائی کے ساتھ نہیں بیان کیا اور یہ پروفیسر کینن کے بیان کے حیرت انگیز طور پر مطابق ہے)۔ ایک خواہش یا جذبہ بذات خود اچھا یا برا نہیں ہوتا، بلکہ صرف اس حد تک اچھا یا برا ہوتا ہے، جس حد تک یہ ہماری قوت کو گھٹاتا یا بڑھاتا ہے۔ "فضیلت اور قوت سے بھی میری وہی مراد ہے" فضیلت عمل کرنے کی ایک قوت ہوتی ہے، یعنے قابلیت کی ایک صورت۔ ایک شخص جس قدر اپنی ذات کو محفوظ رکھ سکتا ہے، اور اس کے لیے جو چیز مفید ہوتی ہے اس کو حاصل کرتا ہے، اسی قدر اس کی فضیلت زیادہ ہوتی ہے۔ اسپی نوزا ایک شخص سے خود کو دوسرے کی بھلائی کی خاطر قربان کر دینے کے لیے نہیں کہتا۔ وہ فطرت سے زیادہ نرم دل ہے۔ اس کے نزدیک انانیت بقائے نفس کی برترین جبلت کا لازمی نتیجہ ہے "کوئی شخص کبھی کسی ایسی شے کے حاصل کرنے میں غفلت نہیں کرتا جس کو وہ اچھا سمجھتا ہو، سوائے اس امید پر کہ وہ اس سے بڑی خیر حاصل کر سکے گا" یہ بات اسپی نوزا کو بالکل معقول معلوم ہوتی

۵۔ دیکھو نٹشے، مسرت کیا ہے؟ محض اس امر کا احساس کہ قوت بڑھتی ہے اور مزاحمت رفع ہو گئی ہے (Antichrist) فقرہ ۲

۱۹۹ ہے۔ ”کیونکہ عقل فطرت کے خلاف کسی چیز کا مطالبہ نہیں کرتی، اس لیے یہ اس بات کو قبول کیے لیتی ہے کہ ہر شخص کو اپنی ذات سے محبت کرنی چاہیئے، اور اس شے کو طلب کرنا چاہیئے جو اس کے لیے مفید ہو۔ اور اس شے کی خواہش کرنی چاہیئے جو اس کو صحیح معنے میں بیشتر تکمیل کی حالت کی طرف لے جائے۔ اور یہ کہ ہر شخص کو اپنے وجود کو اس حد تک باقی رکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے جس حد تک اس کی قدرت میں ہو۔ اس طرح سے وہ اپنی اخلاقیات کو یوٹوپی مصلحین کی طرح سے اخوانیت اور انسان کی فطری نیکی پر قائم نہیں کرتا، اور نہ کلبی تنگ خیالوں کی طرح سے خود غرضی اور انسان کی فطری شرارت پر قائم کرتا ہے، بلکہ ایسی شے پر قائم کرتا ہے، جس کو وہ ناگزیر اور جائز انانیت کہتا ہے۔ جو نظام اخلاق انسان کو کمزور بننے کی تعلیم دیتا ہو وہ بالکل بیکار ہے۔ فضیلت کی بنیاد محض یہ کوشش ہے کہ انسان اپنے وجود کو باقی رکھے۔ اور انسان کی مسرت ایسا کرنے کی قوت پر مشتمل ہے۔

نیٹشے کی طرح سے اسپی نوزا کے یہاں عاجزی و انکساری کا کچھ زیادہ مصرف نہیں ہے۔ یہ یا تو سازشی کا فریب ہوتی ہے، یا ایک غلام کی بزدلی۔ اس سے قوت کا فقدان مترشح ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے اسپی نوزا کے نزدیک فضیلت جس صورت میں بھی ہو، وہ قابلیت اور قوت کے مرادف ہوتی ہے۔ اسی طرح سے پشیمانی بھی فضیلت نہیں بلکہ نقص ہے۔ ”جو شخص پشیمان ہوتا ہے وہ دونا رنجیدہ اور دونا کمزور ہوتا ہے“۔ مگر عاجزی اور انکساری کے خلاف زہر اگلنے میں وہ اتنا وقت صرف نہیں کرتا جتنا کہ نیٹشے صرف کرتا ہے کیونکہ ”عاجزی اور انکساری بہت ہی شاذ ہوتی ہے“ اور جیسا کہ سسرو نے لکھا ہے ”کہ وہ فلسفی بھی جو اس کی تعریف میں کتابیں تصنیف کر دیتے ہیں، سرورق پر اپنا نام ضرور لکھ دیتے ہیں۔ اسپی نوزا کہتا ہے کہ جو شخص اپنے آپ سے نفرت کرتا ہے، وہ مغرور آدمی سے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ (یہاں پردہ نفسی محللین کے محبوب نظریے کو ایک جملے کے اندر بیان کر دیتا ہے، کہ ہر شعوری فضیلت ایک مخفی برائی کے چھپانے یا اصلاح کرنے کی شعوری کوشش ہوتی ہے) اسپی نوزا عاجزی کو تو ناپسند کرتا ہے مگر شرم و حیا کی تعریف کرتا ہے، اور

ایسے غرور پر اعتراض کرتا ہے جس کی اعمال و افعال سے تائید نہ ہوتی ہو۔ تکبر لوگوں کو ایک دوسرے کے لیے پریشان کن بنا دیتا ہے۔ "متکبر انسان صرف اپنے کارنامے بیان کرتا ہے، اور دوسروں کی صرف برائی بیان کرتا ہے۔ وہ اپنے سے ادنیٰ درجے کے آدمیوں کی صحبت میں خوش ہوتا ہے، جو اس کے کارنامے اور کمالات سن کر متحیر رہ جائیں اور آخر کار ان لوگوں کا شکار بن جاتا ہے جو اس کی سب سے زیادہ تعریف کرتے ہیں، کیونکہ مغرور سے زیادہ خوشامد کے فریب میں کوئی اور نہیں آتا۔

اس حد تک ہمارے حلیم فلسفی نے کسی حد تک درشت ہی اخلاقیات پیش کی ہے، مگر ایک دوسرے نکتے میں وہ ذرا نرمی سے کام لیتا ہے۔ اس کو یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ لوگ کس قدر رشک و حسد سے ایک دوسرے کے الزام دینے اور ایک دوسرے کی تحقیر میں لگے رہتے ہیں، اور نفرت سے بھی دریغ نہیں کرتے جو لوگوں میں ہیجان پیدا کرتی اور ان کو الگ کر دیتی ہے۔ اور اس کو ہماری ان معاشری خرابیوں کا اس کے علاوہ اور کوئی علاج سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ اور اس قسم کے جذبات بالکل مٹ جائیں۔ اس کے نزدیک یہ ثابت کرنا بالکل سہل ہے کہ نفرت شاید اس وجہ سے کہ یہ محبت کے کنارے پر آ کر رہ جاتی ہے، بجائے جوابی نفرت کے محبت سے زیادہ آسانی کے ساتھ مغلوب کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ نفرت کو تقویت اس سے پہنچتی ہے کہ جواب میں بھی نفرت ہو رہی ہے، برخلاف اس کے جو شخص یہ سمجھتا ہو کہ جس سے وہ نفرت کرتا ہے وہ اس سے نفرت کرتا ہے، وہ نفرت اور محبت کے متصادم جذبات کا شکار ہو گا، کیونکہ (جیسا اسپی نوزا ضرورت سے زیادہ رجائی انداز میں یقین رکھتا ہے) محبت محبت کے پیدا کرنے پر مائل ہوتی ہے اس لیے اس کی نفرت پارہ پارہ ہو جاتی ہے اور اس کے اندر قوت باقی نہیں رہتی۔ نفرت کرنے کے معنے اپنی کمتری اور اپنے خوف کے تسلیم کر لینے کے ہیں۔ ہم ایسے دشمن سے نفرت نہیں کرتے جس کے متعلق ہم کو یقین ہوتا ہے کہ ہم اس کو آسانی کے ساتھ مغلوب کر لیں گے" "جو شخص باہمی نفرت سے نقصانات اور صدموں کا انتقام لینا چاہتا ہو، وہ بدبختی کی زندگی گزارے گا۔ لیکن جو شخص نفرت کو محبت کے ذریعے سے دور کر دینا چاہتا ہو، وہ خوشی اور وثوق کے ساتھ نبرد آزما ہوتا ہے۔ وہ

ایک یا بہت سے آدمیوں کا یکساں مقابلہ کرتا ہے، اور اس کو مشکل سے تقدیر کی امداد کی ضرورت ہوتی ہے۔ "جن لوگوں پر وہ غلبہ پاتا ہے وہ خوشی خوشی اطاعت قبول کرتے ہیں"۔ "قلوب آلات حرب سے مسخر نہیں ہوتے بلکہ روح کی عظمت سے مسخر ہوتے ہیں"۔ اس قسم کی عبارتوں میں اسپی نوزا کو اس روشنی کا کچھ حصہ نظر آجاتا ہے جو گلیل کی پہاڑیوں پر چمکی تھی۔

لیکن اس کی اخلاقیات کی اصل روح عیسائی نہیں بلکہ یونانی ہے "فضیلت کی اولین اور واحد بنیاد سمجھنے کی کوشش ہے"۔ اس سے زیادہ سادہ اور مکمل طور پر سقراطی کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ وہ خارجی اسباب ہم کو طرح طرح سے ادھر اور ادھر پھینک دیتے ہیں، اور ایسی موجوں کے مانند جن کو مخالف ہوائیں ادھر سے ادھر پھینک دیتی ہیں ہم ڈگمگاتے ہیں، اور ہم کو نتیجے اور اپنی قسمت کی
۲۰۱ خبر نہیں ہوتی۔ جس وقت ہم سب سے زیادہ جوش میں ہوتے ہیں اس وقت ہم اپنے آپ کو سب سے زیادہ حاضر دماغ سمجھتے ہیں، حالانکہ اس وقت ہماری حالت سب سے زیادہ انفعالی ہوتی ہے، اس وقت ہم تسویق اور احساس کی کسی آبائی لہر کے ساتھ عاجلانہ ردعمل کی جانب بہ جاتے ہیں جو صورت حال کے صرف ایک حصے کو دیکھتی ہے، کیونکہ غور و فکر کے بغیر صورت حال کے صرف ایک حصے کا ادراک ہو سکتا ہے۔ شدید جذبہ ناقص تصور ہوتا ہے۔ فکر ایک جواب ہے جو اس قدر وقت لیتا ہے جب تک مسئلے کا ہر ضروری زاویہ اپنے متلازم ردعمل پیدا نہیں کر لیتا، اب وہ ردعمل خواہ موروثی ہو یا اکتسابی صرف اس طرح تصور کامل اور جواب مکمل ہو سکتا ہے[1]۔ قوت محرکہ کی حیثیت سے جبلتیں بہت ہی شاندار مرتبہ رکھتی ہیں، مگر رہبر کی حیثیت سے بہت ہی خطرناک ہیں

---

[1] - اگر اس کو مابعد کی اصطلاحات میں بیان کیا جائے تو کہا جائے گا کہ اضطراری عمل ایک مقامی ردعمل ہوتا ہے ایک مقامی ہیج کا۔ جبلی عمل صورت حال کا ایک جزو کے لحاظ سے جزوی ردعمل ہوتا ہے۔ تعقل کل صورت حال کے لحاظ سے پورا ردعمل ہوتا ہے۔

کیونکہ ان میں سے ہر ایک اس چیز کے ذریعے سے جس کو ہم جبلتوں کی انفرادیت کہتے ہیں، خود اپنی تکمیل چاہتی ہے اور کل شخصیت کا لحاظ نہیں کرتی۔ مثلاً بے قابو لالچ لڑاکو پن یا حرص سے انسانوں پر کیا کچھ تباہی نہیں آتی ہے، یہاں تک کہ ایسے آدمی ان جبلتوں کے جنھوں نے ان پر قابو پا لیا تھا محض دم چھلے بن کر رہ گئے۔ "جذبات جو ہم پر روزانہ یورش کرتے ہیں، ان کا تعلق جسم کے کسی ایسے حصے سے ہوتا ہے، جو اور حصوں سے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ اس لیے اصولاً جذبات افراط ہوتے ہیں، اور ذہن کو ایک چیز پر غور کرنے کے لیے روک لیتے ہیں جس کی وجہ سے وہ دوسری چیزوں کا خیال نہیں کرسکتا۔ لیکن وہ خواہش جو ایسی لذت یا ایسے الم سے پیدا ہوتی ہے، جو جسم کے ایک حصے یا بعض حصوں سے تعلق رکھتی ہے، بہ حیثیت مجموعی انسان کے لیے کوئی فائدہ نہیں رکھتی۔ اپنے آپ میں آنے کے لیے ہمیں اپنی تکمیل کرنی چاہیے۔"

اس میں شک نہیں کہ یہ سب کچھ عقل اور جذبے کے مابین قدیم فلسفیانہ امتیاز ہے۔ لیکن اسپی نوزا سقراط اور رواقیہ پر نہایت اہم اضافہ کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جس طرح سے جذبہ بغیر عقل کے کور ہوتا ہے اسی طرح سے عقل بغیر جذبے کے مردہ ہوتی ہے۔ "ایک جذبے میں نہ تو رکاوٹ واقع اور نہ یہ رفع ہوسکتا مگر مخالف جذبے سے۔" بے فائدہ عقل کو جذبے کے مقابل میں لانے کے بجائے (جو ایسا معرکہ ہے جس میں زیادہ گہرے اور قدیم عنصر کی عام طور پر فتح ہوتی ہے) وہ بے عقل جذبات کا ایسے جذبات سے مقابلہ کرتا ہے جن کی عقل مددگار ہوتی ہے اور صورت حال کے مکمل تناظر سے مقابلہ کرتی ہے۔ فکر میں خواہش کی حرارت کی کمی نہ ہونی چاہیے اور نہ خواہش کو فکر کے نور سے محروم ہونا چاہیے۔ "ایک جذبے کا جیسے ہی ہم واضح وجلی تصور قائم کرلیتے ہیں تو وہ جذبہ باقی نہیں رہتا، اور ذہن پر جذبات اتنے مستولی رہتے ہیں، جتنے کہ وہ کامل تصور رکھتا ہے۔ تمام اشتہائیں جس حد تک کہ وہ ناقص تصورات سے پیدا ہوتی ہیں محض جذبے ہیں۔ اور جب وہ کامل تصورات سے پیدا ہوتی ہیں، تو فضائل ہیں۔[1] عاقلانہ عمل جو کامل صورت حال کے مطابق ہوتا ۲۰۳

[1]۔ گذشتہ دو اقتباسات اور نفسی تحلیلی نظریے کہ خواہشیں اسی وقت تک گمراہیں ہیں جب تک ہم ان خواہشوں کی

ہے یا فضیلت عمل ہوتا ہے، اور آخر میں عقل کے علاوہ اور کوئی فضیلت نہیں رہتی۔
اسپی نوزا کی اخلاقیات اس کی مابعد الطبیعیات سے پیدا ہوتی ہے۔ جس طرح مابعد الطبیعیات میں عقل اشیا کے پریشان تحول میں قانون کے ادراک پر مشتمل ہے، اسی طرح یہاں یہ خواہشوں کے پریشان تحول میں قانون کے قائم کرنے پر مشتمل ہے وہاں پر یہ دیکھنے اور پتا چلانے پر مشتمل تھی، اور یہاں یہ عمل کرنے پر مشتمل ہے۔ مگر یہ ادراک اور تعقل ابد کے لحاظ سے ہونا چاہیئے یعنی ادراک اور عمل کل کے ابدی تناظر کے لحاظ سے ہو۔ فکر اس نسبتہً بڑے نظریے تک ہماری امداد کرتا ہے کیونکہ تمثل اس کی امداد پر ہوتا ہے، جو شعور کے سامنے موجودہ عمل کے ان بعید نتائج کو لاتا ہے جو اگر وہ عمل بلا خیال کیے اور فوری ہوتا تو اس پر کوئی اثر نہیں کر سکتے تھے۔ عاقلانہ عمل کے لئے سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ موجودہ حسیں ان اطلالی یادداشتوں کے مقابلے میں جن کو ہم تمثل کہتے ہیں، بہت زیادہ واضح ہوتی ہیں جس حد تک ذہن ایک شے کا عقل کے مطالبات کے لحاظ سے تعقل کرتا ہے، خواہ تصور حال کا ہو یا ماضی یا مستقبل کا یہ یکساں متاثر ہوگا۔ تمثل اور عقل کے ذریعے سے ہم تجربے کو بصیرت کے اندر بدل دیتے ہیں، ماضی کے غلام رہنے کے بجائے ہم اپنے مستقبل کے خالق بن جاتے ہیں۔
اس طرح سے ہم وہ اختیار حاصل کرتے ہیں، جس کا حصول انسان کے لیے ممکن ہے۔ جذبے کی انفعالیت انسانی قید ہے۔ عقل کا عمل انسانی آزادی ہے۔ آزادی علی قانون یا عمل سے نہیں ہوتی بلکہ جزئی جذبے یا تسویق سے ہوتی ہے۔
اور یہ آزادی مطلق جذبے سے نہیں بلکہ غیر مربوط اور غیر مکمل جذبے سے ہوتی ہے۔ ۲۰۳
ہم آزاد و با اختیار صرف اس جگہ ہوتے ہیں جہاں ہم جانتے ہیں۔[1] فوق الانسان

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ علت سے واقف نہیں ہوتے، جو مشابہت ہے وہ غور کرنے کے قابل ہے، اسی لیے بحث کا پہلا عنصر یہ کوشش ہے کہ خواہش اور اس کے اسباب کو واضح شعور میں لایا جائے اور خواہش کا اور اس کے اسباب کا صحیح تصور قائم کیا جائے۔

[1] مقابلہ کرو پروفیسر ڈیوی کے بیان سے "ایک طبیب یا انجینیر اپنے فکر و عمل میں اس حد تک آزاد ہوتا ہے جس حد تک جس کام کو وہ کرتا ہے اس سے واقف ہوتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ہم کو یہاں ہر قسم کی آزادی اور اختیار کی کنجی مل گئی ہو۔ فطرت انسانی و کردار مطبوعہ نیویارک سنہ ۱۹۲۲ء صہ ۳۰۳

بننے کے لیے معاشری عدالت اور خوش خلقی کی پابندیوں سے نہیں بلکہ جبلت کی انفرادیت سے آزاد ہونے کی ضرورت ہے۔ اس تکمیل و سلامت روی سے دانا کو استقلال مزاج حاصل ہوتا ہے۔ جو ارسطاطالیس کے بطل کا اشرافی اطمینان نفس نہیں ہے، اور نہ نیٹشے کے نصب العین کی متکبرانہ فوقیت ہے، بلکہ ذہن کی نسبتہً ہموار اور اطمینانی حالت ہے۔ بڑے ہونے کے معنے یہ نہیں ہیں کہ کوئی شخص انسانیت سے بالاتر ہو جائے، بنی نوع انسان پر حکومت کرنے لگے؛ بلکہ بڑے ہونے کے معنے یہ ہیں کہ انسان جاہل خواہشوں کی جانب داریوں اور بیہودگیوں سے آزاد ہو کر اپنی ذات پر حکومت کرے۔

یہ اس کے مقابلے میں شریف تر آزادی ہے، جس کو انسان اختیار کیے ہیں کیونکہ ارادہ صاحب اختیار نہیں ہے اور شاید "ارادہ" ہی کوئی اپنا وجود نہیں رکھتا۔ مگر کسی شخص کو یہ نہ فرض کر لینا چاہیے کہ چونکہ وہ آزاد و با اختیار نہیں ہے اس لیے وہ اخلاقی اعتبار سے اپنے عمل اور اپنی زندگی کی ساخت کا ذمہ دار بھی نہیں ہے۔ چونکہ انسانوں کے افعال کا تعین ان کی یادداشتوں سے ہوتا ہے، ٹھیک اسی لیے معاشرے کو اپنی حفاظت کی خاطر اپنے شہریوں میں ان کی امیدوں اور اندیشوں کے ذریعے کسی نہ کسی حد تک ایک معاشری نظام اور اتحاد عمل قائم کرنا چاہیے۔ ہر قسم کی تعلیم جبریت کو فرض کرتی ہے، اور نوجوان کے کھلے ہوئے ذہن کے اندر ممنوعات کے ایک ذخیرے کو ڈالتی ہے جن سے اس امر کی توقع ہوتی ہے کہ یہ کردار کے متعین کرنے میں مفید ہوں گی۔" پس برے کاموں سے جو برائی پیدا ہوتی ہے اس سے اس بنا پر کم نہ ڈرنا چاہیے کہ یہ تو مجبوری کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ہمارے افعال خود مختارانہ ہوں یا نہ ہوں، ہمارے محرکات پھر بھی امید و خوف ہی ہوتے ہیں۔ لہذا یہ دعویٰ غلط ہے کہ میں نصائح اور احکام کے لیے کوئی گنجائش نہیں چھوڑنا چاہتا۔" اس کے برعکس جبریت تو بہتر اخلاقی زندگی کے لیے معین ہوتی ہے۔ یہ ہم کو سکھاتی ہے کہ ہم دوسروں سے نفرت نہ کریں اور
کسی کا مضحکہ نہ کریں اور نہ کسی سے ناراض ہوں۔ انسان مجرم نہیں ہوتے۔ اور اگرچہ ۲۰۴
ہم بدکرداروں کو سزا دیتے ہیں، مگر اس سزا میں نفرت شامل نہیں ہوتی۔ ہم ان کو

معاف کر دیتے ہیں کیونکہ وہ جو کچھ کرتے ہیں اس سے واقف نہیں ہوتے۔
سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ جبریت ہم کو تقدیر کے دونوں رخوں کی یکساں طور پر امید کرنے اور برداشت کرنے کے لیے تیار کر دیتی ہے۔ ہم کو یاد ہوتا ہے کہ تمام چیزیں خدا کے ابدی فیصلوں کے مطابق وقوع میں آتی ہیں۔ شاید ہم کو یہ خدا کی عقلی محبت بھی سکھا دے، جس کی وجہ سے ہم قوانین فطرت کو بخوشی قبول کر لیں، اور اس کی حدود میں اپنی تکمیل کو پالیں۔ جو شخص تمام چیزوں کو متعین دیکھتا ہے وہ شکایت نہیں کر سکتا۔ اگرچہ وہ مزاحمت کر سکتا ہے۔ کیونکہ وہ اشیا کو ابد کی ایک خاص نوع کے تحت دیکھتا ہے۔ اور وہ سمجھتا ہے کہ اس کے سوائے اتفاقات مکمل نقشے میں اتفاقات نہیں ہیں اور یہ کہ عالم کے ابدی تسلسل اور ساخت کے اندر ان کے لیے کوئی نہ کوئی سبب ہے۔ ایسی ذہنی کیفیت پیدا کر کے وہ جذبات کی عارضی لذتوں سے بلند ہو کر تدبر و تعمق کے بلند سکون تک پہنچ جاتا ہے، جس کو تمام چیزیں ایک ابدی نظام اور ابدی ارتقا کا جزو معلوم ہوتی ہیں۔ وہ ناگزیر حادثے پر مسکرانا سیکھ جاتا ہے اور اس کی توقعات اب پوری ہوں یا ہزار سال بعد ہوں مگر ہر حالت میں وہ مطمئن رہتا ہے۔ وہ پرانا سبق سیکھ لیتا ہے کہ خدا کی ذات متلون نہیں ہے جو اپنے بندوں کے نجی معاملات میں مصروف و منہمک رہتی ہو بلکہ کائنات کا غیر متغیر اور تھامنے والا نظام ہے۔ اسی تصور کو فلاطون اپنی جمہوریہ میں خوبصورتی کے ساتھ بیان کرتا ہے" وہ ذات جس کا ذہن حقیقی وجود پر جما ہوا ہوتا ہے اس کو اتنا وقت نہیں ہوتا کہ لوگوں کے چھوٹے چھوٹے معاملات پر غور کرے یا ان کے خلاف جد و جہد کرتے وقت حسد اور عناد سے پر ہو جائے۔ اس کی آنکھ ہمیشہ مقرر اور اٹل اصولوں کی طرف رہتی ہے جن کو نہ تو دوسروں کو ایذا پہنچاتا ہوا دیکھتا ہے اور نہ ایذا پہنچتے ہوئے، بلکہ سب کے سب ایک نظام اندر عقل کے مطابق حرکت کرتے رہتے ہیں۔ ان کی وہ نقل کرتا ہے اور جہاں تک اس سے ہو سکتا ہے اپنے کو ان کے مطابق بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ نیٹشے کہتا ہے کہ ناگزیر اور اٹل چیز سے میں کبھی آزردہ نہیں ہوتا۔ تقدیر کی محبت میری فطرت کا اصل مغز ہے۔ یا جیسا کہ کیٹز کہتا ہے کہ ۲۰۵

سب سے اونچے درجے کی بادشاہت یہ ہے کہ انسان تمام عریاں حقائق کو سکون کے ساتھ برداشت کرے اور ہر قسم کے اتفاق سے سینہ سپر ہو[1]"

اس قسم کا فلسفہ ہمیں زندگی اور موت دونوں کو لبیک کہنے کی تعلیم دیتا ہے۔ "ایک آزاد انسان موت کے علاوہ اور کسی شے کا خیال نہیں کرتا اور اس کی حکمت موت پر نہیں بلکہ زندگی پر غور و فکر ہوتی ہے"[2] یہ اپنے بڑے تناظر سے ہمارے پریشان و آشفتہ انا کو سکون دیتی ہے۔ یہ ہم کو ان حدود پر راضی کر دیتی ہے جن کے اندر ہمارے مقاصد کو حاصل ہونا چاہئے۔ ممکن ہے یہ صبر یا اہل مشرق کی تن آسان انفعالیت کی طرف لے جائے مگر یہ تمام حکمت اور تمام قوت کی ناگزیر بنیاد بھی ہے۔

۴۔ مذہب اور بقائے روح

بہر حال اسپی نوزا کا فلسفہ ایسی دنیا سے بھی محبت کرنے کی کوشش تھی جس میں وہ خارج از ملت اور تنہا تھا۔ اور پھر ایوب کی طرح سے وہ اپنی قوم کا نمونہ تھا اور پوچھتا تھا کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ منصف اور راستباز انسان بھی برگزیدہ قوم کی طرح سے ایذا رسانی جلاوطنی اور ہر قسم کی خانماں بربادی کا شکار ہو۔ کچھ عرصے کے لیے عالم کے اس تعقل نے اس کو تسکین و اطمینان بخش دیا کہ یہ غیر شخصی اور غیر متغیر قانون کا عمل ہے۔ لیکن آخر میں اس کی روح نے جو دراصل مذہبی تھی اس خاموش عمل کو ایسی شے میں بدل دیا جو تقریباً محبت کرنے کے قابل تھی۔ اس نے اپنی خواہشوں کو کائنات کے عام نظام میں ضم کر دینے اور اس کے تقریباً ناقابل امتیاز حصہ بن جانے کی کوشش کی۔ "سب سے بڑی خیر اس اتحاد کا علم ہے جو ذہن اور کل کائنات کے مابین ہوتا ہے"[3] فی الحقیقت ہماری انفرادی علٰحدگی ایک معنی میں گمراہ کن ہے۔ ہم

---

[1] (Hyperian) ۲۰۳۔

[2] اخلاقیات IV ۶۷۔

[3] De Emendatione صفحہ ۲۳۰۔

قانون اور علت کے بڑے چشمے کے اجزا ہیں، ہم خدا کے اجزا ہیں۔ ہم ایسی ذات کی بسرعت گزرنے والی اشکال ہیں، جو ہم سے بڑی اور لاتمناہی ہے۔ حالانکہ ہم فانی ہیں۔ ہمارے اجسام نسل کے جسم میں خلا یا ہیں، ہماری نسل تمثیل حیات میں ایک اتفاقی واقعہ ہے، ہمارے اذہان ایک ابدی روشنی کے عارضی لمعات ہیں۔ ہمارا جسم جس حد تک کہ سمجھتا ہے، ایک ابدی طرزِ فکر ہے، جس کا تعین ایک دوسرے طرز فکر سے ہوتا ہے، اور اس کا تعین ایک اور طرز فکر سے ہوتا ہے۔ اور اسی طرح سے یہ سلسلہ لاتمناہی رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ۲۰۶
یہ سب مل کر ایک ہی وقت میں خدا کی ابدی اور لاتمناہی عقل بناتے ہیں۔ فرد کے کل کے ساتھ وحدت الوجودی انضمام کے اندر پھر مشرق بول رہا ہے۔ ہم عمر خیام کی صدائے بازگشت سنتے ہیں، جس نے ایک کو کبھی "دو" نہیں کہا" اور قدیم ہندی نظم کی، اپنی ذات اور کل کو ایک ہی روح جان اور اس خیال کو دل سے دور کر دے کہ جزو کل سے علیحدہ ہوتا ہے۔ تھورو نے کہا ہے کہ "بعض اوقات جب میں والڈن کے تالاب میں چپ چاپ پڑا تیرتا ہوں تو میں رہنا ختم کر دیتا ہوں اور ہونا شروع کرتا ہوں۔
ایسے کل کے اجزا ہونے کی حیثیت سے ہم لافانی ہوتے ہیں۔ ذہن انسانی جسم انسانی کے ساتھ کامل طور پر معدوم نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کا کوئی نہ کوئی حصہ ایسا ضرور ہے جو ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ یہ وہ حصہ ہے جو اس کا ابد کی صورت میں تصور کرتا ہے۔ اشیا کا جس قدر ہم اس صورت میں تعقل کرتے ہیں، اتنا ہی زیادہ ہمارا فکر ابدی ہوتا جاتا ہے۔ اس مقام پر اسپی نوزا کا مطلب سمجھنا معمول سے بھی زیادہ دشوار ہے اور مختلف شارحین کی لاتمناہی بحث و تمحیص کے بعد بھی مختلف لوگ اس کے مختلف معنے لیتے ہیں۔ کبھی کوئی شخص یہ خیال کرتا ہے کہ اس کی مراد جارج ایلیٹ کی طرح سے شہرت کے ذریعے سے بقائے دوام ہے جس کی بِنا پر ہمارے فکر میں جو چیز سب سے زیادہ عقلی اور حسین ہے، وہ ہمارے بعد بھی باقی رہجاتی ہے، اور تقریباً ہمیشہ کے لیے زمانے پر اپنا اثر رکھتی ہے۔ پھر بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسپی نوزا کے ذہن میں شخصی اور انفرادی بقائے دوام ہے۔ اس کی وجہ ممکن ہے کہ یہ ہو کہ جیسے جیسے موت کی بھیانک صورت قبل از وقت اس کے راستے میں مبہم مگر ڈرانے والے انداز میں ظاہر ہوتی گئی، وہ اپنے آپ کو اس امید سے

تشفی دینے لگا جو ہمیشہ انسانی سینے کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ تاہم وہ نہایت ہی اصرار کے ساتھ ابد اور دوام کے اندر امتیاز کرتا ہے۔ "اگر ہم لوگوں کی عام رائے کی طرف متوجہ ہوں تو ہم کو احساس ہوگا کہ ان کو اپنے اذہان کی ابدیت کا شعور ہوتا ہے مگر وہ ابد اور مدت کے مابین گڈمڈ کرتے ہیں، اور اس کو تمثل یا حافظے سے منسوب کرتے ہیں، جس کی نسبت ان کا خیال ہوتا ہے کہ یہ موت کے بعد باقی رہے گا"۔ مگر ارسطو کی طرح سے اگرچہ اسپی نوزا لافنائیت کا ذکر کرتا ہے مگر شخصی یاد کی بقا کا منکر ہے۔ ذہن کسی شے کا سوائے اس حالت کے جب یہ جسم کے ساتھ ہوتا ہے نہ تو تمثل کر سکتا ہے اور نہ اس کو یاد رکھ سکتا ہے"۔ وہ جزا کا بھی قائل نہیں ہے۔ جو لوگ یہ توقع کرتے ہیں کہ خدا ان کو ان کی نیکی اور فضیلت کے عوض گویا کہ یہ سب سے بڑی چاکری ہو، بڑے بڑے انعامات دے گا، وہ نیکی اور فضیلت کے صحیح انداز ے سے بہت دور ہیں۔ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ نیکی اور خدا کی عبادت بجائے خود مسرت اور سب سے بڑی آزادی نہیں ہیں۔ اسپی نوزا کی کتاب کا آخری مسئلہ یہ ہے کہ نجات نیکی کی جزا نہیں بلکہ خود نیکی ہے"۔ اور شاید اسی طرح سے لافنائیت واضح فکر کی جزا نہیں بلکہ خود واضح فکر ہے، کیونکہ یہ ماضی کو حال میں لاتا ہے، اور پھر مستقبل تک پہنچ جاتا ہے اور اس طرح سے زمانہ کی حدود و زندگی پر غالب آجاتا ہے، اور اس تناظر کو پکڑ لیتا ہے جو تغیر کی گوناگونی میں ہمیشہ پس پردہ رہتا ہے۔ اس قسم کا فکر لافانی ہوتا ہے۔ کیونکہ ہر حقیقت ایک مستقل تخلیق ہوتی ہے، یعنے انسان کے ابدی اکتساب کا جزو جو اس کو لامتناہی طور پر متاثر کرتی ہے۔ ۲۰۷

اس سنجیدہ اور امید افزا اسر کے ساتھ اخلاقیات ختم ہو جاتی ہے۔ ایک کتاب میں فکر کی اتنی مقدار بہت کم محفوظ ہوتی ہے، اور ایک کتاب کی بہت کم اتنی بہت سی شرحیں لکھی گئی ہوں گی، اور یہ مخالف تعبیرات و ترجمانیوں کی ہنوز ایک خون ریز رزمگاہ ہے۔ اس کی مابعد الطبیعیات غلط اس کی نفسیات ناقص اور اس کی دینیات غیر تشفی بخش اور مبہم ہو سکتی ہے۔ مگر جس شخص نے بھی اس کتاب کو پڑھا ہے وہ اصلی روح کتاب کا ادب ہی سے تذکرہ کرے گا۔ کتاب کے خاتمے پر وہ روح ان الفاظ میں چمک اٹھتی ہے۔

"ذہن انسانی کو جذبات پر جو اقتدار حاصل ہے، اس کے متعلق یا ذہن کی آزادی و اختیار کے متعلق مجھے جس قدر ثابت کرنا تھا اس کو پایۂ تکمیل کو پہنچا چکا۔ اس سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہو جائے گی کہ ایک صاحب حکمت جاہل کے مقابلے میں کس قدر پیش پیش، اور قوی ہوتا ہے، کیونکہ جاہل کی رہبر صرف ہوا وہوس ہوتے ہیں۔ ایک جاہل شخص علاوہ اس کے کہ اس کو خارجی اسباب مختلف طریقوں سے پریشان رکھتے ہیں، ذہن کی حقیقی تشفی سے کبھی بہرہ مند نہیں ہوتا۔ وہ تقریباً اپنے آپ خدا اور اشیا سے بے خبر رہتا ہے، اور جیسے ہی اسکی انفعالی حالت ختم ہو جاتی ہے، اس کے ہوش و حواس بھی زائل ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس صاحب حکمت شخص کی روح مشکل سے متاثر ہوتی ہے، اسے اپنا خدا اور اشیا کا ایک خاص ابدی لزوم کے ساتھ شعور ہوتا ہے۔ اس کے ہوش و حواس کبھی زائل نہیں ہوتے، اور وہ ہمیشہ ذہنی اطمینان سے بہرہ مند ہوتا ہے۔ اس کی طرف جانے کے لیے میں نے جس راستے کو دکھایا ہے اگرچہ وہ دشوار گزار ہے، مگر دریافت ہو سکتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ بہت دشوار ضرور ہونا چاہیئے، کیونکہ یہ بہت کم ملتا ہے۔ کیونکہ اگر نجات قریب اور سہل الحصول ہوتی تو یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ تقریباً سب اس کے اختیار کرنے میں غفلت برتتے لیکن تمام عمدہ اور اعلیٰ درجے کی چیزیں اتنی ہی دشوار ہوتی ہیں جتنی کہ بیش قیمت ہوتی ہیں۔ ۲۰۸

۵۔ سیاسی رسالہ

اب ہماری تحلیل کے لیے وہ افسوسناک دھڑ رہ جاتا ہے یعنے (Tractatus Politicus) جو اسپی نوزا کی سب سے زیادہ پختہ عمری کا کارنامہ ہے، اور جو اس کی اچانک موت کی وجہ سے ناتمام رہ گیا۔ یہ ایک مختصر چیز ہے۔ مگر اس کے باوجود فکر سے پُر۔ اسی لیے اس امر کا نہایت ہی تکلیف دہ احساس ہوتا ہے کہ دنیا کا اس شریف زندگی کے ٹھیک ایسے موقع پر ختم ہو جانے سے کس قدر نقصان ہوا ہے، جب کہ یہ پختہ ہو کر اپنی پوری قوتوں پر آ رہی تھی۔ اسی پشت میں جس نے

ہابس کو مطلق العنان بادشاہت کی تعریف کرتے اور انگریزی قوم کی اپنے بادشاہ سے بغاوت کی مذمت کرتے اور ملٹن کو اسی شدت کے ساتھ بغاوت کی حمایت کرتے دیکھا تھا، اسپی نوزا نے جو ڈی وٹ کے جمہوری خاندان کا دوست تھا، ایک نیا سیاسی فلسفہ ترتیب دیا جس میں اس زمانے کے ہالینڈ کی احراری و جمہوریتی امیدوں کو ظاہر کیا گیا تھا، اور جو اس چشمۂ فکر اس بڑے دھارے کا منبع بنا جس کی انتہا روسو اور انقلاب فرانس پر ہوئی۔

اسپی نوزا کے خیال کے بموجب تمام سیاسی فلسفہ فطری اور اخلاقی نظام کے امتیاز سے پیدا ہونا چاہئے یعنے مرتب معاشروں کے وجود میں آنے سے پہلے اور بعد کے زمانے کے فرق سے۔ اسپی نوزا فرض کرتا ہے کہ ایک زمانے میں لوگ نسبتہً الگ تھلگ بغیر قانون اور معاشری نظام کے رہتے تھے۔ وہ کہتا ہے کہ اس زمانے میں، صواب و خطا، عدل و ظلم کے تصورات نہ تھے۔ اس وقت قوت اور حق ایک ہی چیز تھے۔

فطری حالت میں متفقہ طور پر کوئی شے اچھی یا بری نہیں کہلا سکتی۔ کیونکہ ہر شخص جو فطری حالت میں ہوتا ہے، صرف اپنے فائدے کا خیال کرتا ہے اور اپنے خیال کے مطابق اور صرف اپنے مفاد کے لحاظ سے بھلے اور برے کا تعین کرتا ہے۔ اور اپنے علاوہ اور کسی کے سامنے کسی قانون سے جواب دہ نہیں ہوتا۔ یہ صرف مدنی حالت میں ہوتا ہے کہ عام اتفاق سے اچھے اور برے کا تعین کیا جاتا ہے، ۲۰۹
اور ہر شخص مملکت کے سامنے خود کو ذمہ دار پاتا ہے[۱]...... قانون فطرت جس کے تحت سب انسان پیدا ہوتے اور زیادہ تر رہتے ہیں، کسی شے کی ممانعت نہیں کرتا سوائے اس کے جس کو کوئی شخص نہیں چاہتا یا نہیں کر سکتا، اور جنگ نفرت غصہ فریب اور کسی ایسی شے کے خلاف نہیں ہوتا، جس کو اشتہا سجھاتی ہے[۲]۔

ہمیں فطرت کے اس قانون یا فطرت کی اس بے آئینی کا مملکتوں کے طرز عمل کے مشاہدہ کرنے سے پتا لگ سکتا ہے۔ اقوام کے مابین

۱۔ اخلاقیات حصۂ چہارم، ۳۷ حاشیہ نمبر ۲۔
۲۔ رسالۂ سیاسیات باب ۲۔

کوئی اخوانیت[1] نہیں ہے۔ کیونکہ قانون و اخلاق تو صرف وہاں ہو سکتے ہیں جہاں مسلمہ نظام ہو، اور ایک عام مسلمہ اقتدار ہو۔ اب مملکتوں کے حقوق کی وہ حالت ہے جو پہلے افراد کے حقوق کی تھی (اور بسا اوقات اب بھی ہے) یعنی وہ زبردستیاں ہیں اور بڑی مملکتیں اہل سیاست کی کسی بھولی ہوئی دیانت کی بدولت (Great Powers) (دول عظمیٰ) کہلاتی ہیں۔ یہی حال انواع کے مابین ہے۔ چونکہ کوئی مشترک نظام نہیں ہے اس لیے ہر نوع دوسری نوع کے ساتھ جو کر سکتی ہے اور کرنا چاہتی ہے کرتی ہے[2]۔

مگر انسانوں میں چونکہ باہمی ضروریات سے باہمی امداد عالم وجود میں آتی ہے قوتوں کا یہ فطری نظام حقوق کے اخلاقی نظام میں بدل جاتا ہے۔ "چونکہ خوف تنہائی تمام انسانوں میں پایا جاتا ہے اور چونکہ تنہائی میں کوئی شخص اس قدر قوی نہیں ہوتا کہ خود کی حفاظت اور ضروریات زندگی مہیا کر سکے، اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان فطرۃً معاشری نظام[3] کی جانب مائل ہے، خطرے کا مقابلہ کرنے اور اس سے بچاؤ کی تدبیر کرنے کے لیے ایک شخص کی قوت مشکل سے کافی ہو گی، اور اگر انسان باہمی امداد اور تبادلے کا انتظام نہ کر سکتے تو ان کا خطرے سے محفوظ رہنا مشکل تھا"[4] لیکن انسان فطرۃً معاشری نظام کے لئے باہمی تحمل سے مسلح نہیں ہیں۔ مگر خطرے سے اجتماع و ارتباط پیدا ہوتا ہے، جو رفتہ رفتہ معاشری جبلتوں کو قوی کرتا ہے۔ انسان شہریت کے لیے پیدا نہیں ہوئے ہیں بلکہ ان کو اس کے لیے موزوں بنانا پڑے گا[5]۔

۲۱۰ اکثر اشخاص دل میں قانون یا رواج کے خلاف انفرادیتی باغی ہوتے ہیں۔ معاشری جبلتیں پس ماندہ اور کمزور ہوتی ہیں اور ان کو تقویت پہنچانے

---

[1] ۔ بسمارک۔

[2] ۔ اخلاقیات ۴، صفحہ ۳ حاشیہ ۱ اور ضمیمہ نمبر ۲۷۔

[3] ۔ رسالۂ سیاسیات باب ۶۔

[4] ۔ اخلاقیات ۴، ضمیمہ ۲۸۔

[5] ۔ رسالۂ سیاسیات باب ۵۔

کی ضرورت ہوتی ہے۔" انسان فطرۃً اچھا نہیں ہے" جیسا کہ روسو بعد کو اس قدر تباہ کن نتائج کے ساتھ فرض کرنے والا تھا۔ لیکن ارتباط کے ذریعے سے اگرچہ وہ محض ایک خاندان ہی کے مابین ہو' ہمدردی، مجنسوں کا احساس اور آخر کار مہربانی پیدا ہوتی ہے۔ ہم اس شے کو پسند کرتے ہیں جو ہمارے مانند ہوتی ہے۔" ہم نہ صرف اس شے پر ترس کھاتے ہیں جس سے ہم محبت کر چکے ہیں، بلکہ اس شے کو بھی جس کو ہم اپنے مشابہ سمجھتے ہیں"[۵۰]۔ اس سے جذبات کی تقلید[۵۱]" اور آخر کار کسی حد تک ضمیر پیدا ہوتے ہیں۔ تاہم ضمیر خلقی نہیں بلکہ اکتسابی شے ہے' اور یہ ماحول کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے[۵۲]۔ یہ نوخیز فرد کے ذہن میں گروہ کی اخلاقی روایات کا ذخیرہ ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے سے معاشرہ اپنے لیے دشمن کے دل (یعنے بالطبع انفرادیتی روح) میں ایک حلیف پیدا کر لیتا ہے۔

اس ارتقا میں رفتہ رفتہ یہ ہوتا ہے کہ انفرادی قوت کا قانون جو حالت فطرت میں عامل و کار فرما رہتا ہے' منظم معاشرے میں کل کی قانونی اور اخلاقی قوت کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔ طاقت اس وقت بھی حق رہتی ہے۔ لیکن کل کی قوت فرد کی قوت کو محدود کر دیتی ہے) نظری طور پر اس کے حقوق کی حد تک محدود کر دیتی ہے) یعنے اس کی قوتوں کے ایسے استعمال کی حد تک جو دوسروں کی مساوی آزادی کے معارض نہ ہو۔ فرد کی فطری طاقت یا فرمانروائی کا کچھ حصہ باقی قوتوں کے وسیع ہونے کے معاوضے میں منظم جماعت کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً ہم غصے میں تشدد کی حد تک بڑھنے کے حق کو چھوڑ دیتے ہیں' اور اس کے معاوضے میں اپنے اوپر دوسرے کے غصے سے اسی طرح تشدد تک متجاوز ہو جانے کے اندیشے سے بری ہو جاتے ہیں۔ قانون ضروری ہے' کیونکہ لوگ جذبات کے بندے ہوتے ہیں۔ اگر سب لوگ معقولیت پسند ہوتے تو قانون غیر ضروری ہوتا۔

[۵۰] ۔ اخلاقیات باب ۳ حاشیہ ۳۲۔

[۵۱] ۔ اخلاقیات باب ۳ حاشیہ ۲۷۔

[۵۲] ۔ ۳۔ ضمیمہ ۲۷۔

مکمل قانون کو افراد سے وہی نسبت ہو گی جو مکمل عقل کو جذبات سے ہو گی۔ تباہی سے بچنا اور کل کی قوت کو بڑھانا مخالف قوتوں کی ترتیب سے ممکن ہو سکتا ہے۔ جس طرح سے مابعد الطبیعیات میں عقل اشیا میں تنظیم کے ادراک کا نام ہے اخلاقیات میں خواہشوں کے مابین باقاعدگی کے قائم کرنے کا نام ہے اسی طرح سے سیاسیات میں یہ انسانوں میں انتظام کے قائم کرنے کا نام ہے۔ کامل مملکت اپنے شہریوں کی قوتوں کو اسی حد تک محدود کرے گی جس حد تک یہ ان کے لئے تباہ کن ہوں۔ یہ کوئی آزادی ۲۱۱
سلب نہ کرے گی سوائے اس کے کہ اس سے بڑی آزادی ان کو بخش دے۔

مملکت کی آخری غایت یہ نہیں ہے کہ لوگوں پر غلبہ کرے یا ان کو خوف کے ذریعے سے دبائے، بلکہ اس کی آخری غایت یہ ہے کہ ہر شخص کو اس طرح سے خوف سے نجات دلائے کہ وہ اپنے آپ کو یا اپنے پڑوسی کو نقصان پہنچائے بغیر پورے اطمینان سے عمل کر سکے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ مملکت کی غایت یہ نہیں کہ ذی عقل نفوس کو وحشی درندوں یا مشینوں میں بدل دے، بلکہ اس کی غایت یہ ہے کہ ان کے جسم اور ان کے ذہن سلامتی کے ساتھ عمل کرنے لگیں۔ اس کی غایت یہ ہے کہ یہ لوگوں کو آزاد عقل کے مطابق زندگی بسر کرنے اور آزاد عقل سے کام لینے کی طرف رہبری کرے تاکہ وہ اپنی قوت کو نفرت غصے اور مکاری میں ضائع نہ کریں اور نہ ایک دوسرے سے غیر منصفانہ برتاؤ کریں۔ اس طرح سے مملکت کی غایت درحقیقت آزادی ہے[۱]۔

آزادی مملکت کا مقصد ہے کیونکہ مملکت کا مقصد یہ ہے کہ نشو و نما میں معین ہو، اور نشو و نما کا انحصار آزادی پانے کی استعداد پر ہے۔ لیکن اگر قوانین نشو و نما اور آزادی کو سلب کریں؟ ایک شخص کو اس حالت میں کیا کرنا چاہئے جب مملکت ایسے ہر عضویے یا تنظیم کی طرح سے جو اپنے وجود کو باقی رکھنا چاہتا ہے (جس کے معمولاً یہ معنے ہوتے ہیں کہ عہدہ دار اپنے کو عہدوں پر برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں) تسلط بیجا اور استحصال کا آلہ بن جائے ایسی نوزا جواب

---

[۱]۔ رسالۂ سیاست باب ۲۰۔

دیتا ہے کہ اگر معقول احتجاج اور بحث و تحیص کی اجازت ہو اور تقریر کو پر امن تغیر کے حاصل کرنے کے لیے آزاد رہنے دیا گیا ہو تو غیر منصفانہ قانون کی بھی پابندی کرو۔" مجھے اس امر کا اعتراف ہے کہ اس قسم کی آزادی سے بعض اوقات دشواریاں بھی پیدا ہو سکتی ہیں۔ مگر اتنی دانائی کے ساتھ کبھی کسی مسئلے کا تصفیہ نہیں ہوا کہ اس میں ناجائز استعمال کا موقع باقی نہ رہے[۵۱]۔ "آزادی تقریر کے خلاف جو قوانین ہوتے ہیں وہ ہر قسم کے قانون کے لیے تباہ کن ہوتے ہیں، کیونکہ لوگ ایسے قوانین کا کچھ زیادہ عرصے تک احترام نہ کریں گے جن پر وہ نکتہ چینی نہ کر سکتے ہوں۔

ایک حکومت جس قدر آزادی تقریر کو کم کرتی ہے اتنی ہی شدت کے ساتھ اس کی مزاحمت کی جاتی ہے، اور اس کی مزاحمت لالچی لوگ نہیں کرتے، بلکہ ایسے لوگ کرتے ہیں جن کو اچھی تعلیم عمدہ اخلاق اور نیکی نے زیادہ آزاد بنا دیا ہے۔ لوگوں کی افتاد طبع بالعموم کچھ اس قسم کی ہے کہ وہ کسی چیز پر اس قدر نعل در آتش نہیں ہوتے جتنا کہ اس پر کہ وہ خیالات و آرا جن کو وہ صحیح سمجھتے ہیں ان کو جرائم ۲۱۲
اور خلاف قانون قرار دے دیا جائے۔ ایسے حالات میں وہ قانون سے نفرت کو باعث ذلت نہیں بلکہ موجب عزت سمجھتے ہیں اور حکومت کی مخالفت میں کسی عمل سے بھی دریغ نہیں کرتے[۵۲]...... ایسے قوانین جن کی خلاف ورزی کسی ہمسائے کو نقصان پہنچائے بغیر ہو سکتی ہے، صرف محل مضحکہ ہوتے ہیں۔ اس قسم کے قوانین بجائے اس کے کہ نوع انسان کی حرص ہوا کو دبائیں ان کو اور تیز کرتے ہیں۔ "ہم ممانعتوں کی ہمیشہ مزاحمت کرتے ہیں اور جس چیز سے ہم کو باز رکھا جاتا ہے اس کے حریص ہوتے ہیں۔"

آخر میں اسپی نوزا ایک اچھے امریکی دستوری کی طرح سے کہتا ہے، "اگر فوجداری مقدمات کی بنیاد صرف افعال کو قرار دیا جائے اور الفاظ کو نظر انداز کر دیا جائے تو بغاوت کے لئے جواز کے شائبہ تک باقی نہ رہے گا۔"

۵۱۔ رسالۂ سیاست باب ۲۰۔

۵۲۔ ایضاً

مملکت ذہن کے اوپر جتنا بھی کم اقتدار رکھے اتنا ہی شہری اور مملکت کے لیے بہتر ہے۔ اسپی نوزا اگرچہ ضرورت ملکی کو تسلیم کرتا ہے، مگر اس کو شبہے کی نظر سے دیکھتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ قوت خراب نہ ہونے والے کو بھی خراب کر دیتی ہے۔ اور وہ اس کے اقتدار کو اجسام و اعمال سے گزر کر لوگوں کی ارواح و خیالات تک بڑھ جانے کو بہت ہی ناگواری سے دیکھتا ہے۔ اس کے نزدیک اس کے معنی نشوونما کے ختم ہو جانے اور جماعت کے مر جانے کے ہونگے۔ اسی لیے وہ تعلیم خصوصاً جامعاتی تعلیم کے حکومت کے زیر اقتدار ہونے کو ناپسند کرتا ہے۔ جو ادارے سرکاری مصارف سے قائم ہوتے ہیں ان کی غرض اس قدر انسان کی فطری قابلیتوں کا نشوونما نہیں ہوتا جتنا کہ ان کو دبانا ہوتا ہے۔ لیکن ایک آزاد جمہوریت میں اگر ہر اس شخص کو جو اپنے صرف اور اپنی ذمہ داری پر عام طور پر تعلیم دینے کی اجازت طلب کرے، اجازت دیدی جایا کرے تو اس سے علوم فنون کی بہتر ترویج ہوگی۔ مگر حکومتی جامعات اور غیر سرکاری سرمائے سے چلنے والی جامعات کے مابین درمیانی صورت کس طرح سے نکالی جائے۔ یہ ایسا مسئلہ ہے جس کو اسپی نوزا حل نہیں کرتا۔ اس کے زمانے میں غیر سرکاری دولت اس حد تک نہ بڑھی تھی کہ یہ دشواری اسپی نوزا کے ذہن میں آتی۔ بظاہر اس کا نصب العین وہ اعلیٰ تعلیم تھی جیسی ایک زمانے میں یونان میں رائج تھی جس کو ادارے نہیں بلکہ افراد دیتے تھے۔ مثلاً سوفسطائیہ جو شہر بہ شہر سفر کرتے تھے اور سرکاری یا غیر سرکاری دونوں اثروں سے آزاد ہو کر تعلیم دیتے تھے۔ ٢١٣

ان چیزوں سے یہ پتا چلتا تھا کہ حکومت کی جو بھی صورت ہوا کرے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا، اور اسپی نوزا جمہوریت کو خفیف سی ترجیح دیتا ہے۔ مروجہ سیاسی صورتوں میں سے کسی ایک صورت کو اس طرح سے ڈھالا جا سکتا ہے، کہ ہر آدمی انفرادی نفع پر اجتماعی حق کو ترجیح دے۔ یہ کام مقنن کا ہے۔ شخصی بادشاہت موثر ہوتی ہے مگر ظالمانہ اور فوجی ہوتی ہے۔

یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تجربہ یہ سکھاتا ہے کہ ایک شخص کے ہاتھ میں کل اقتدار دیدینے سے امن اور اتفاق حاصل ہوتا ہے، کیونکہ کوئی سلطنت بغیر کسی نمایاں

تغیر کے اتنی مدت تک قائم نہیں رہی جتنی کہ ترکوں کی۔ اس کے برعکس اتنی کم پائدار بھی کوئی سلطنت نہیں ہوتی جتنی کہ عمومی یا جمہوری اور نہ اس سے زیادہ کہیں بغاوتیں ہوتی ہیں۔ باوجود اس کے اگر غلامی بربریت اور بربادی کو اس کے نام سے موسوم کیا جانے لگے تو انسانوں کے لیے اس سے زیادہ کوئی بدقسمتی کی بات نہیں ہو سکتی۔ اس میں شک نہیں کہ والدین اور اولاد کے مابین اس سے زیادہ شدید جھگڑے ہوتے ہیں جتنے کہ غلاموں اور آقاؤں کے مابین ہوتے ہیں۔ لیکن انتظام خانہ داری کے فن میں حق پدری کو حق ملکیت میں بدلنے اور اولاد کو صرف غلام شمار کرنے سے کوئی ترقی نہیں ہوتی۔ پس کل اقتدار کو ایک شخص کے ہاتھ میں دیدینے سے امن میں نہیں بلکہ غلامی میں ترقی ہوتی ہے۔

اس کے بعد وہ مخفی تدبر پر چند جملے کہتا ہے۔

جن لوگوں کو مطلق العنان قوت کی آرزو ہوتی ہے وہ یہی گائے جاتے ہیں کہ مملکت کی غرض اس بات کی طالب ہے کہ اس کے معاملات اخفاء میں طے پایا کریں ...... مگر جس قدر ایسے دلائل خود کو عام عافیت کے پردے میں چھپاتے ہیں اتنی ہی ظالمانہ وہ غلامی ہوتی ہے جس کی طرف یہ لے جاتے ہیں۔ صحیح مشوروں کا دشمنوں کو علم ہو جانا اس سے بہتر ہے کہ ظالموں کے راز ہائے بد شہریوں سے مخفی رہیں۔ جو لوگ ایک قوم کے معاملات کو مخفی رکھتے ہیں وہ اس کو مطلق اپنی طاقت اور اپنے اقتدار کے ماتحت رکھتے ہیں، اور جس طرح سے وہ جنگ کے زمانے میں دشمن کے خلاف سازش کرتے ہیں امن کے زمانے میں اسی طرح سے شہریوں کے خلاف سازش کرتے ہیں۔

جمہوریت حکومت کی سب سے زیادہ معقول صورت ہے۔ کیونکہ اس میں ہر شخص اپنے افعال کو قوت مقتدرہ کے قابو میں دیتا ہے۔ مگر اپنے فیصلے اور اپنی عقل کو نہیں۔ "چونکہ سب یکساں خیال نہیں کر سکتے" اس لیے کثرت کی آواز قانون کا اثر رکھتی ہے۔" اس جمہوریت کی فوجی بنیاد عام فوجی خدمت ہونی چاہیئے، اور شہریوں کو امن کے زمانے میں اپنے اسلحہ اپنے پاس رکھنے چاہئیں اس کی مالی بنیاد ایک محصول[۱] ہونا چاہیئے۔ جمہوریت میں خرابی یہ ہے کہ اس میں ادنے درجے کے

[۱]۔ کھیت اور کل زمین، اور اگر ممکن ہو تو مکانات بھی سرکاری ملک ہونی چاہیے جن کو سالانہ لگان پر

آدمیوں کو بر سر اقتدار کرنے کا رجحان ہوتا ہے اور اس سے بچنے کی اس کے علاوہ کوئی اور صورت نہیں ہے کہ سرکاری خدمات کو صرف "تربیت یافتہ اشخاص" کے لیے محدود کر دیا جائے۔ کثرت تعداد بجائے خود حکمت پیدا نہیں کر سکتی اور ممکن ہے کہ بد ترین خوشامدیوں کو خدمات کے لیے انتخاب کرے۔ عوام کا تلون ان لوگوں کو جو اس کا تجربہ رکھتے ہیں تقریباً مایوسی کی حد تک پہنچا دیتا ہے، کیونکہ یہ جذبات کے تابع ہوتے ہیں نہ کہ عقل کے۔ اس طرح سے جمہوری حکومت مختلف جماعتوں کے قائدوں کے چند روزہ اقتدار کا جلوس بن جاتی ہے اور قابل لوگ ایسی خدمات کو قبول نہیں کرتے جن کے سلسلے میں ان سے ادنٰے درجے کے لوگ ان کو جانچیں، اور ان کے کام کے متعلق فیصلہ کریں۔ جلد یا بدیر زیادہ لائق لوگ اس قسم کے نظام کے خلاف بغاوت کرتے ہیں، اگرچہ ان کی تعداد کم ہو، "اسی لیے میرا خیال ہے کہ جمہوریتیں اشرافیوں میں بدل جاتی ہیں اور اشرافیہ حکومتیں آخر کار بادشاہتوں میں بدل جاتی ہیں۔ لوگ آخر کار ابتری پر استبداد کو ترجیح دینے لگتے ہیں۔ قوت کی مساوات ایک غیر پائدار حالت ہے۔ انسان فطرۃً غیر مساوی
۲۱۵ ہوتے ہیں۔ اور "جو شخص غیر مساوی چیزوں میں مساوات کی تلاش کرتا ہے وہ وہ طلب محال کرتا ہے"۔ جمہوریت کو ہنوز یہ مسئلہ حل کرنا باقی ہے کہ کس طرح سے لوگوں کی بہترین توانائیوں سے کام لیا جائے اور اس کے ساتھ ہی سب کو یکساں طور پر ان تربیت یافتہ اور موزوں لوگوں میں سے جن کی حکومت کو وہ پسند کریں انتخاب کا حق دیا جائے۔

کون جانتا ہے کہ ایسی نوزا کی ذہانت نے جدید سیاسیات کے اس بنیادی مسئلے پر کیسی روشنی ڈالی ہوتی، اگر اس کی عمر نے دفا کی ہوتی اور وہ اپنی اس تصنیف کو پایۂ تکمیل کو پہنچا سکتا۔ اس کتاب کا جو کچھ جزو ہمارے پاس اس وقت ہے وہ بھی اس کے فکر کا نامکمل ابتدائی مسودہ ہے، جمہوریت کا باب لکھ ہی رہا تھا کہ

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ:۔ شہریوں کو کرایہ رو یہ یا جایا کرے اور اس استثنا کے ساتھ ان کو زمانۂ امن میں ہر قسم کے محصول سے آزاد ہونا چاہیے۔ رسالۂ سیاسیہ باب ۶۔

اس کا انتقال ہو گیا۔

۶۔ اسپی نوزا کا اثر

اسپی نوزا نے کسی مذہب کی بنیاد رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ لیکن اس کے بعد کے تمام فلسفے میں اس کا فکر نفوذ کئے ہوئے ہے۔ اس کے انتقال کے بعد جو پشت گذری، اس میں تو اس کے نام سے نفرت کی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ ہیوم نے بھی اس کے قابل "نفرت مفروضے" کا تذکرہ کیا ہے۔ لیسنگ نے کہا ہے کہ لوگ اسپی نوزا کا اس طرح سے ذکر کرتے تھے جیسے کہ وہ ایک مرا ہوا کتا ہو۔

لیسنگ وہ شخص ہے جس نے اس کو پھر مشہور کیا۔ اس بڑے نقاد نے ۱۷۸۰ء میں ایک گفتگو کے دوران میں جاکوبی کو یہ کہہ کر حیرت میں ڈال دیا کہ جب سے میں پختگی کو پہنچا ہوں میں اسپی نوزا کا پیرو ہوں اور اسپی نوزا کے فلسفے کے علاوہ اور کوئی فلسفہ ہے ہی نہیں"۔ اس کی محبت اسپی نوزا نے اس دوستی کو قوی کر دیا تھا جو اس کو موسز مینڈل لزن سے تھی۔ اور اپنے مشہور تمثیل ناتھان ڈر وائز ہے میں اس نے معیاری یہودی کے اس تعقل کو جو اس کو زندہ تاجر اور مردہ فلسفی سے ملا تھا، ایک سانچے میں ڈھال دیا۔ چند سال بعد ہرڈر کی کتاب (Einige Gesprache uber Spinoza's System) نے آزاد خیال اہل مذہب کی توجہ کو اخلاقیات کی طرف مبذول کرایا۔ شلائر ماخر جو اس جماعت کا سرگروہ تھا اس نے اسپی نوزا کو "مقدس مرتد" لکھا اور کیتھولک نوالیس نے اس کو "مخمور خدا انسان" کے نام سے موسوم کیا۔

اس اثنا میں جاکوبی نے گوئٹے کو اسپی نوزا کی طرف توجہ دلائی۔ یہ مشہور شاعر قائل ہو گیا۔ اخلاقیات کے پہلے ہی بار پڑھنے کے بعد وہ ہم سے کہتا ہے ٹھیک اسی فلسفے کے لیے میری گہرائی میں جانے والی روح آرزو کر رہی تھی۔ ۲۱۶

اس کے بعد سے یہ اس کی نظم ونثر میں ساری ہے۔ اس نے ہمیں سے dass Wir entsagen Sollen (فطرت نے جو حدود ہم پر عائد کر دی ہیں ان کو ہمیں قبول کرنا چاہیئے) کے سبق کو پایا۔ اور ایک حد تک اسپی نوزا کی پرسکون ہوا میں سانس لینے کی بدولت وہ گوئٹے اور ورتھر کی وحشیانہ رومانیت سے نکل کر اپنی بعد کی زندگی کے ادبی انداز تک بلند ہو سکا۔

اسپی نوزا کو کانٹ کی علمیات سے ملانے کی بدولت ہی فشٹے شیلنگ ہیگل اپنی اپنی وحدت الوجود تک پہنچ سکے ہیں۔ فشٹے کا (Ich) انا، شوپنہائر کا ارادۂ زندگی اور نیٹشے کا ارادۂ قوت اور برگسان کا جوش حیات، Conatus sese preservandi (خود کو باقی رکھنے کی کوشش) سے عالم وجود میں آتے ہیں۔ ہیگل کو یہ اعتراض تھا کہ اسپی نوزا کا فلسفہ بہت بے جان اور ٹھوس ہے۔ وہ اس کے اس حرکی عنصر کو بھول رہا تھا، اور اس کے صرف قانون کی حیثیت سے وہ پرشکوہ تعقل خدا پیش نظر تھا جس پر اس نے اپنی عقل مطلق کے لیے قبضہ جما لیا تھا۔ لیکن جب اس نے یہ کہا کہ "فلسفی بننے کے لیے پہلے اسپی نوزائی بننا ضروری ہے" تو اس نے کافی دیانتداری سے کہا تھا۔

انگلستان میں اسپی نوزا کا اثر انقلابی تحریک کے ساتھ بڑھا اور کولرج اور ورڈسورتھ جیسے نوجوان باغیوں نے اسپی نوزا کا اسی جوش وخروش سے ذکر کیا جو دائی نیراڈ کے پرسکون زمانے میں روسی اہل علم کی گفتگو میں پایا جاتا تھا۔ کولرج نے اپنے مہمانوں کو اسپی نوزا کی گفتگوئے دسترخوان سے سیر کیا اور ورڈسورتھ نے فلسفی کے فکر کا کچھ پرتو "کسی شئے" کے متعلق اپنے مشہور اشعار میں پیش کیا۔

کوئی شئے
جس کا گھر غروب ہونے والے سورج کی روشنی۔
محیط سمندر، زندہ ہوا،
نیلا آسمان اور انسان کا دل ہے۔
ایک حرکت اور ایک روح جو تمام
ذی فکر اشیا، ہر قسم کے فکر کے تمام معروضات کو حرکت دیتی ہے۔

۲۱۷ اور سب چیزوں میں ساری ہے۔
شیلی نے رسالۂ مذہب و مملکت کا اپنے کوین میب کے اصل حاشیے میں اقتباس کیا ہے اور اس نے اس کا ترجمہ شروع کیا تھا جس کے لیے بائرن نے تمہید لکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس دیباچے کا ایک ٹکڑا اسی۔ ایس مڈلٹن کو ملا جس نے اس کو خود شیلے کی تصنیف سمجھا، اور اس کو طالب علمی کے زمانے کی خیال آرائی کہا...... اور کہا کہ یہ اس قدر بتدیانہ ہے کہ اس کو کلیتہً شائع نہیں کیا جا سکتا۔ بعد کو اور نسبتہً پرسکون زمانے میں جارج ایلیٹ نے اخلاقیات کا ترجمہ کیا، اگرچہ یہ ترجمہ چھپوایا نہیں۔ اور یہ شبہہ ہو سکتا ہے کہ اسپنسر کا ناقابل علم کا تعقل کچھ نہ کچھ اسپی نوزا کا رہین منت ہے، کیونکہ اس کی جارج ایلیٹ سے بہت تخصیص تھی۔ بیلفورٹ بیکس کہتا ہے کہ "موجودہ زمانے میں بھی ایسے فاضلوں کی کمی نہیں ہے، جو وثوق کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ اسپی نوزا میں جدید حکمت بدرجۂ اتم موجود ہے۔"

اسپی نوزا سے اتنے بہت لوگوں کے متاثر ہونے کی وجہ شاید یہ ہے کہ اس کی اتنی بہت سی تعبیرات ہو سکتی ہیں، اور اس کے ہر بار پڑھنے سے نئی نئی باتوں کا انکشاف ہوتا ہے۔ تمام عالمانہ تقریریں مختلف ذہنوں کے لیے متعدد پہلو رکھتی ہیں۔ اسپی نوزا کے متعلق بھی وہی کہا جا سکتا ہے جو ایتھنز کے ارکان مجلس نے حکمت کے متعلق کہا تھا: "پہلے آدمی نے اس کو پوری طرح سے نہیں جانا، اور آخری آدمی بھی اس کو کامل طور پر نہ جان سکے گا۔ کیونکہ اس کے خیالات سمندر سے زیادہ وسیع اور اس سے زیادہ گہرے ہیں۔"

اسپی نوزا کی موت کے دوسری صد سالہ تقریب کے موقع پر ہیگ میں اس کا مجسمہ قائم کرنے کے لیے چندے کا اعلان کیا گیا۔ علمی دنیا کے ہر کونے سے چندے آئے۔ کوئی یادگار کبھی محبت کے ایسے چبوترے پر قائم نہ ہوئی تھی۔ مجسمے کے بے نقاب کرنے کی تقریب پر ارنسٹ رینان نے اپنے خطبے کو جن الفاظ پر ختم کیا تھا وہ اس لائق ہیں کہ ہم اپنے اس باب کو انھیں پر ختم کر دیں، "برا ہو اس شخص کا جو گزرتے ہوئے اس شریف اور سنجیدہ سر کی ہتک کرے۔ اس کی یہ بد ذاتی ہی اس کی سزا ہوگی، اور وہ یہ نہ سمجھ سکیگا کہ ذات الٰہی کیا ہے۔"

یہ شخص اپنے سنگ خارا کے چبوترے پر سے سب انسانوں کو سعادت کا وہ راستہ بتائے گا جس کو اس نے پایا تھا، اور قرنہا قرن کے بعد مہذب مسافر جب اس مقام پر سے گزرے گا تو اپنے دل میں کہے گا، خدا کا صحیح ترین تصور جو کبھی ہوا ہے وہ شاید یہاں سے آیا تھا" [1]

---

[1] اخلاقیات (Everyman ed.) مقدمہ صفحہ ۲ حاشیہ ۲۰

باب ۵

218

والٹیر اور فرانسیسی روشن خیالی

۱۔ پیرس

سنہ ۱۷۴۲ء میں والٹیر میڈموزل ڈمسنل کو اپنی ایک تمثیل کی نقل میں خطرناک بلندیوں تک پرواز کرنے کی مشق کرا رہا تھا۔ اس نے شکایت کی کہ ایسے جذبے کی اس حد تک نقل کرنے کے لیے جیسا کہ وہ چاہتا ہے، اسے اپنے اندر ایک شیطان پیدا کرنا پڑے گا۔ یہی تو بات ہے والٹیر نے جواب دیا فنون میں سے کسی فن کے اندر کامیاب ہونے کے لیے تمھیں اپنے اندر اسی شیطان کو پیدا کرنا چاہیئے۔ اس کے نقاد اور اس کے دشمن تک اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس کے اندر یہ بات پوری طرح سے پائی جاتی تھی۔ سینٹ بیوے نے کہا ہے (Il avait le diable au corps) (وہ اپنے جسم کے اندر شیطان رکھتا تھا) اور دی مائسٹر (De Maistre) نے کہا ہے کہ والٹیر وہ شخص ہے جس کے ہاتھ میں جہنم نے اپنی تمام قوتیں دیدی ہیں۔ والٹیر غیر دلچسپ بدشکل مغرور بیہودہ بے شرم بے اصول اور بددیانت تک بھی تھا۔ مگر یہ خرابیاں اس کے ماحول کی تھیں۔ مگر ماحول کی جتنی خرابیاں بھی تھیں ان میں سے مشکل ہی سے کوئی خرابی ایسی ہو گی جو اس میں موجود نہ ہو۔

لیکن اس کے باوجود یہی والٹیر مہربانی میں ان تھک، بامروت، اپنی توانائی اور اپنی دولت کے صرف کرنے میں فیاض، اور دوستوں کی مدد کرنے میں اتنا ہی سرگرم تھا جتنا کہ دشمنوں کے برباد کرنے میں وہ اپنی جنبش قلم سے برباد کر سکتا تھا، مگر مصالحت کی اولین سلسلہ جنبانی پر ایسا ہو جاتا تھا جیسے بہتا ہو۔ انسان کس قدر مجموعہ اضداد ہے۔

مگر یہ تمام اوصاف اچھے ہوں یا برے ثانوی تھے اور والٹیر کی اصل روح نہ تھے۔ اس کے اندر حیرت انگیز اور بنیادی شے اس کے ذہن کی بے پایاں زرخیزی اور جلا تھی۔ اس کی تصانیف ننانوے جلدوں پر مشتمل ہیں جس کا ہر صفحہ دلچسپ اور مفید
ہے۔ اگرچہ یہ دنیا کے ہر موضوع پر مخزن العلوم کی طرح پھیلی ہوئی ہیں۔ "میرا پیشہ ۲۱۹
یہ ہے کہ جو کچھ میں خیال کرتا ہوں اسی کو کہہ ڈالوں" اور جو کچھ وہ خیال کرتا تھا وہ ہمیشہ کہنے کے قابل ہوتا تھا، اور اس کو وہ ہمیشہ بے مثال خوبی سے کہتا تھا۔ اب اگر ہم اس کو نہیں پڑھتے (اگرچہ اناطول فرانس جیسے آدمی اس کے صفحات کے مطالعے سے دقیقہ سنج اور حکیم بن گئے ہیں) تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جو مذہبی لڑائیاں وہ لڑا تھا، ان سے ہم کو اب گہری دلچسپی باقی نہیں۔ ہم شاید دوسرے جنگی میدانوں کی طرف چلے گئے ہیں، اور ہم کو آیندہ زندگی کے جغرافیے کی نسبت اس زندگی کی معاشیات سے زیادہ دلچسپی ہے۔ والٹیر کو مذہبیت و توہم پر جو کامل فتح ہوئی تھی خود اس نے ان مسائل کو مردہ کر دیا ہے جن کو اس نے زندہ پایا تھا۔ اس کی شہرت کا ایک بڑا سبب اس کی بے مثال تقریر تھی۔ مگر تحریر باقی رہ جاتی ہے، اور زبانی کہے ہوئے الفاظ پرواز کر جاتے ہیں، اس لئے والٹیر کے پردار الفاظ بھی باقی کے ساتھ اڑ گئے۔ اب جو کچھ ہمارے پاس باقی رہ گیا ہے اس میں والٹیر کا گوشت تو بہت زیادہ ہے مگر اس کی روح کی خداداد آگ کا حصہ بہت کم ہے۔ اس کے باوجود اگرچہ ہم اس کو زمانے کے شیشے میں سے دھندلی طور پر دیکھتے ہیں، اس کی روح کیسی روح ہے! — محض ذہانت جو غصے کو مذاق اور آگ کو روشنی میں بدل دیتی ہے۔ وہ ہوا اور شعلے سے بنا ہوا معلوم ہوتا ہے اس سے زیادہ ہیجان پذیر آدمی شاید کبھی نہ گزرا ہو۔ وہ دوسرے آدمیوں کے مقابلے میں زیادہ اثیری اور تڑپنے والے سالمات کا بنا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ایسا کوئی اور مصنف نہیں ہے،

جس کی ذہنی مشینری زیادہ نازک ہو اور نہ کوئی ایسا ہے جس کا ذہنی توازن زیادہ بدلنے والا اور زیادہ صحیح ہو۔ شاید وہ تاریخ میں سب سے زیادہ ذہنی توانائی والا شخص ہے۔

اس میں تو شک ہی نہیں ہے کہ اس نے اپنے زمانے کے لوگوں سے زیادہ محنت کی، اور ان سے زیادہ کام انجام دیا۔ وہ کہتا ہے کہ بیکاری اور موت برابر ہیں۔ سب لوگ اچھے ہیں سوائے ان کے جو کاہل ہیں۔" اس کا منشی کہتا ہے کہ وہ صرف اپنے زمانے کا بخیل تھا۔ "اس دنیا میں زندگی قابل برداشت بنانے کے لیے انسان کو جہاں تک ممکن ہو اپنی ذات کو مصروف رکھنا چاہیے۔۔۔۔۔ جتنی میری عمر بڑھتی جاتی ہے اتنا ہی میں کام کو ضروری پاتا جاتا ہوں۔ آخر کار یہ سب سے بڑی لذت بن جاتا ہے اور زندگی کے دھوکوں کی جگہ لے لیتا ہے۔ اگر تم ۲۲۰
خودکشی کرنا نہیں چاہتے ہمیشہ کچھ نہ کچھ کام کرو۔

خودکشی ضرور اس کو اپنی جانب ہمیشہ مائل کرتی رہی ہوگی۔ کیونکہ وہ ہمیشہ مصروف رہتا تھا۔ "اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کو اس امر کا پکا یقین تھا کہ کل عصر اس کی زندگی سے پر ہے"۔ ایک سب سے بڑی صدی کا ہم عصر ہونے کے باوجود (۱۶۹۴-۱۷۷۸) وہ اس کی روح اور جوہر تھا۔ وکٹر ہیوگو کہتا ہے کہ والٹیر کا نام لے دینا پوری اٹھارھویں صدی کی خصوصیت بیان کر دینے کے مرادف ہے۔ اٹلی میں نشاۃ جدید ہوئی جرمنی میں اصلاح مگر فرانس میں والٹیر پیدا ہوا۔ وہ اپنے ملک کے لیے نشاۃ جدید اور اصلاح دونوں تھا اور آدھا انقلاب تھا۔ اس نے مانٹانیے (Montaigne) کی جراثیم کش ارتیابیت اور بیلے کی بیہودہ ظرافت کو جاری رکھا۔ وہ توہم اور خرابی سے لوتھر ارسمس کیلون ناکس اور رمیلا نکتھن سے کے مقابلے میں زیادہ شدت اور زیادہ موثر طور پر لڑا۔ اس نے اس بارود کے بنانے میں مدد دی جس سے مرابو مارا ڈانتن اور رابسپیر نے قدیم حکومت کو اڑایا۔ لامارٹین نے کہا ہے کہ اگر ہم لوگوں کے متعلق اس لحاظ سے حکم لگائیں کہ انھوں نے کیا کیا ہے تو والٹیر جدید یورپ کا سب سے بڑا مصنف ہے۔۔۔۔۔۔ تقدیر نے اس کو تراسی سال کی زندگی اس لیے عطا کی کہ وہ عصر کہنہ کو آہستہ آہستہ ختم کر سکے۔ زمانے سے مقابلہ کرنے کے لیے

اس کے پاس وقت تھا۔ اور جب وہ مرا ہے تو فاتح تھا۔
کسی مصنف کا اپنی زندگی میں اتنا اثر نہیں ہوا ہے۔ باوجود جلاوطنی اور قید کے باوجود اس کے کلیسا اور مملکت نے اس کی تقریباً ہر کتاب کی ممانعت کر دی تھی، اس نے اس شدت کے ساتھ اپنی حقیقت کے لیے راستہ بنایا کہ آخرکار بادشاہ اور پوپ اس کی مدارات کرنے لگے اور تخت اس کے سامنے لرزنے لگے اور آدھی دنیا اس کے ہر ہر لفظ کو سننے لگی۔ یہ ایسا زمانہ تھا، جس میں بہت چیزیں ایک
۲۲۱ تباہ کرنے والے کی طالب تھیں۔ نٹشے نے کہا ہے کہ ہنسنے والے شیروں کی ضرورت ہے، اچھا تو والٹیر آیا اور اس نے ہنس ہنس کر برباد کر ڈالا" وہ اور روسو ایک بڑے معاشی اور سیاسی عمل تغیر کی دو آوازیں تھے جو زمینداری اشرافیہ سے درمیانی طبقے کی حکومت کی طرف ہو رہا تھا۔ جب ایک ترقی کرنے والا طبقہ موجودہ قانون یا رواج سے تکلیف محسوس کرتا ہے تو یہ رواج سے عقل کی جانب اور قانون سے فطرت کی جانب رجوع کرتا ہے۔ ٹھیک اس طرح سے جس طرح کہ فرد کی متضاد خواہشیں فکر کے اندر چمک اٹھتی ہیں۔ پس دولت مند متوسط طبقے نے والٹیر کی عقلیت اور روسو کی فطریت کی تائید کی۔ انقلاب عظیم سے پہلے قدیم عادات و ساتیر کو کمزور کرنا، احساس و فکر کو تقویت پہنچانا اور ذہن کو اختبار و فکر کے لئے آمادہ کرنا ضروری تھا۔ یہ نہیں کہ والٹیر اور روسو انقلاب کے سبب تھے، بلکہ شاید یہ انقلاب کی طرح سے ان قوتوں کے نتائج تھے جو فرانس کی سیاسی اور معاشری زندگی کی تہ میں زور کر رہی تھیں۔ یہ جوالا مکھی کی گرمی اور آگ کی روشنی اور چمک تھے۔ فلسفہ تاریخ سے وہی نسبت رکھتا ہے جو عقل خواہش سے رکھتی ہے۔ دونوں صورتوں میں ایک غیر شعوری عمل نیچے سے اوپر کے شعوری فکر کو متعین کرتا ہے۔
مگر ہمیں فلسفی کے فلسفے کے اثر کے متعلق رجحان مبالغہ کی اصلاح کرنے میں ضرورت سے زیادہ پیچھے کی طرف نہیں مڑ جانا چاہیے۔ لوئی شانز دہم نے جب اپنے ٹیمپل کے قید خانے میں والٹیر اور روسو کی تصانیف دیکھیں تو اس نے کہا کہ ان آدمیوں نے فرانس کو برباد کیا ہے" اور اس سے اس کی مراد اپنے خاندان سے تھی۔ نپولین نے کہا ہے کہ

خاندان بوربون نے اگر تصانیف پر قابو رکھا ہوتا، تو ممکن تھا کہ وہ باقی رہ جاتا"۔ توپ کی ایجاد نے نظام زمینداری کو توڑ ڈالا، روشنائی جدید معاشری تنظیم کو توڑ ڈالے گی۔ والٹیر کہتا ہے کہ "کتابیں دنیا پر حکومت کرتی ہیں یا کم از کم ان قوموں پر جو تحریری زبان رکھتی ہیں۔ اور دوسروں کا شمار ہی نہیں ہے۔ تعلیم سے زیادہ کوئی شے آزاد نہیں بناتی۔ قوم سوچنے لگتی اور اس کو سوچنے سے باز رکھنا ناممکن ہوتا ہے۔ لیکن فرانس نے والٹیر سے سوچنا شروع کیا۔

والٹیر یعنی فرانسوا میری اُروے پیرس میں ۱۶۹۴ء میں پیدا ہوا۔ وہ ایک اچھے خاصے کامیاب دستاویز نویس باپ اور اشرافی ماں کا بیٹا تھا۔ شاید اس کو ہوشیاری اور تیز مزاجی باپ سے اور مسخراپن اور ظرافت ماں سے ورثے میں ملی تھی۔ وہ دنیا میں یوں کہو کہ بس مشکل ہی سے آیا تھا۔ اس کی ماں اس کی ولادت کے بعد زندہ نہ رہی، اور وہ اس قدر کمزور و نحیف تھا، کہ دایہ نے یہ کہدیا تھا کہ یہ ایک دن سے زیادہ نہ جیے گا۔ اس کے اندازے میں ذراسی غلطی ہوئی تھی، کیونکہ وہ تقریباً چوراسی سال جیا۔ مگر تمام عمر اس کے کمزور جسم نے اس کی غیر مغلوب روح کو بیماری سے تکلیف میں رکھا۔ ۲۲۳

اخلاقی اور مذہبی ارتفاع کے لیے وہ ایک بڑا بھائی رکھتا تھا جو نیکی کا نمونہ تھا۔ اس نیک لڑکے کا نام آرمان تھا جس کو جانسینی بدعت سے عشق ہوگیا۔ اور اپنے مذہب کی خاطر شہادت سے ہم آغوش ہوگیا۔ ارمان کو اس کے دوست نے عقل سے کام لینے کی نصیحت کی، تو اس نے جواب دیا "اگر تم خود دار پر چڑھنا نہیں چاہتے تو کم از کم دوسروں کو تو اس سے منع نہ کرو"۔ ان کا باپ کہا کرتا تھا کہ "دو احمق میرے بیٹے ہیں ایک نظم کا خبطی ہے اور دوسرا نثر کا"۔ اس واقعے نے کہ فرانسوا نے تقریباً جب سے اس نے اپنا نام لکھنا سیکھا تھا، اس وقت سے شعر کہنے لگا تھا، اس کے باپ کو جو بہت عملی تھا، یہ یقین دلادیا کہ یہ لڑکا نکما ہی رہے گا۔ لیکن نینان ڈل اینکلو مشہور بازاری عورت نے جو اس شہر میں رہتی تھی جس میں آروے کا خاندان فرانسوا کی پیدائش کے بعد لوٹ آیا تھا، اس نوجوان میں بڑائی کی علامتیں پائیں اور جب وہ مرنے لگی تو اس نے دو ہزار فرانک اس کے لیے کتابوں کی

خریداری کے واسطے چھوڑے۔ اس کی ابتدائی تعلیم ان سے ہوئی، اور ایک عیاش پادری (جیروم کوئنیار) نے تعلیم دی، جو اس کو نماز کے ساتھ ساتھ ارتیابیت کی بھی تعلیم دیتا تھا۔ اس کے بعد کے معلمین یعنے جیسوئٹس نے اس کو جدلیت (یعنے کسی چیز کے ثابت کرنے کا فن جس کے معنے آخر کار کسی چیز پر یقین نہ کرنے کی عادت کے ہوتے ہیں) تعلیم دے کر اس کے ہاتھ میں ارتیابیت کا آلہ بھی دیدیا۔ فرانسوا استدلال میں ماہر ہوگیا۔ جب اور لڑکے میدان میں کھیلتے تھے، وہ بارہ برس کے سن میں فاضلوں سے دینیات پر گفتگو کرتا تھا۔ جب اس کے لیے اپنی روزی کمانے کا وقت
آیا تو اس نے اپنے باپ کو یہ کہہ کر ناراض کردیا، کہ میں ادب کو اپنا پیشہ بنانا چاہتا ۲۲۳
ہوں۔ ایم آروے نے کہا کہ ادب ان لوگوں کا پیشہ ہے جو معاشرے میں بیکار اپنے رشتہ داروں پر بار ہوتے اور بھوکے مر کے جان دینا چاہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ یہ الفاظ میز پر ہاتھ مار مار کر کہہ رہا ہو، اور میز ہلتی ہوئی دکھائی دیتی ہو۔ اس طرح سے فرانسوا نے ادب کا پیشہ اختیار کرلیا۔

یہ نہیں کہ وہ ایک خاموش اور محض محنتی طالب علم تھا، وہ دوسروں کو بھی آدھی آدھی رات تک جگاتا تھا۔ اس نے دیر تک باہر رہنے کی عادت اختیار کرلی، اور شہر کے پھکڑوں اور بدمعاشوں کے ساتھ ہنسی، مذاق اور مذہبی احکام کی آزمائش میں وقت گزارا کرتا تھا، یہاں تک کہ اس کے باپ نے ناراض ہو کر اس کو کان میں ایک عزیز کے یہاں اس ہدایت کے ساتھ بھجوادیا کہ اس کو تقریباً مقید رکھا جائے۔ لیکن اس کا محافظ اس کی ظرافت اور بذلہ سنجی پر عاشق ہوگیا اور اس نے جلد ہی اس کو آزادی دیدی۔ قید کے بعد جلاوطنی کا نمبر آیا۔ اس کے باپ نے اس کو فرانسیسی سفیر کے ساتھ ہیگ بھیج دیا، اور اس سے یہ درخواست کی کہ اس بے لگام لڑکے کی سخت نگرانی کرے۔ مگر فرانسوا آتے ہی ایک نوجوان خاتون پمپیٹے پر عاشق ہوگیا، اور چھپ چھپ کر اس سے ملاقاتیں ہونے لگیں۔ اور اس کو عاشقانہ خط لکھے گئے جو ہمیشہ اس فقرے پر ختم ہوتے تھے "میں یقیناً ہمیشہ تم سے محبت کروں گا" اس معاملے کی خبر ہوگئی اور اس کو گھر بھیج دیا گیا۔ وہ پمپیٹے کو چند ہفتے تک یاد کرتا رہا۔

۱۷۱۵ء میں اپنی اکیس سالہ عمر پر فخر کرتا ہوا وہ پیرس ٹھیک لوئی چہاردہم کی موت کے وقت گیا۔ چونکہ اس کے جانشین لوئی کی عمر فرانس اور اس سے بھی کم پیرس پر حکومت کرنے کے لیے کم تھی، قوت ایک نائب السلطنت کے ہاتھ میں آگئی۔ اس نیم تغیری دور میں دنیا کے دارالسلطنت میں ایک ہنگامہ مچ گیا۔ نوجوان ارؤے بھی اس طوفان میں شریک ہو گیا اور جلد ہی اس نے ذہین اور بے پروا لڑکے کی شہرت حاصل کر لی۔ جب کفایت شعاری کے خیال سے نائب السلطنت نے شاہی اصطبل کے آدھے گھوڑے فروخت کر ڈالے تو فرانسوا نے کہا، کہ اگر ان گدھوں میں جن سے شاہی دربار بھرا ہوا ہے آدھوں کو برخاست کر دیا جاتا تو کیسی معقول بات ہوتی۔ آخر کار وہ تمام شوخ اور شریر چیزیں جو پیرس کے متعلق مشہور تھیں اس سے منسوب ہو گئیں۔ بدقسمتی سے ان میں دو نظمیں تھیں جن میں نائب السلطنت پر تخت کے غصب کر لینے کا الزام لگایا تھا۔ ان پر نائب بہت بگڑا اور ایک روز نوجوان سے باغ میں ملاقات ہو گئی تو وہ کہنے لگا کہ ایم ارؤے میں شرطیہ کہتا ہوں کہ میں تمہیں ایسی چیز دکھا سکتا ہوں جو تم نے کبھی نہ دیکھی ہو، فرانسوا نے پوچھا کہ وہ کیا ہے۔ اس نے کہا کہ بیسٹائل کا داخلی حصہ۔ ارؤے نے اگلے روز ۱۶ اپریل ۱۷۱۷ء کو اسے دیکھ لیا۔

بیسٹائل میں اس نے نہ معلوم کس وجہ سے والٹیر کا تخلص اختیار کر لیا اور آخر کار سچ مچ شاعر بن گیا۔ گیارہ مہینے کی قید بھگتنے سے پہلے اس نے ایک طویل اور خاصہ قابل قدر رزمیہ (Henriade) (ہنریاڈے) لکھا تھا جس میں ہنری ساکن نوار کا قصہ بیان کیا تھا۔ اس وقت نائب السلطنت نے شاید یہ معلوم کرکے کہ اس نے ایک بے قصور آدمی کو قید کر دیا ہے، اس کو رہا کر دیا اور اس کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ اس پر والٹیر نے اس کو خط لکھا، اور اس طرح سے کھانے پینے کے انتظام ہو جانے پر اس کا شکریہ ادا کیا مگر اس کے ساتھ اس امر کی اجازت چاہی کہ آیندہ سے وہ اپنے رہنے کا انتظام خود ہی کر لے گا۔

اب وہ ایک ہی زقند میں قید خانے سے ناٹک گھر پہنچ گیا۔ اس کا حزنیہ (Oedipe) ۱۷۱۸ء میں شائع ہوا اور اس بارے میں پیرس میں تمام

تمثیلوں سے بازی لے گیا کہ مسلسل پینتالیس رات دکھایا گیا۔ اس کا بوڑھا باپ جو اس کو ملامت کرنے کے لیے آیا تھا، ایک مخصوص نشست پر بیٹھا ہوا تھا، اور اپنی خوشی کو بڑبڑا کر چھپا رہا تھا، اور ہر قابل تعریف موقع پر کہتا تھا "ارے بدمعاش! بدمعاش"۔ جب تماشے کے بعد شاعر فانٹینل والٹیر سے ملا اور یہ کہہ کر انتہائی تعریف کے پردے میں مذمت کی کہ یہ حزنیہ سے کہیں زیادہ شاندار اور پر لطف تھا تو اس کا والٹیر نے ہنس کر جواب دیا کہ مجھے آپ کی دیہاتی نظموں کو پھر پڑھنا چاہئے۔ نوجوان احتیاط یا اخلاق برتنے کے لیے تیار نہ تھا۔ کیا خود اس نے اپنی تمثیل میں یہ غیر محتاط سطور داخل نہ کی تھیں۔

ہمارے پادری ویسے نہیں ہیں جیسا کہ سیدھے سادے لوگ ان کو

فرض کرتے ہیں ان کا علم محض ہماری ضعیف الاعتقادی ہے۔ (ایکٹ ۴۔

سین ۱)۔

اور ایرا اسپی کے منہ سے یہ عصر آفریں سطور ادا نہ کرائی تھیں ؟

ہم کو اپنے پر بھروسا کرنا چاہئے اور اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہئے

انھیں کو ہمارے ہاتف ہمارے کاہن اور ہمارے دیوتا ہونا چاہئے (ایکٹ

۲۔ سین ۵)۔

اس تمثیل سے والٹیر کو چار ہزار فرانک ملے، جن کو اس نے ایسی دوراندیشی سے جو فلسفی میں کبھی سننے میں نہیں آئی کاروبار لگا دیا۔ اپنی تمام مصائب میں اس نے نہ صرف یہ کہ اچھی آمدنی کے پیدا کرنے کا فن اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیا بلکہ اس آمدنی سے کام لینے کا بھی۔ ۱۷۲۹ء اس نے ایک ایسی حکومتی لاٹری کے تمام ٹکٹ خرید ڈالے جس کا انتظام اچھا نہ تھا، اور اس میں اس نے بڑی رقم پیدا کرلی، اگرچہ حکومت بہت جلی۔ لیکن وہ جتنا دولت مند ہوا اتنا ہی فیاض بھی ہو گیا۔ اور جیسے ہی وہ زندگی کے سہ پہر میں داخل ہوا تو شاگردوں اور زیر دستوں کا روز افزوں حلقہ اس کے گرد جمع ہو گیا۔ ۲۲۵

یہ اچھا ہی تھا کہ وہ فرانسیسی زور قلم کے ساتھ عبرانی ذوق مالیات بھی رکھتا تھا، کیونکہ اس کی دوسری تمثیل (Artemire) ناکام ہو گئی۔ والٹیر نے

اس کی ناکامی کو بہت محسوس کیا، کیونکہ ہر کامیابی ناکامی کی تکلیف کو تیز تر کر دیتی ہے۔ اس کو رائے عامہ سے بہت تکلیف ہوتی تھی، اور وہ حیوانوں پر رشک کیا کرتا تھا، کیونکہ وہ نہیں جانتے کہ لوگ ان کے متعلق کیا کہتے ہیں قسمت نے تمثیلی ناکامی پر بیماری کا اور اضافہ کر دیا، او وہ بری طرح سے چیچک میں مبتلا ہو گیا، مگر اس نے ۱۲۰ پائنٹ شربت لیموں اور اس سے کسی قدر کم دوا سے اپنے آپ کو تندرست کر لیا۔ جب وہ موت کے چنگل سے چھوٹا تو اس نے دیکھا کہ اس کی (Henriade) نے اس کو مشہور کر دیا ہے۔ اس کی اس نعلی کی کہ اس نے شاعری کو فیشن بنا دیا ہے معقول وجہ تھی۔ اس کا ہر جگہ خیر مقدم ہوتا تھا اور وہ ہر جگہ کھینچ بلایا جاتا تھا۔ امرا نے اس کو لیا اور دنیا کا ایک شائستہ آدمی بنا دیا، ایسا شخص جو گفتگو میں بے مثال اور یورپ کی شائستگی کی بہترین روایات کا وارث تھا۔

آٹھ سال تک وہ دیوان خانوں کی دھوپ سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ اور پھر قسمت اس کے خلاف ہو گئی۔ بعض امرا اس امر کو نہ بھول سکتے تھے کہ یہ نوجوان طباعی کے علاوہ عزت و منزلت کا کوئی حق نہیں رکھتا، اور وہ اس کے اس امتیاز حاصل کر لینے کو معاف نہ کر سکے۔ ڈک ڈی سلی کے قلعے میں دعوت تھی جس میں والٹیر چند منٹ تک بے جھجک فصاحت و ظرافت سے تقریر کر چکا تھا کہ کیولیر ڈی روہن (not Sotto) نے بلند آواز سے پوچھا کہ یہ نوجوان جو اس قدر زور زور سے بول رہا ہے کون ہے۔ والٹیر نے تیزی سے جواب دیا کہ جناب نواب صاحب یہ شخص کوئی بڑا نام ورثے میں نہیں رکھتا بلکہ جو نام وہ رکھتا ہے اس کے لیے عزت و احترام حاصل کرتا ہے۔" کیولیر کی بات کا جواب دینا گستاخی تھی، اس کی بات کا ایسا جواب دینا کہ جس کا جواب نہ ہو سکے بغاوت کے مساوی تھا۔ معزز نواب نے محض بدمعاشوں کی ایک جماعت کو مقرر کر دیا کہ رات کو اس کو پکڑ کر پیٹیں صرف ان کو یہ ہدایت کر دی کہ "اس کے سر پہ نہ مارنا" ممکن ہے کہ اس سے اب بھی کوئی عمدہ چیز نکلے" دوسرے روز تماشے میں والٹیر پٹیوں سے بندھا ہوا لنگڑاتا ہوا روہن کی نشست تک آیا، اور اس کو مقابلے کے لیے بلایا۔ اور پھر وہ گھر گیا اور دن بھر ٹین کے ٹکڑوں پر نشانہ بازی میں وقت صرف کیا۔ لیکن شریف کیولیر کو محض ایک طباع کے ہاتھ سے جنت میں

یا کہیں اور قبل از وقت جانے کی جلدی نہ تھی۔ اس نے اپنے رشتے کے بھائی سے اپنی حفاظت کے لیے کہا جو پولیس کا وزیر تھا، والٹیر گرفتار کر لیا گیا اور اس نے اپنے آپ کو پھر اپنے پرانے گھر بیسٹائل میں پایا، اور ایک بار پھر دنیا کو اندر سے دیکھنے کا حق ملا۔ وہ تقریباً فوراً ہی اس شرط پر رہا کر دیا گیا کہ وہ انگلستان چلا وطن ہو جائے۔ وہ گیا۔ ڈووَر تک تو اس کے ساتھ سپاہی گئے، مگر اس کے بعد بھیس بدل کر پھر اس نے رودبار کو عبور کر لیا۔ اس وقت وہ آتش انتقام سے پھنک رہا تھا۔ اس کو متنبہ کیا گیا کہ اس کا حال معلوم ہو گیا ہے، اور تیسری بار گرفتار ہونے والا تھا کہ وہ پھر جہاز پر سوار ہوا اور رودبار کو عبور کیا اور جبراً قہراً تین سال انگلستان میں گزارے (۱۷۲۶ء سے ۱۷۲۹ء تک)۔

۲۔ لندن۔ انگریزوں کے متعلق خطوط

اس نے ہمت کے ساتھ نئی زبان میں مہارت بہم پہنچانے کی کوشش کی۔ وہ یہ دیکھ کر ناراض ہوا کہ (Plague) ایک ہجے کا لفظ ہے اور (ague) میں دو ہجے ہیں۔ اس کی طرف سے آدھی زبان کو پلیگ لے جائے آدھی کو ایگ (بخار)۔ لیکن جلد ہی وہ انگریزی کو اچھی طرح سے پڑھنے لگا اور ایک سال کے عرصے میں وہ اس زمانے کے بہترین انگریزی لٹریچر سے واقف ہو گیا۔ لارڈ بولنگ بروک نے اس کو انگلستان کے ادیبوں سے ملایا، اور یکے بعد دیگرے وہ سب کے یہاں مدعو ہوا حتیٰ کہ گوشہ نشین اور ضعیف ڈین سوفٹ سے بھی۔ وہ کسی شرافتِ خاندانی کا مدعی نہ تھا، اور نہ دوسروں سے اس کا طالب تھا۔ جب کانگریو نے اپنی تمثیلوں کے متعلق یہ کہا کہ یہ بالکل معمولی ہیں، اور مجھے تو ایک فارغ البال شریف خیال کیجئے اور مصنف نہ سمجھیے تو والٹیر نے جواب دیا کہ اگر آپ بدقسمتی سے اوروں کی طرح سے محض شریف ہی ہوتے تو میں آپ سے ملنے کے لیے کبھی نہ آتا۔ والٹیر کو یہ دیکھ کر سب سے زیادہ تعجب ہوا کہ بولنگ بروک، پوپ، اڈیسن

اور سوفٹ آزادی کے ساتھ جو چاہتے ہیں لکھتے ہیں۔ اس ملک میں ایک قوم تھی جو اپنی مستقل رائے رکھتی تھی۔ ایسی قوم جس نے اپنے مذہب کو از سر نو ڈھال لیا تھا، اپنے بادشاہ کو سولی پر چڑھا دیا تھا دوسرے کو باہر سے بلا لیا تھا، اور ایک ایسی مجلس ملی بنالی تھی جو یورپ کے ہر فرمانروا سے زیادہ قوی تھی۔ یہاں بیسٹائل نہ تھا ۲۲۶
اور نہ ایسے خط تھے جن کے ذریعے سے خطاب یافتہ وظیفہ خوار یا شاہی نکمے اپنے بے خطاب کے دشمنوں کو بغیر سبب اور بلا مقدمہ چلائے جیل خانے کو بھیج سکتے ہوں۔ یہاں پر تیس مذہب تھے اور ایک بھی پادری نہ تھا۔ یہاں سب سے بہادر فرقہ کویکروں کا تھا جنھوں نے تمام عالم عیسوی کو عیسائیوں کی طرح سے عمل کرکے بتلائے حیرت کر دیا تھا۔ ان پر والٹیر زندگی بھر حیرت کرتا رہا۔ ڈکشنری فلاسیفک میں وہ ایک کویکر کی زبان سے کہلاتا کہ ہمارا خدا، جس نے ہم کو اپنے دشمنوں سے محبت کرنے اور برائی بغیر شکوے کے برداشت کرنے کا حکم دیا ہے، اس کا یقیناً یہ منشا نہیں ہے کہ ہم سمندر پار اپنے بھائیوں کا گلا کاٹنے کے لیے جائیں، کیونکہ خونی سرخ کپڑے پہننے اور دو فٹ اونچی ٹوپیاں اوڑھے گدھے کی کھال کا ڈھول بجا بجا کر بھرتی کرتے ہیں۔

پھر یہ انگلستان ایسا بھی تھا جس میں علمی سرگرمی بھی بہت زور شور سے کام کر رہی تھی۔ بیکن کا نام اب تک فضا میں گونج رہا تھا، اور استقرائی طریقہ ہر میدان میں کامیاب ہو رہا تھا۔ ہابس (۱۵۸۸ء تا ۱۶۷۹ء) نے نشاۂ جدیدہ کے ارتیابی جذبے اور اپنے استاد کی عملی روح کو اس قدر مکمل اور بے باک مادیت کا جامہ پہنایا تھا، جس کی بدولت اس کو فرانس میں شہادت کی عزت حاصل ہو گئی ہوتی۔ لاک (۱۶۳۲ - ۱۷۰۴) نفسیاتی تحلیل کا ایک شاہکار (The Essay on the Human understanding) بغیر کسی فوق الفطری مسلیے کے لکھ چکا تھا، کالنس ٹنڈل اور دوسرے الہیہ اپنے خدا پر یقین کو از سر نو تسلیم کر رہے تھے مگر اس کے علاوہ مقررہ کلیسا کی ہر تعلیم پر معترض تھے۔ نیوٹن ابھی مرا تھا، والٹیر اس کے جنازے میں شریک تھا، اور اکثر ان قومی اعزازات کے اثر کو یاد کیا کرتا تھا، جو اس منکسر المزاج انگریز کے لیے ہوئے تھے۔ وہ لکھتا ہے کہ کچھ

زیادہ عرصہ نہیں ہوا جب ایک ممتاز جماعت اس پرانے اور مضحکہ خیز سوال پر گفتگو کر رہی تھی کہ سیزر، سکندر، تیمور اور کرامویل میں سے کونسا بڑا ہے؟ تو کسی شخص نے جواب دیا کہ بلاشبہہ آزاک نیوٹن سب سے زیادہ بڑا ہے۔ اور یہ جواب صحیح ہے کیونکہ ہم پر احترام ان لوگوں کا لازم آتا ہے جو ہمارے ذہنوں پر حقیقت کے زور سے غالب آتے ہیں، نہ کہ ان لوگوں کا جو کہ ان کو زبردستی غلام بنا لیتے ہیں"۔ ۲۲۸
والٹیر نیوٹن کی تصانیف کا صابر و مکمل طالب علم، اور بعد کو فرانس میں نیوٹن کے خیالات کا سب سے بڑا حامی بن گیا۔

اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ والٹیر نے وہ سب جو کہ انگلستان سکھا سکتا تھا کس قدر جلد سیکھ لیا، اس کا ادب اس کی حکمت اور اس کا فلسفہ۔ اس نے ان تمام مختلف عناصر کو لیا، اور ان کو فرانسیسی تہذیب اور فرانسیسی روح میں گزارا، اور ان کو فرانسیسی ظرافت و فصاحت کے سونے میں بدل دیا۔ ان احساسات کو اس نے "انگلستان پر خطوط" میں درج کیا ہے جس کو مسودے کی صورت میں اس نے اپنے دوستوں میں گھما دیا، اس میں ان خطوط کے طبع کرانے کی جرأت نہ تھی۔ کیونکہ ان میں مکار انگلستان کی اتنی تعریف تھی جو شاہی محتسب کے مذاق کے مطابق ہونی محال تھی۔ ان میں انگریزی سیاسی علمی آزادی کا فرانسیسی استبداد پابندی سلف سے مقابلہ کیا گیا تھا ان میں فرانس کے کاہل امرا اور عشر ہضم کر جانے والے مذہبی لوگوں کی مذمت کی گئی تھی اور کہا گیا تھا کہ ہر سوال اور ہر شک پر ان کو صرف بیسٹائل

لہ۔ ڈیدرو کو اس کی Letter on the Blind پر سہ چھ ماہ کی قید کی گئی۔ بیوفن ۱۷۵۱ء مجمع عام میں اپنی قدامت زمین کی تعلیم سے انکار کرنے پر مجبور کیا گیا۔ فیرٹ کو اس کی فرانس شاہی قوت کی اصل کی انتقادی تحقیق کے بدولت بیسٹائل میں بھیج دیا گیا۔ سرکاری جلاد ۱۷۸۸ء تک کتابوں کو سرکاری طور پر جلایا کرتا تھا، اور ۱۸۱۵ء میں حکومت شاہی کے پھر قائم ہونے کے بعد بھی ۱۷۵۷ء میں ایک قانون کا اعلان کیا گیا کہ اگر کوئی مصنف مذہب کے خلاف لب کشائی کرے گا تو اس کو سزائے موت دی جائے گی۔ سہ ابرڈلی ۱۰۷ اور ۱۰۵ اور ۸۴ و ۳ ۷۔ بیبلز ناغلسفہ والٹیر پیرس طبع ۱۹۰۱ء صفحہ ۹۲ بکل تاریخ تمدن طبع نیویارک۔ جلد اول صفحہ ۵۲۹ ت۔

کھینچ دینا آتا ہے۔ ان میں درمیانی طبقے کو اکسایا گیا تھا کہ یہ اٹھے اور جس طرح انگلستان میں اس طبقے نے اپنی صحیح جگہ لے لی ہے اسی طرح سے فرانس میں لے۔ بلاجانے اور بلاارادے کے یہ خطوط انقلاب کی پہلی بانگ تھے۔

۳۔ سرے۔ افسانے

لیکن نائب السلطنت نے جس کو اس مرغ کا حال معلوم نہ تھا، ۱۷۲۹ء والٹیر کو فرانس واپس آنے کی اجازت دیدی۔ پانچ سال تک والٹیر پھر اس پیرسی زندگی سے لطف اندوز ہوا، جس کی شراب اس کی رگوں میں دوڑتی تھی، اور جس کی روح اس کے قلم سے رواں ہوتی تھی، اور پھر کسی مفسد ناشر کو خطوط انگلستان (Letters on the English) مل گئے، اور اس نے مصنف کی اجازت کے بغیر ان کو شائع کر دیا، اور عام طور پر فروخت کر ڈالا جس سے تمام اچھے فرانسیسی مع والٹیر کے بہت گھبرائے۔ پیرس کی پارلیمنٹ نے کتاب کو بدنام کن مخرب مذہب و اخلاق اور مخالف احترام حکومت قرار دے کر سرکاری طور پر جلوا دینے حکم دیدیا۔ اور والٹیر کو معلوم ہوا کہ وہ اب پھر بیسٹائل کی راہ پر ہے۔ ایک اچھے فلسفی کی طرح سے وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ اس موقع سے اس نے صرف یہ فائدہ اٹھایا کہ دوسرے شخص کی بیوی کو لیکر بھاگ گیا۔ ۲۲۹

مارکوئنز سے ڈو شاٹلے اٹھائیس سال کی عورت تھی۔ والٹیر چالیس کو پہنچ چکا تھا۔ وہ ایک غیر معمولی عورت تھی۔ اس نے ریاضیات کی تعلیم مشہور فاضل موپرتوے سے اور پھر کلیرو سے حاصل کی تھی۔ اس نے نیوٹن کی کتاب (Principia) کا عالمانہ مشرح ترجمہ کیا تھا۔ وہ انعامی مقابلے میں جو فرانسیسی اکیڈیمی کی طرف طبیعیات نار پر مضمون لکھنے کی صورت میں ہوا تھا والٹیر سے بازی لے جانے والی تھی۔ مختصر یہ کہ وہ ٹھیک اس قسم کی عورت تھی جو کبھی نہیں بھاتی۔ مگر مارکوئز بہت غیر دلچسپ اور والٹیر بہت دلچسپ تھا یعنے "ایسا آدمی جو ہر اعتبار سے قابل محبت تھا"، وہ اس کو

"فرانس کا سب سے عمدہ زیور کہتی تھی" اس نے اس کی محبت کا نہایت ہی سرگرم تحسین سے جواب دیا اور اس کی نسبت کہا کہ "وہ ایک بڑی آدمی ہے اور اس میں نقص ہے تو صرف اس قدر کہ عورت ہے، اور اس سے اس وقت فرانس میں اصلی ذہانت کی عورتوں کی جو بڑی تعداد تھی، اس یقین پر پہنچا کہ مرد و عورت ذہنی طور پر مساوی ہیں۔ مارکوئی اپنی رجمنٹ کے ساتھ دور تھا، اور ریاضیات سے بچنے کے لیے اس کے پاس یہی صورت تھی۔ اس نے نئے انتظام پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ رسمی شادیوں کی وجہ سے جو بوڑھے دولتمند مردوں کو ایسی نوجوان عورتوں پر مسلط کر دیتی تھیں جن کو بڑھاپے سے مطلق دلچسپی نہ ہوتی اور رومان کی دلدادہ ہوتی تھیں، اس زمانے کا اخلاق عورت کو اس امر کی اجازت دیتا تھا کہ وہ اپنی خانگی زندگی میں ایک عاشق کا اور اضافہ کر لیں بشرطیکہ یہ نوع انسان کی مکاری کے مناسب احترام کے ساتھ کیا جائے اور جب اس نے محض عاشق ہی نہیں بلکہ ایک طباع کو پسند کیا تو تمام دنیا نے اس کو معاف کر دیا۔ ۲۳۰

سرے (Cirey) کے قلعے میں انھوں نے تمام وقت عشق و محبت ہی میں نہیں گزارا۔ تمام دن مطالعے اور تحقیق میں گزرتا تھا۔ والٹیر ایک قیمتی معمل رکھتا تھا جو علم طبیعی پر کام کرنے کے لیے آلات سے آراستہ تھا۔ برسوں عاشق و معشوق تحقیق و انکشاف میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے رہے۔ ان کے یہاں مہمان بہ کثرت آتے تھے مگر یہ بات طے تھی کہ مہمان تمام دن خود اپنی مدارات کریں یہاں تک کہ نو بجے شب کے کھانے کا وقت آجائے۔ رات کے کھانے کے بعد اکثر نجی تمثیلی تماشے ہوتے تھے یا والٹیر مہمانوں کو اپنا کوئی دلچسپ افسانہ سناتا تھا۔ بہت جلد سرے فرانسیسی ذہن کا بیرس بن گیا۔ امرا اور متوسط طبقے کے لوگ مل کر والٹیر کی شراب اور ظرافت کا مزہ لینے اور اس کو خود اپنی تمثیل کی نقل کرتے ہوئے دیکھنے کے لیے آتے تھے۔ وہ اس خراب اور شاندار دنیا کا مرکز بننے پر خوش تھا۔ وہ کسی بات پر بہت زیادہ سنجیدگی سے غور نہیں کرتا تھا، اور ایک ہنستا اور ہنسانا ہی اس نے اپنا مقصد بنا لیا تھا۔ کیتھرین، ملکۂ روس نے اس کو "خوش وقتوں کا دیوتا کہا ہے"۔ وہ کہتا ہے کہ اگر فطرت نے ہم کو تھوڑا مسخرا نہ بنا دیا ہوتا تو ہماری حالت نہایت ہی بری ہوتی۔ اکثر انسان جو اپنے آپ کو پھانسی نہیں

دے لیتے اس کی وجہ یہی ہے کہ ہم ہنسی مذاق کر سکتے ہیں۔ اس کو ضعف معدہ کے مریض کارلائل سے کوئی نسبت نہیں ہے "کبھی کبھی بیوقوف ہونا دلچسپی سے خالی نہیں ہوتا" افسوس ہے ان فلاسفہ کی حالت پر۔ اپنے چہرے کی جھریوں کو دور نہیں کر سکتے۔ میں سنجیدگی وخاموشی کو ایک بیماری سمجھتا ہوں[۵]

اس زمانے میں اس نے وہ دلچسپ افسانے لکھنے شروع کئے (Zadig, Candide, Micromegas, L'Ingenu, Le Monde comme il Va) وغیرہ — جو اتنی خالص والٹیر کی روح کو پیش کرتے ہیں جتنی اس کی تصانیف کی ننانوے جلدوں میں کہیں نہیں ہے۔ یہ ناول نہیں ہیں بلکہ ظریفانہ افسانے ہیں۔ ان کے ہیرو اشخاص نہیں بلکہ تصورات اور واقعات و خیالات ہیں۔ بعض محض ٹکڑے ہیں مثلاً (L'Ingenu.) جو جین جیکس کے مقابلے میں روسو ہے۔ ایک (Huron) ہندوستانی بعض محققین کے ساتھ فرانس آتا ہے۔ اس کے آنے سے پہلا مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کو عیسائی بنایا جائے۔ ایک پادری اس کو انجیل کا ایک نسخہ دیتا ہے ۲۳۱
جس کو اس قدر پسند کرتا ہے کہ وہ جلد ہی اپنے آپ کو صرف اصطباغ ہی کے لیے بلکہ ختنہ کے لیے پیش کر دیتا ہے۔ کیونکہ جو کتاب مجھے دی گئی ہے اس میں میں کسی شخص کو غیر مختون نہیں پاتا۔ اس لیے یہ ظاہر ہے کہ مجھے عبرانی رواج کے لیے قربانی کرنی چاہئے، اور یہ جتنی جلد ہو اتنا ہی بہتر ہے" یہ دشواری ابھی رفع ہی ہوئی تھی کہ اعتراف کے بارے میں دشواری پیش آتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انجیل میں یہ حکم کہاں ہے؟ اور اس کو سینٹ جیمس کے مکتوب کی ایک عبارت کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے کہ اپنے گناہوں کا ایک دوسرے سے اعتراف کرو۔ وہ اعتراف کرتا ہے۔ مگر اعتراف کرنے کے بعد وہ پادری کو اعترافی کرسی پر سے کھینچ لیتا ہے اور خود اس کرسی پر بیٹھ جاتا ہے اور پادری سے کہتا ہے کہ اب تمھاری باری ہے اب تم اعتراف کرو۔ آؤ میرے دوست! حکم تو یہ ہے کہ تمھیں ایک دوسرے سے اپنے گناہوں کا اعتراف کرنا چاہئے۔ میں اپنے گناہ تم سے بیان کر چکا۔ اب تم اس وقت تک نہیں ہل سکتے

---

[۵] - خط بنام فریڈرک اعظم جولائی ۱۷۳۷ء۔

جب تک اپنے گناہوں کا اعتراف نہ کرلو۔" وہ مس سینٹ ہیوز پر عاشق ہوجاتا ہے، مگر اس سے کہا جاتا ہے کہ وہ اس سے شادی نہیں کرسکتا کیونکہ وہ اس کے اصطباغ پر دینی ماں کے طور پر عمل کرچکی ہے۔ وہ تقدیر کی اس فراسی چال پر بہت ناراض ہوتا ہے اور مرتد ہوجانے کی دھمکی دیتا ہے، اسے اس عورت کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت دی جاتی ہے، اب وہ دیکھتا ہے کہ شادی کے لئے دستاویز نویسوں پادریوں شاہدوں معاہدوں اور مذہبی رسموں کی شدید ضرورت ہے .... اس پر وہ کہتا ہے کہ تم تو بڑے بدمعاش ہو، تب ہی تو اتنی احتیاطی تدابیر کی ضرورت ہے۔ اسی طرح سے جیسے کہانی ایک واقعے سے دوسرے واقعے کی طرف اور دوسرے سے تیسرے واقعے کی طرف جاتی ہے، اصلی اور رسمی عیسائیت کا تضاد صریح طور پر سامنے آجاتا ہے۔ اس میں ایک فاضل کی غیر جانب داری اور فلسفی کی نرمی دکھائی نہیں دیتی مگر والٹیر نے توہم پرستی کے خلاف اپنا جہاد شروع کردیا تھا، اور جنگ میں غیر جانب داری اور نرمی کی توقع صرف دشمنوں ہی سے کی جاتی ہے جو عبث ہے۔

(Micromegas) (مکرومیگاز) سوفٹ کی تقلید میں لکھا ہے مگر شاید کائناتی تخیل میں یہ اپنی اصل سے بڑھا ہوا ہے۔ زمین پر سائرس یا کلب الجبار کا ایک باشندہ آتا ہے، اس کا قد تقریباً پانچ لاکھ فٹ ہے، جیسا کہ اتنے بڑے ستارے کے باشندے کا ہونا چاہئے۔ فضا میں گزرتے وقت وہ زحل کے ایک باشندے کو اٹھالاتا ہے جو اس بات پر رنجیدہ ہے کہ اس کا قد صرف چند ہزار فٹ ہے۔ جب وہ بحر روم میں سے گزرتے ہیں تو کلب الجباری کی صرف ایڑیاں بھیگتی ہیں، وہ اپنے ساتھی زحلی سے کہتا ہے کہ زحلی کتنے خواص رکھتے ہیں اور اس سے کہا جاتا ہے کہ ہم صرف بہتر خواص رکھتے ہیں، مگر ہمیں روزانہ ان کی کمی کی شکایت ہوتی ہے۔ "تم لوگوں کی عمر کتنی ہوتی ہے؟ افسوس ہے کہ بہت ہی مختصر ہے۔ ہمارے کرے پر بہت کم لوگ پندرہ ہزار برس جیتے ہیں۔ پس تم دیکھتے ہو کہ ہم پیدا ہونے کے ساتھ ہی مرنے لگتے ہیں۔ ہماری زندگی ایک نقطے سے زیادہ نہیں ہے، ہمارا زمانہ ایک لمحہ ہے اور ہمارا کرہ ایک ذرہ ہے۔ بمشکل ہی ہم کچھ سیکھنا شروع کرتے ہیں کہ اس سے پہلے کہ ہم تجربے سے فائدہ اٹھائیں موت حائل ہوجاتی ہے۔" سمندر میں کھڑے ہوئے وہ ایک جہاز کو اس طرح سے اٹھالیتے ہیں

۲۳۲

جس طرح سے کوئی آدمی کسی چھوٹے سے جانور کو اٹھالے، اور ساتھ ہی اس کو اپنے انگوٹھے کے ناخن پر رکھ لیتا ہے جس سے انسانی مسافروں میں بہت پریشانی پیدا ہوتی ہے"۔ جہاز کے پادری دعائیں مانگتے ہیں، ملاح قسمیں کھاتے ہیں، اور فلسفی اس قانون تجاذب کی خلاف ورزی کی توجیہ کے لیے فلسفہ مرتب کرتے ہیں۔ کلب الجباری ایک ایک سیاہ بادل کی طرح سے جھکتا ہے، اور اس طرح سے خطاب کرتا ہے۔

اے ذی عقل ذرو! جن میں ذات اعلیٰ نے اپنی ہمہ دانی اور قوت ظاہر کی ہے، بلاشبہہ اس زمین پر تمھاری خوشیاں خالص اور اعلیٰ درجے کی ہوں گی کیونکہ بہ ظاہر تم مادے سے گراں بار معلوم نہیں ہوتے، اور روح کے علاوہ شاید ہی اور کچھ ہو، اس لیے تم اپنی زندگیاں لذت اور تفکر کی مسرتوں میں بسر کرتے ہوگے، جو کہ مکمل روح کی حقیقی خوشیاں ہیں، میں نے سچی مسرت کہیں نہیں پائی، مگر مجھے یقین ہے کہ یہ یہاں ضرور ہے"۔

فلسفیوں میں سے ایک نے جواب دیا کہ ہم بہت کچھ شر برپا کرنے کے لیے کافی مادہ رکھتے ہیں ...... مثلاً تمھیں جاننا چاہیے کہ اس وقت بھی ہماری نوع کے ایک لاکھ جانور ٹوپیاں پہنے ہوئے اپنے ہمجنسوں کی اتنی ہی تعداد کو قتل کر رہے ہیں جو پگڑیاں باندھے ہوئے ہیں، کم از کم وہ یا تو قتل کر رہے ہیں یا قتل ہو رہے ہیں اور بالعموم تمام زمین پر یہی صورت نامعلوم زمانے سے رہی ہے۔

مفسدو۔ کلب الجباری نے غضبناک ہو کر کہا، میرا جی چاہتا ہے کہ دو تین قدم چل کر ایسے مضحکہ خیز قاتلوں کے پورے گھونسلے کو پاؤں کے نیچے روند ڈالوں۔ ۲۳۱

فلسفی نے جواب دیا کہ "یہ زحمت کیوں اٹھاتے ہو یہ لوگ تو اپنی تباہی کے لیے خود کافی محنت کرتے ہیں، دس سال کے اندر ان بدبختوں کا دسواں حصہ بھی باقی نہ رہے گا........ علاوہ بریں، سزا، ان لوگوں کو نہ ملنی چاہیے بلکہ ان کاہل وحشیوں کو ملنی چاہیے، جو اپنے محلوں سے لاکھوں آدمیوں کے قتل کا حکم دیتے ہیں، اور پھر اپنی کامیابی پر نہایت متانت سے خدا کا شکر ادا کرتے ہیں۔

Candide (کینڈڈے) کے بعد جو والٹیر کی زندگی کے بعد کے حصے سے تعلق

رکھتا ہے، ان افسانوں میں سے بہترین زادِگ ہے۔ زادگ بابل کا ایک فلسفی تھا اور اتنا دانا تھا، جتنا کہ ایک آدمی کے لیے ہونا ممکن ہے۔ وہ مابعد الطبیعیات سے اتنا واقف جتنا کہ اس کا کبھی کسی زمانے میں علم ہوا ہے — یعنے تھوڑا یا مطلق نہیں۔ رشک نے اس کو یہ یقین دلا دیا کہ وہ سمیرا پر عاشق ہے۔ اس کو ڈاکوؤں سے بچانے میں اس کی بائیں آنکھ زخمی ہو گئی۔

میفس کو ایک قاصد بھیجا گیا کہ مشہور مصری طبیب ہرمیز کو بلا لائے جو بہت سے خادموں کے ساتھ آیا۔ اس نے زادگ کو دیکھا، اور حکم لگا دیا کہ مریض کی آنکھ ضائع ہو جائے گی۔ اس نے یہاں تک پیشین گوئی کر دی کہ فلاں دن اور فلاں ساعت آنکھ ضائع ہو جائے گی۔ اس نے کہا کہ اگر یہ داہنی آنکھ ہوتی تو میں اس کو نہایت آسانی کے ساتھ اچھا کر سکتا تھا لیکن بائیں آنکھ کے زخم لاعلاج ہوتے ہیں، تمام بابل نے زادِگ کی قسمت پر افسوس کیا اور ہرمیز کے تبحر کی داد دی۔ دو دن میں زخم خود بخود پھوٹ گیا، اور زادِگ بالکل تندرست ہو گیا۔ ہرمیز نے یہ ثابت کرنے کے لیے ایک کتاب لکھی کہ اس کو اچھا نہ ہونا چاہیے تھا۔ زادگ نے اس کو پڑھا تک نہیں۔

اس کے بجائے وہ جلد ہی سمیرا کے پاس گیا۔ مگر وہاں جا کر اس کو معلوم ہوا کہ ہرمیز کی رائے سننے کے بعد اس نے دوسرے شخص سے یہ کہہ کر شادی کا وعدہ کر لیا ہے
کہ مجھے کانے آدمی سے سخت نفرت ہے۔ اس پر زادِگ نے ایک دہقانی عورت سے شادی ۲۳۴
کر لی، اس امید پر کہ جو خوبیاں درباری خاتون سمیرا میں نہ تھیں وہ اس میں ہوں گی۔ اپنی بیوی کی وفاداری کا امتحان کرنے کے لیے اس نے اپنے ایک دوست سے یہ طے کیا کہ میں مرنے کا مکر کرتا ہوں، اور تم اس کے ایک گھنٹے کے بعد میری بیوی سے اظہار محبت کرنا۔ پس زادِگ نے اپنے آپ کو مردہ تسلیم کرا دیا، اور تابوت میں لیٹ گیا، اس کے دوست نے پہلے بیوہ سے اظہار افسوس کیا، اور پھر مبارکباد دی اور آخر کار یہ تجویز کی کہ تم مجھ سے فوراً شادی کر لو۔ اس نے تھوڑی سی مزاحمت کی اور پھر یہ کہہ کر میں راضی نہ ہوں گی، راضی ہو گئی۔" زادِگ اٹھا اور اپنے کو حسن فطرت سے دلاسا دینے کے لیے جنگل کو بھاگ گیا۔

چونکہ وہ بہت تجربہ کار آدمی بن چکا تھا، اس لیے وہ ایک بادشاہ کا وزیر بنا دیا گیا، جس کی مملکت میں وہ خوش حالی انصاف اور امن کا باعث ہوا، لیکن ملکہ اس پر عاشق ہو گئی، اور بادشاہ یہ دیکھ کر پریشان ہوا۔ اس نے خاص طور پر یہ بات محسوس کی کہ ملکہ کے جوتے بھی نیلے ہیں اور زادگ کے جوتے بھی نیلے ہیں، اس کی بیوی زرد فیتہ لگائے ہوئے ہے وہ زادگ کی ٹوپی زرد ہے"۔ اس نے دونوں کو زہر دید ینے کا فیصلہ کیا۔ لیکن ملکہ کو یہ سازش معلوم ہو گئی اور اس نے زادگ کو خط لکھا میں تجھے قسم دیتی ہوں اپنی اور تیری محبت کی اور اپنے اور تیرے زرد فیتوں کی کہ اس جگہ سے بھاگ جا۔ زادگ پھر جنگلوں کو بھاگ گیا۔

اب اس نے نوع انسان کو ایسا خیال کرنا شروع کیا جیسی کہ یہ درحقیقت ہے یعنے کیڑوں کا ایک مجموعہ جو ایک دوسرے کو مٹی کے ذرا سے ذرے پر کھائے جا رہا ہے۔ اس حقیقی تمثال سے اس کا رنج و غم دور ہو جاتا ہے، اور اس کو اپنے اور بابل کے بے حقیقت ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی روح لا تناہی کے خیال میں منہمک ہو جاتی ہے، اور جو اس سے علحدہ ہو کر کائنات کے غیر متغیر نظام پر تدبر کرتا ہے۔ لیکن جب ہوش میں آتا ہے .... تو اس کو ملکہ کا خیال آتا ہے کہ شاید وہ اس کے لیے مر گئی ہو۔ اس پر کائنات نظر سے اوجھل ہو گئی۔ بابل سے نکلتے ہوئے اس نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ ایک عورت کو بے رحمی سے مار رہا ہے، وہ اس کے امداد کے شور پر چلا اور اس آدمی سے لڑا، اور آخر کار اپنے آپ کو بچانے کے لیے اس نے ایک ایسا وار کیا جس سے اس کا دشمن مر گیا۔ اس پر وہ اس خاتون کی طرف مڑا اور اس سے پوچھا کہ اے خاتون اب میں تیرے لیے کیا کروں۔ مر رہ بدمعاش! کیونکہ تو نے میرے عاشق کو مار ڈالا ہے۔ کاش کہ میں تیرے قلب کو چیر سکتی۔ ۲۳۵

زادگ اس کے کچھ ہی عرصے کے بعد گرفتار ہو کر غلام بنا دیا گیا۔ لیکن اس نے اپنے مالک کو فلسفہ سکھایا اور اس کا معتبر مشیر ہو گیا۔ اس کے مشورے سے ستی کی رسم (جس کے بموجب ایک عورت اپنے شوہر کے ساتھ دفن ہو جاتی تھی) ایک

ایسے قانون کے ذریعے سے بند کی گئی جس کے مطابق اس قسم کی شہادت سے پہلے بیوہ کو ایک خوبصورت آدمی کے ساتھ ایک گھنٹہ تنہا گزارنا پڑتا تھا۔ وہ شاہ سراندیپ کے پاس سفارت کے سلسلے میں بھیجا گیا۔ زاوگ نے اس کو سکھایا کہ ایک ایماندار وزیر اس طرح سے دستیاب ہو سکتا ہے کہ درخواست گزاروں میں سے جو سب سے سبک پا ناچے اس کو انتخاب کر لیا جائے۔ ناچ کے کمرے کے متصل جو چھوٹا کمرہ تھا ہیں نے ایسی چیزیں رکھوا دیں جو آسانی سے چرائی جا سکیں، اور اس کا انتظام کر دیا کہ ہر شخص کمرے میں سے تنہا گزرے اور کوئی شخص نگران نہو۔ جب وہ سب داخل ہو چکے تو ان سے ناچنے کے لیے کہا گیا۔ "کبھی ناچنے والے اس قدر بے دلی سے اور بھدے طور پر نہیں ناچے ان کے سر نیچے کو جھکے ہوئے تھے، ان کی کمریں مڑی ہوئی تھیں، اور ان کے ہاتھ پہلوؤں میں دبے ہوئے تھے۔ اس طرح سے کہانی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے، ہم خیال کر سکتے ہیں کہ بہرے میں شاہیں کس طرح سے گزری ہونگی۔

۴۔ پوٹسڈام اور فریڈرک

جو لوگ اس کے پاس نہ آسکتے تھے وہ اس سے خط و کتابت کرتے تھے۔ ۱۷۳۶ء میں اس کی فریڈرک سے خط و کتابت شروع ہوئی جو اس وقت شاہزادہ تھا اور ابھی اعظم نہ بنا تھا۔ فریڈرک کا پہلا خط ایسا تھا جیسے کہ ایک لڑکا ایک بادشاہ کو لکھتا ہو۔ اس میں جس شد و مد سے اس کی خوشامد کی گئی ہے اس سے اس شہرت کا کچھ پتا چلتا ہے جو والٹیر کو (اگرچہ اس نے اپنے شاہکاروں میں سے کوئی نہ لکھا تھا) حاصل ہو چکی تھی۔ اس میں والٹیر کو فرانس کا سب سے بڑا انسان بتایا گیا ہے، اور اس کی نسبت کہا گیا ہے کہ وہ ایسا فانی انسان ہے جس کا وجود زبان کے لیے باعث عزت ہے۔ .... میں اس کو اپنی سب سے بڑی عزت خیال کرتا ہوں کہ میں آپ جیسے باکمال انسان کا ہم عصر ہوں .... دل کا ہنسانا ہر ایک کا کام نہیں ہے اور دلی لذتوں سے کونسی لذت بڑھ سکتی

ہے۔ فریڈرک ایک آزاد خیال شخص تھا جو اعتقادات کو اس نظر سے دیکھتا تھا جس نظر سے ایک بادشاہ اپنی رعایا کو دیکھتا ہے۔ اور والٹیر کو بڑی امید تھی کہ فریڈرک تخت پر بیٹھ کر علم کو ترویج دے گا اور خود وہ ممکن ہے کہ فریڈرک کے لیے افلاطون کا کام کرے۔ جب فریڈرک نے اس خوشامد پر اعتراض کیا جو والٹیر نے جواب میں اس کی تھی' تو والٹیر نے جواب دیا ایک شاہزادے کا خوشامد کے خلاف لکھنا ایسا ہے جیسا کہ پوپ کا بے خطا ہونے کے خلاف لکھنا۔ فریڈرک نے اس کو ایک نسخہ اپنی کتاب (Anti-Machiavel) کا ایک نسخہ بھیجا جسمیں شاہزادے نے جنگ کے مظالم اور ایک بادشاہ کے امن قائم رکھنے کے فریضے پر نہایت خوبی سے گفتگو کی تھی۔ اس شاہی امن پسندی پر والٹیر نے خوشی کے آنسو بہائے چند ماہ بعد فریڈرک بادشاہ ہو گیا۔ اور اس نے سلیشیا پر حملہ کر دیا' اور یورپ کو خونریزی ایک نسل میں دھکا دیدیا۔ ۲۳۶

۱۷۴۵ء میں شاعر اور اس کی ریاضیاتیہ پیرس گئے' اور والٹیر فرانسیسی ایکیڈمی کی رکنیت کا امیدوار ہوا۔ اس بالکل غیر ضروری اعزاز کے حاصل کرنے کے لیے اس نے اپنے آپ کو اچھا کیتھولک کہا' بعض طاقتور جیسوئٹس کی مدح سرائیاں کیں' بے تحاشا جھوٹ بولا۔ اور مختصر یہ کہ ایسا ہی عمل اختیار کیا جیسا کہ ایسی صورتوں میں ہم میں سے اکثر اختیار کرتے ہیں۔ وہ ناکام رہا' مگر ایک سال بعد کامیاب ہو گیا' اور اس نے خطبۂ استقبالیہ پڑھا جو فرانسیسی ادبیات کے اندر ایک خاص چیز سمجھا جاتا ہے۔ کچھ عرصے وہ پیرس ہی میں رہا' اور ایک قصر سے دوسرے قصر میں منتقل ہوتا رہا' اور پے در پے تمثیلات تصنیف کرتا رہا (Oedipe) سے لے کر جو اٹھارہ سال کی عمر میں لکھی تھی (Eriphyle) تک جو تراسی برس کے سن میں لکھی اس نے تمثیلات کا ایک بڑا سلسلہ لکھا ہے' جن میں سے بعض ناکام رہیں۔ لیکن اکثر کامیاب ہوئیں۔ ۱۷۳۰ء بروٹس ناکام رہا' ۱۷۳۲ء Eriphyle ناکام رہا' اس پر اس کے دوستوں نے اصرار کیا کہ تمثیل نگاری کو چھوڑ دے' لیکن اسی سال اس نے (Zaire) لکھا جو اس کی سب زیادہ کامیاب تمثیل ثابت ہوا' اس کے بعد ۱۷۴۱ء محمد لکھا ۱۷۴۳ء میں میروپ ۱۷۴۸ء میں (Semiramis) اور ۱۷۶۰ء (Tancrede)

اس اثنا میں حزنیہ و طربیہ خود اس کی زندگی کے اندر داخل ہو گیا تھا، پندرہ سال کے بعد اس کی مادام دوشاتلے کی محبت کسی قدر کم ہو گئی تھی۔ انھوں نے اب جھگڑنا تک چھوڑ دیا تھا۔ ۱۷۴۸ء میں مارکوئز نے ایک خوبصورت نوجوان مارکوئ دی سینٹ لیمبرٹ پر عاشق ہو گئی تھی۔ جب والٹیر کو اس کا علم ہوا تو اس نے بہت شور مچایا۔ لیکن جب سینٹ لیمبرٹ نے اس سے معافی مانگ لی تو اس قدر موم ہو گیا، کہ ان کو دعائیں دیں۔ اب وہ زندگی کی چوٹی پر پہنچ چکا تھا اور دور
سے اس کو موت نظر آنے لگی تھی۔ جوانی کا لحاظ ہونے پر برا نہ مان سکتا تھا۔ اس ۲۳۷
نے فلسفیانہ انداز میں کہا کہ عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں، (اور اس بات کو بھول گئے کہ مرد بھی ایسے ہی ہوتے ہیں) میں نے رشیلو کی جگہ لی اور سینٹ لیمبرٹ نے مجھے نکال باہر کیا۔ یہ نظام عالم ہے، ایک کیل دوسری کیل کو باہر کر دیتی ہے۔ دنیا کا یہی حال ہوتا ہے۔ تیسری کیل کے متعلق اس نے ایک خوبصورت بند لکھا تھا۔

سینٹ لیمبرٹ پھول تیرے لیے اُگتا ہے، گلاب کے کانٹے میرے
لیے ہیں، اور تیرے لیے گلاب کا پھول ہے۔

پھر ۱۷۴۹ء میں مادام دوشاتلے ولادت میں انتقال کر گئی۔ اس زمانے کی یہ خاص بات تھی کہ اس کا شوہر والٹیر اور سینٹ لیمبرٹ اس کے بستر مرگ پر ملے مگر ایک نے دوسرے کو مطلق ملامت نہیں کی بلکہ اپنے مشترکہ نقصان کی بنا پر باہم دوست بن گئے۔

والٹیر نے اس رنج کو کام سے بہلانے کی کوشش کی۔ کچھ عرصے تک تو وہ (Siecle de Louis XIV) میں مصروف رہا۔ مگر جس چیز نے اس کو رنج و غم سے نجات دی وہ یہ تھی کہ فریڈرک نے اس کو اپنے دربار پوٹسڈام میں آنے کی پھر دعوت دی۔ ایسا دعوت نامہ جس کے ساتھ ۳۰۰۰ فرانک مصارف سفر کے لیے بھی ہوں رد کرنا دشوار معلوم ہوا۔ ۱۷۵۰ء میں والٹیر برلن روانہ ہو گیا۔

اُسے یہ دیکھ کر تسکین ہوئی کہ فریڈرک کے محل میں نہایت شاندار کمرے اس کے قیام کے لیے مخصوص کئے گئے ہیں، اور اپنے زمانے کا سب سے طاقتور بادشاہ اس سے مساویانہ ملتا ہے۔ شروع میں اس کے خطوط اطمینان سے لبریز تھے۔

بیس جولائی کو اس نے (d' Argental) کو خط لکھا اس میں وہ پوٹسڈام کا حال بیان کرتا ہے، وہ لکھتا ہے کہ ڈیڑھ لاکھ سپاہی .... ناٹک طربیہ فلسفہ شاعری شان وشوکت، گولہ انداز اور سامعہ نواز، ڈھول اور سارنگیاں فلاطونی عشا جمع آزادی۔ اس سب کا کون یقین کرے گا۔ لیکن اس کے صحیح ہونے میں شبہہ نہیں ہے" برسوں پہلے اس نے لکھا تھا، "میرے خدا! .... کیسی خوشگوار زندگی ہو، اگر تین یا چار ایسے اہل فضل وکمال کے ساتھ رہنے کا موقع ملے جن میں رشک وحسد نہ ہو" (کیا خیال ہے!) "سب باہم محبت والفت سے رہیں، اپنے اپنے فن کو ترقی دیں اس کے متعلق گفتگو کریں اور باہم مستفید ہوں، میں تصور کرتا ہوں کہ مجھے کبھی اس چھوٹے سے بہشت میں رہنے کا موقع ملے گا"۔ اور یہاں یہ بہشت موجود تھا۔

۲۳۸ والٹیر سرکاری دعوتوں سے گریز کرتا تھا، وہ مسلح جنرلوں سے گھیرے ہوئے ہونے کو برداشت نہیں کر سکتا تھا، وہ اپنے آپ کو غیر سرکاری دعوتوں کے لیے مخصوص رکھتا تھا، جن میں فریڈرک شام کے بعد کے حصے میں ادبی احباب کے ایک مختصر اندرونی حلقے کو مدعو کیا کرتا تھا۔ ان دعوتوں میں گفتگو ہمیشہ فرانسیسی میں ہوتی تھی۔ والٹیر نے جرمن سیکھنے کی کوشش کی، مگر تقریباً دم گھٹنے کے بعد اس کو ترک کر دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ جرمنوں میں زیادہ ظرافت ہوتی اور ان کی زبان میں نسبتہً کم حروف صحیح ہوتے۔ اس موقع پر جو گفتگو ہوتی تھی۔ اس کی نسبت ایک شخص جس نے اس کو سنا ہے کہتا ہے کہ یہ دنیا میں سب سے دلچسپ اور سب سے عمدہ کتاب سے بہتر ہوتی تھی۔ وہ ہر شئے کے متعلق گفتگو کرتے تھے اور جو کچھ خیال آتا تھا کہتے تھے۔ فریڈرک بھی تقریباً اتنا ہی ظریف تھا، جتنا کہ والٹیر اور صرف والٹیر ہی اس کو اس عمدگی سے جواب دینے کی جرأت کر سکتا تھا، جو سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے کا مصداق ہوتا تھا۔ والٹیر نے خوش ہو کر لکھا "یہاں انسان جرأت کے ساتھ فکر کرتا ہے، یہاں انسان آزاد ہے۔ فریڈرک اگر ایک ہاتھ سے نوچتا ہے تو دوسرے ہاتھ سے تھپکتا ہے .... میری کسی بات میں مخالفت نہیں ہوتی پچاس سال کے طوفان کے بعد آخر کار مجھے ایک بندرگاہ ملا ہے۔ میں بادشاہ کی حفاظت

فلسفی کی گفتگو اور دلچسپ انسان کی کشمکش کو ایک ایسے انسان میں مجتمع پاتا ہوں، جس نے سولہ سال سے پریشانی میں مجھے دلاسا دیا ہے' اور دشمنوں سے بچایا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی شے کو یقینی سمجھ سکتا ہے تو یہ شاہ پروشیا کی سیرت ہے۔

لیکن..........

اسی سال کے نومبر میں والٹیر نے خیال کیا کہ اگر روپیہ سکسن تمسکات میں لگا دیا جائے تو اس سے مالی حالت بہتر ہو جائے گی۔ ان تمسکات کی قیمت بڑھ گئی اور والٹیر کو نفع ہوا۔ لیکن اس کے کارندے ہرش نے اس معاملے کے شائع کرد ینے کی دھمکی دے کر اس سے بدمعاملگی کرنے کی کوشش کی۔ والٹیر نے اس کی گردن لی اور دے مارا۔ فریڈرک کو اس معاملے کی خبر ہوئی اور شاہی غیظ و غضب کا اظہار کیا۔ اس نے لامیٹرے سے کہا کہ مجھے اس کی زیادہ سے زیادہ ایک سال اور ضرورت ہے' انسان سنگترے کو نچوڑ کر چھلکے کو پھینک دیتا ہے۔ لامیٹرے نے شاید اس خیال سے کہ رقیبوں سے میدان صاف ہو جائے یہ بات والٹیر کو سنا دی۔ دعوتیں پھر شروع ہو گئیں لیکن والٹیر لکھتا ہے کہ سنگترے کے چھلکے کا خیال خواب میں بھی پیچھا نہیں چھوڑتا.......... جو شخص مینار سے ۲۳۹ پر سے گرا تھا' اور ہوا کو نرم پا کر اس نے کہا تھا یہ تو اچھی ہے بشرطیکہ ایسی ہی رہے بالکل مجھ جیسا نہ تھا۔

وہ اس تعلق کے منقطع کر لینے پر نیم آمادہ تھا۔ کیونکہ اب یاد وطن بھی اس کو اتنا ستا رہی تھی جتنا کہ صرف ایک فرانسیسی کو ستا سکتی ہے۔ فیصلہ کن واقعہ ۱۷۵۲ء میں پیش آیا۔ ماپرٹوے مشہور ریاضیاتی جس کو فریڈرک نے بہت سے اور اہل علم کے ساتھ فرانس سے اس لیے بلوایا تھا کہ اہل علم کے براہِ راست تعلق سے ممکن ہے جرمن ذہن بیدار ہو جائے۔ اس کا ایک ماتحت جرمن ریاضیاتی کونگ سے نیوٹن کے ایک مطلب کے متعلق اختلاف ہو گیا۔ اس قضیے میں فریڈرک ماپرٹوے کی تائید میں شریک ہو گیا اور والٹیر نے جو محتاط ہونے کی نسبت دلیر زیادہ تھا کونگ کی طرف سے اس میں شرکت کی۔ اس نے مادام ڈینس کو لکھا ہے کہ بدقسمتی سے میں بھی مصنف ہوں اور اس گروہ میں داخل ہوں جو بادشاہ کی مخالف جماعت کا ہے۔

میں عصائے حکومت تو نہیں رکھتا مگر میں قلم رکھتا ہوں"۔ تقریباً اسی وقت فریڈرک اپنی بہن کو لکھ رہا تھا۔ "میرے اہل علم وفضل میں شیطان حلول کر گیا ہے، ان کا کچھ علاج نہیں۔ ان لوگوں میں معاشرت کے علاوہ اور کسی قسم کی عقل نہیں ہے .... حیوانوں کو بھی یہ دیکھ کر اطمینان ہوتا ہوگا کہ صاحب ذہانت انسان بھی اکثر انھیں جیسے ہوتے ہیں" اسی زمانے میں والٹیر نے ماپرتوئے کے خلاف اپنا مشہور (Diatribe of Dr. Akakia) لکھا، اس نے اس کو فریڈرک کو سنایا، جو اس پر ساری رات ہنستا رہا، مگر والٹیر سے التجا کی کہ اس کو شائع نہ کرے۔ والٹیر بظاہر مان گیا۔ مگر واقعہ یہ تھا کہ وہ اس کو مطبع کو بھیج چکا تھا، اور مصنف اپنے آپ کو اپنے فرزندان علمی کے قتل پر آمادہ نہ کر سکا، جب یہ شائع ہوا تو فریڈرک تو جل ہی اٹھا اور والٹیر اس آگ سے بچ کر بھاگا۔

فرینکفورٹ میں اگرچہ یہ مقام فریڈرک کی قلم رو سے بالکل باہر تھا۔ بادشاہ کے گماشتوں نے اسے پکڑ کر گرفتار کر لیا۔ اور اس سے کہا گیا کہ وہ اس وقت تک آگے نہیں جا سکتا، جب تک فریڈرک کی نظم (The Palladium) حوالے نہ کر دے، جو ابھی مہذب سوسائٹی میں شائع ہونے کے لائق نہیں بنائی گئی ہے۔ اور خود والٹیر کی بھتیجی کو گرفتار کر لیا۔ لیکن وہ مسودہ ایک ایک بکس میں تھا۔ جو راستے میں رہ گیا تھا، اور جب تک یہ آٹھ ہفتے گزر گئے اور اس وقت تک والٹیر تقریباً قید کی حالت میں رکھا گیا۔ ایک کتب فروش نے جس کا کچھ روپیہ والٹیر کے ذمے تھا اس موقع کو اپنے بقایا کے تقاضے کے لیے مناسب خیال کیا۔ ۲۸۰
والٹیر کو بہت ہی غصہ آیا اور اس نے اس کے کان پر ایک چپت رسید کر دیا۔ اس پر والٹیر کے سکریٹری کا نسی نے اسے یہ کہہ کر تشفی دی، کہ جناب آپ کے کان پر گھونسہ دنیا کے ایک سب سے بڑے آدمی نے رسید کیا ہے"۔

آخر کار رہا ہونے کے بعد وہ سرحد عبور کر کے فرانس میں داخل ہی ہونے والا تھا، کہ اس کو اطلاع ملی کہ اس کو جلاوطن کر دیا گیا ہے۔ بوڑھے آدمی کو اس وقت یہ بھی نہ معلوم تھا کہ کس طرف کا رُخ کرے۔ کچھ دیر تو اس نے پینسلونیبا جانے کا ارادہ کیا ——— اس سے اسکی حالت کا اندازہ ہوسکتا

ہے۔) اس نے مارچ ۱۷۵۸ء جنیوا کے گرد و نواح میں ایک آرام دہ مقبرے کی تلاش میں گزارا جہاں وہ پیرس اور برلن کے مطلق العنان بادشاہوں سے محفوظ رہ سکے۔ آخر کار اس نے ایک پرانی جائداد لیس ڈیلکیز خرید لی، اور اپنے باغ میں کاشت کرنے اور اپنی صحت کو بہتر بنانے کے لیے مقیم ہو گیا، اور جب اس کی زندگی بڑھاپے کی طرف جا رہی تھی، تو اپنے سب سے بڑے اور سب سے شریف کام کے دور میں داخل ہوا۔

۵۔ لیس ڈیلکیز

اس نئی جلاوطنی کا سبب کیا تھا؟ اس نے برلن میں اپنی تصانیف میں سب سے ضخیم سب سے مخصوص اور سب سے زیادہ جسارت آمیز کتاب "شائع کی تھی" اس کا نام بھی کچھ مختصر نہ تھا، شارلیمن سے لوئی سیزدہم تک اقوام کے اخلاق اور جذبے کے اوپر ایک مضمون۔ اس نے اس کو سیرے میں مادام دو شاتلے کے لیے شروع کیا تھا۔ وہ تاریخ کی بہت مذمت کرتی تھی، اس لیے اس کام کے لیے اور بھی زیادہ کوشش کی تاریخ کے متعلق وہ لکھتی ہے۔ "یہ ایک پرانی جنتری ہے۔ میں ایک فرانسیسی عورت ہوں اور اپنی جاگیر پر اپنی بسر اوقات کرتی ہوں مجھے یہ جاننے سے کیا فائدہ کہ سویڈن میں ہاکوئن کے بعد ایگل تخت نشین ہوا، یا عثمان ارطغرل کا بیٹا تھا۔ میں نے یونانیوں اور رومیوں کی تاریخ کو دلچسپی سے پڑھا ہے۔ یہ میرے لیے چند تصویریں پیش کرتی تھی، جو میرے لیے جاذب توجہ تھیں۔ لیکن میں جدید اقوام میں سے کسی کی کبھی کوئی طویل تاریخ ختم نہیں کر سکی ہوں۔ مجھے ان میں گڑ بڑ کے علاوہ اور کچھ کبھی نظر ہی نہیں آتا۔ لاکھوں چھوٹے چھوٹے غیر مربوط و غیر مسلسل واقعات ہوتے ہیں، ہزاروں لڑائیاں ہوتی ہیں جن سے کسی بات کا بھی تصفیہ نہیں ہوتا۔ میں نے اس فن کو ترک کر دیا ہے جو ذہن کو پریشان کرتا ہے مگر اس میں

روشنی پیدا نہیں کرتا۔
والٹیر نے اس سے اتفاق کر لیا تھا۔ اس نے اپنے اینجنو کے زبان سے کہلایا تھا کہ تاریخ جرائم اور مصائب کی تصویر کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے، اور وہ ہوریس ویلپول کو (۱۵ جولائی ۱۷۶۸ء) لکھنے والا تھا کہ "حقیقت یہ ہے کہ یارک اور لینکیسٹر اور بہت سے دوسرے خاندانوں کی تاریخ کا پڑھنا ایسا ہے جیسا کہ قزاقوں کی تاریخ کا پڑھنا"۔ مگر اس نے مادام دوشاتلے سے اس کی امید ظاہر کی تھی، کہ اس پیچیدگی سے باہر نکلنے کی یہ صورت ہو سکتی ہے کہ تاریخ میں فلسفے سے کام لیا جائے، اور سیاسی واقعات کے تحول کی تہ میں ذہن انسانی کی تاریخ کی جستجو کی جائے۔ وہ کہتا ہے کہ صرف فلاسفہ کو تاریخ لکھنی چاہئے۔ تمام اقوام میں اس وقت تک تاریخ کو افسانے نے مسخ کیا ہے، جب تک فلسفہ اپنی روشنی لے کر نہیں آیا ہے، اور جب آخر کار آجاتا ہے تو یہ ذہن انسانی کو صدیوں کی غلطیوں کی وجہ سے اس قدر اندھا پاتا ہے کہ بمشکل ہی اس کو حقیقت کا یقین دلا سکتا ہے۔ یہ جھوٹی باتوں کے ثابت کرنے کے لیے رسوم واقعات اور آثار کے انبار کے انبار پاتا ہے۔ بہر حال تاریخ فریبوں کے مجموعے کے علاوہ نہیں ہے، جو ہم مُردوں کو دیتے ہیں"۔ ہم ماضی کو اس طرح سے بدل دیتے ہیں کہ مستقبل کے لیے ہماری منشا کے مطابق ہو جائے، اور نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ تاریخ سے ثابت ہے کہ ہر شے تاریخ سے ثابت کی جاسکتی ہے"۔
اس نے دروغ کے اس بحر ذخار سے نوع انسان کی حقیقی تاریخ کے متعلق سچائی کے ذرات جمع کرنے میں ایک کان کن کی سی محنت کی۔ برسوں اس نے اپنے آپ ابتدائی مطالعوں میں مصروف رکھا۔ تاریخ روس، تاریخ عہد چارلس دوازدہم، تاریخ عہد لوئی چہاردہم، تاریخ عہد لوئی پانزدہم، اور ان محنتوں سے اس نے اپنے اندر وہ اَن تھک عقلی ضمیر پیدا کر لیا جو ایک انسان کو طباع بنانے کے لیے غلام بناتا ہے۔
۲۴۲ پیرے ڈینیل جیسوئٹ جس نے تاریخ فرانس لکھی ہے، اس کے سامنے پیرس کے شاہی کتب خانے کی بارہ ہزار دستاویزیں اور مخطوطات تھے، ان کے دیکھنے میں اس نے گھنٹہ سوا گھنٹہ صرف کیا، اور پھر فادر تورناس (جو والٹیر کا

پہلے زمانے میں استاد بھی رہ چکا تھا) کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ یہ بیکار فرسودہ کاغذ ہیں، مجھے اپنی تاریخ کے لکھنے کے لیے ان کی ضرورت نہیں"۔ مگر والٹیر کا حال یہ نہ تھا۔ اس نے اپنے مضوع پر ہر وہ چیز جو اس کو دستیاب ہو سکی اس کا مطالعہ کیا، اس نے وقائع کی سینکڑوں جلدوں کو پڑھ ڈالا اور مشہور واقعات کے دیکھنے والوں میں سے جو لوگ زندہ باقی رہ گئے تھے ان کو خطوط لکھے، اور اپنی کتاب کے شائع ہونے بعد بھی مطالعے میں مصروف رہا، اور ہر طبع پر کتاب کی اصلاح کی۔

لیکن یہ جمع مواد محض ایک ابتدائی کارروائی تھی، جس چیز کی ضرورت تھی وہ ترتیب اور انتخاب کا نیا طریقہ تھا۔ محض واقعات کارآمد نہ ہو سکتے تھے، اگر وہ جیساکہ شاذ ونادر ہی ہوتا ہے واقعات بھی ہوں۔ بے نتیجہ تفصیل تاریخ سے وہی نسبت رکھتی ہے، جو خیمہ وخرگاہ کو فوج سے ہوتی ہے۔ ہم کو اشیا پر اجمالی نظر ڈالنی چاہیئے محض اس وجہ سے کہ ذہن انسانی بہت چھوٹا ہے اور تفصیل کے بار میں دب جاتا ہے۔ واقعات کو واقعہ نگاروں کو جمع کرنا چاہیئے اور ان کو ایک قسم کی تاریخی لغت میں مرتب کر دینا چاہیئے تاکہ اس میں بروقت ضرورت کوئی شخص ایک واقعے کو اس طرح سے تلاش کر سکے، جس طرح الفاظ کو تلاش کیا جاتا ہے۔ والٹیر کو ایک اصول وحدت کی تلاش تھی، جس کے ذریعے سے یورپ کی کل تاریخ تمدن کو ایک تار سے بنا جا سکے، اور اسے یقین تھا کہ یہ تار تاریخ تمدن ہے۔ اس نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ میری تاریخ میں بادشاہوں کا ذکر نہ ہو بلکہ تحریکات قوتوں اور عوام کا ذکر ہو۔ یہ اقوام سے نہیں بلکہ نسل انسانی سے بحث کرے، اور لڑائیاں نہیں بلکہ ذہن انسانی کی رفتار اس کا موضوع ہو۔ لڑائیاں اور انقلابات اس کا سب سے مختصر جزو ہوں۔ دستے اور رسالے فتح کرنا یا مفتوح ہونا شہروں کا قبضے میں آنا یا چھن جانا، ایسی باتیں ہیں جو ہر تاریخ میں ہوتی ہیں .... اگر کسی عہد سے فنون اور ذہنی ترقی کو خارج کر لو تو تمھیں اس کے اندر کوئی ایسی بات نہ ملے گی جو متاخرین کی توجہ کو اپنی جانب منعطف کر سکے"۔ میں لڑائیوں کی تاریخ نہیں لکھنا چاہتا بلکہ معاشرے کی تاریخ لکھنا چاہتا ہوں۔ اور اس بات کی تحقیق کرنا چاہتا ہوں ۴۳
کہ لوگوں نے اپنے خاندانوں میں کس طرح سے زندگی بسر کی ہے اور عام طور پر وہ کن فنون کی طرف راغب تھے...... میرا مقصد

ذہن کی تاریخ ہے، اور محض چھوٹے چھوٹے واقعات کی تفصیل نہیں ہے، اور نہ مجھے بڑے امرا کی تاریخ سے بحث ہے۔ بلکہ میں تو یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کن راہوں سے چل کر لوگ بربریت سے تمدن تک آئے ہیں۔ تاریخ سے بادشاہوں کے ذکر کا یہ اخراج اس جمہوری بغاوت کا جزو تھا جس نے آخر کار ان کو حکومت سے خارج کر دیا (Essai sur les Mœurs) سے خاندان بوربون کی معزولی شروع ہو گئی تھی۔

اس طرح سے اس نے فلسفۂ تاریخ پر پہلی کتاب تصنیف کی جو فطری تعلیل کے ان سرچشموں کے پتا چلانے کی پہلی باقاعدہ کوشش ہے جن سے یورپی ذہن کا ارتقا ہوا ہے۔ توقع یہ کی جاتی تھی کہ اس قسم کا اختبار فوق الفطرت توجیہات کے ترک کے بعد ہونا چاہئے تھا۔ دینیات کے مغلوب ہونے سے پہلے تاریخ اپنی اصلی حالت میں نہیں آسکتی تھی۔ بکل کے قول کے مطابق والٹیر کی کتاب نے فن تاریخ کی بنیاد رکھی ہے۔ گبن نیبوہر بکل اور گروٹ اس کے رہین منت اور تتبع ہیں۔ وہ ان سب کا سرچشمہ تھا، اور اب تک اس میدان میں جس کا اس نے انکشاف کیا تھا عدیم المثال ہے۔

لیکن اس کی سب سے عمدہ کتاب اس کی جلاوطنی کا باعث کیوں ہوئی۔ کیونکہ اظہار حقیقت کی وجہ سے اس سے ہر شخص ناراض ہو گیا۔ پادریوں کو تو اس بات پر خاص طور پر غصہ آیا، کہ اس میں یہ نظریہ پیش کیا گیا تھا جس کو بعد کو گبن نے ترقی دی ہے کہ کفر و جہالت پر عیسائیت کی سریع فتح نے روم کو اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا، اور اس کو اس کے لیے تیار کر دیا تھا کہ یہ حملہ آور اور نقل مکان کرنے والے وحشیوں کے لیے آسان شکار بن جائے۔ اس نے ان کو اس بات سے اور بھی مشتعل کیا کہ اس نے عالم یہود و عالم عیسویت کو اس سے کم جگہ دی جتنی کہ ان کو معمولاً دی جاتی تھی، اور چین ہندوستان اور ایران اور ان کے مذاہب کا بالکل غیر جانب داری کے ساتھ تذکرہ کیا۔ اس نئے تناظر میں ایک وسیع اور نئے عالم کا انکشاف ہوا۔ ہر اعتقاد اضافیت میں فنا ہو گیا۔ لاتمناہی مشرق نے وہ شکل اختیار کر لی جو جغرافیے نے اس کو دی ہے۔ یورپ کو فوراً

اس امر کا احساس ہو گیا کہ یہ ایک ایسے براعظم اور تمدن کی تجربی شاخ ہے جو اس سے
بہت بڑا ہے۔ یہ ایک یورپی کو ایسی مخالف حب وطن بات کے انکشاف پر کیونکر ۲۴۴
معاف کر سکتا تھا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ یہ فرانسیسی جو اپنے آپ کو انسان پہلے اور
فرانسیسی بعد کو خیال کرنے کی جرأت کرتا ہے کبھی پھر فرانس کی سرزمین پر قدم نہ رکھے۔

۶۔ فرنے کینڈڈ

لیس ڈیلیسز ایک عارضی وطن اور ایسا مرکز تھا جس سے والٹیر نسبتہً مستقل جائے پناہ کی توقع کر سکتا تھا۔ یہ جائے پناہ اس کو ۱۷۵۸ء میں فرنے میں ملی، جو فرانس کے قریب سوئٹستانی سرحد کے اندر واقع ہے۔ یہاں وہ فرانسیسی قوت سے محفوظ رہیگا اور اس کے فرانسیسی جائے پناہ سے اس قدر قریب بھی ہو گا کہ اگر سوئٹستانی حکومت پریشان کرے تو اس میں پناہ لے سکے۔ اس آخری تغیر نے اس کی آوارہ گردی کو ختم کر دیا۔ وہ جو اِدھر اُدھر دوڑتا پھرتا تھا تو اس کی وجہ محض اس کی عصبی بےچینی ہی نہ تھی۔ ان سے اس کے ہر جگہ غیر محفوظ ہونے کا بھی پتا چلتا تھا۔ بارے چونسٹھ سال کی عمر میں اس کو ایک ایسا گھر ملا جو اس کا وطن بھی ہو سکتا تھا۔ اس کے ایک افسانے کے ختم پر ایک عبارت ہے اور یہ "سیکرمینٹیڈ کے سفروں" کے متعلق جو اس کے مصنف پر بھی صادق آتی ہے "چونکہ دنیا میں جس قدر بیش قیمت اور خوبصورت چیزیں ہیں ان سب کو دیکھ چکا ہوں اس لیے آیندہ کے لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اپنے گھر کے علاوہ اور کسی چیز کو نہ دیکھوں۔ میں نے ایک عورت سے شادی کر لی، مگر جلد ہی مجھے یہ شبہہ ہونے لگا کہ وہ مجھے دھوکا دے رہی ہے، مگر باوجود اس شبہے کے مجھے پھر بھی یہی معلوم ہوا کہ زندگی کی تمام حالتوں میں سے یہی حالت بہترین ہے"۔ وہ بیوی تو نہ رکھتا تھا، مگر اس کے ایک بھانجی تھی جو ایک طباع کے لیے بیوی سے بہتر ہے۔ ہم نے یہ کبھی نہیں سنا کہ وہ پیرس آنے کی خواہش رکھتا تھا .... اور اس میں شک نہیں کہ

اس دانشمندانہ جلاوطنی نے اس کے زندگی کے دن بڑھا دیے"۔
وہ اپنے باغ میں خوش تھا، اور ثمردار درخت لگاتا رہتا تھا، جن کے پھلتے پھولتے دیکھنے کی اس کو توقع نہ تھی۔ جب ایک مداح نے اس کام کی تعریف کی جو اس نے آیندہ نسلوں کے لیے انجام دیا تھا تو اس نے جواب دیا "ہاں میں نے چار ہزار درخت لگائے ہیں۔ وہ سب سے مہربانی سے گفتگو کرتا تھا لیکن اگر کوئی اس کو چھیڑتا تھا تو اس کو سخت جواب دیے بغیر نہ رہتا تھا۔ ایک روز اس نے ایک ملاقاتی سے پوچھا کہ آپ کہاں سے آرہے ہیں، مسٹر ہالر کے یہاں سے، اس نے جواب دیا۔ والٹیر نے کہا وہ بڑا آدمی ہے، وہ بڑا شاعر ہے، بڑا حکیم ہے، بڑا فلسفی ہے اور تقریباً ہر میدان میں طباع کا درجہ رکھتا ہے۔ اس نے کہا آپ جو فرماتے ہیں وہ اس لیے اور بھی زیادہ قابل تعریف ہے کہ مسٹر ہالر آپ کی نسبت عمدہ رائے نہیں رکھتے۔ والٹیر نے کہا ہاں ممکن ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے متعلق غلطی میں مبتلا ہوں۔ ۲۸۵

اب فرنے دنیا کا علمی دارالسلطنت ہو گیا۔ اس زمانے کا ہر تعلیم یافتہ شخص اور روشن خیال فرمانروا یا تو بذات خود اس کے یہاں حاضری دیتا یا خط و کتابت کے ذریعے سے۔ یہاں پر ارتیابی اہل مذہب روشن خیال اور اشرافی اور فاضل خواتین آتے۔ یہاں پر انگلستان سے گبن اور باز ویل آتے۔ یہاں پر ڈالسبرٹ ہیلوٹیس اور دوسرے روشن خیالی کے مجرم آتے۔ آخر کار والٹیر جیسے شخص کے لیے بھی اس لاتعداد مجمع کی میزبانی بہت گراں ثابت ہوئی۔ اس نے شکایت کی کہ اس کا گھر کل یورپ کا بھٹیار خانہ بن گیا ہے۔ ایک ملاقاتی سے، جس نے اطلاع دی تھی کہ وہ چھ ہفتے کے لیے آرہا ہے اس نے کہا کہ آپ میں اور ڈان کوئکزٹ میں کیا فرق ہے۔ وہ سرایوں کو قلعے سمجھ لیا کرتا تھا، اور تم نے قلعے کو سرائے سمجھ لیا ہے۔ آخر میں اس نے کہا کہ خدا مجھ کو میرے دوستوں سے محفوظ رکھے، دشمنوں سے میں اپنی حفاظت خود کرلوں گا۔

اس مستقل میزبانی کے علاوہ خط و کتابت اتنی تھی جتنی کہ دنیا میں شاید ہی کبھی ہوئی ہو اور پھر نہایت ہی اعلیٰ درجے کی۔ ہر قسم اور ہر حال کے آدمیوں کے

خطوط آتے تھے۔ جرمنی کے ایک حاکم شہر نے والٹیر سے دریافت کیا کہ کیا خدا کا وجود ہے یا نہیں، اور بواپسی جواب مانگا۔ گسٹاوس سوم والی سویڈن نے اس کو لکھا کہ مجھے تو اسی پر فخر ہے کہ آپ نے شمال کو کسی وقت دیکھا ہے، اور یہ خیال ہمارے لیے یہاں پر ہر طرح کی کوشش کرنے کے لیے بہت زیادہ ہمت افزائی کا موجب ہے۔ کرسچین ہفتم شاہ ڈنمارک نے اس سے اس بات پر معافی چاہی کہ تمام اصلاحات فوراً کیوں رائج نہیں کر دی گئی ہیں۔ کیتھرائن دوئم ملکہ روس اس کو خوبصورت تحائف بھیجتی اور اکثر اس سے خط و کتابت کیا کرتی تھی، اور خطوں میں لکھا کرتی تھی کہ میں امید کرتی ہوں کہ آپ میری نسبت یہ خیال نہ کریں گے کہ میں تنگ کرتی ہوں۔ فریڈرک بھی ایک سال کی خفگی کے بعد پھر نیازمندوں میں داخل ہو گیا اور فرانس کے بادشاہ سے خط و کتابت پھر شروع کر دی۔

اس نے لکھا کہ "آپ نے میرے ساتھ بڑی زیادتیاں کی ہیں۔ میں ان سب کو
معاف کر چکا ہوں، اور ان کو بھول جانا بھی چاہتا ہوں۔ لیکن اگر آپ کو ایسے شخص سے ۲۸۶
سابقہ نہ پڑا ہوتا جو آپ کی طباعی کا دیوانہ وار دلدادہ و شیفتہ ہے تو آپ اس قدر آسانی کے ساتھ فرار نہ ہو سکے ہوتے۔ کیا آپ کچھ حقائق شیریں کے طالب ہیں، بہت اچھا! میں آپ کو کچھ حقائق سے باخبر کرنا چاہتا ہوں۔ میں آپ کی طباعی کی قدر کرتا ہوں جو قرنوں کے بعد پیدا ہوتی ہے، میں آپ کی نظم کا دلدادہ اور آپ کی نثر کا عاشق ہوں .... آپ سے پہلے کسی مصنف کو ایسا ملکہ اور ذوق سلیم میسر نہیں آیا۔ آپ کی گفتگو دلکش ہے۔ آپ جانتے ہیں تفریح و تعلیم دونوں بیک وقت کس طرح سے ہو سکتی ہے۔ جتنے انسانوں کو میں جانتا ہوں ان میں آپ سے زیادہ مزہ لینے والا کوئی نہیں، آپ میں یہ قابلیت ہے کہ آپ جب چاہیں اپنے آپ کو ساری دنیا کا محبوب بنا سکتے ہیں۔ آپ ایسی ذہنی اداؤں کے مالک ہیں کہ آپ آزردہ کر سکتے ہیں، مگر اس کے باوجود جو لوگ آپ کو جانتے ہیں ان کے عفو و محبت کے آپ مستحق ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اگر آپ انسان نہ ہوتے تو آپ ہر طرح سے مکمل ہوتے"۔

ایسے خوش طبع میزبان سے اس کی کس کو توقع ہو سکتی تھی، کہ وہ قنوطیت کا مدعی ہو سکتا ہے۔ جوانی میں جب وہ پیرس میں عیش کر رہا تھا تو باوجود

باسٹل کی سیر کے اس نے زندگی کا دلچسپ زمانہ دیکھا تھا۔ اور اس بے پروائی کے زمانے میں بھی اس نے اس غیر فطری رجائیت سے بغاوت کی تھی جس کو لائبنز نے رواج دیا تھا۔ ایک جوشیلے نوجوان نے لائبنز کی تائید میں والٹیر کے خلاف ایک رسالہ لکھ کر شائع کیا تھا، اور اس میں اس امر کے ثابت کرنے کی پر زور کوشش کی تھی یہ دنیا ہی سب سے بہتر ہے۔ والٹیر نے اس کو لکھا کہ جناب مجھے یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ آپ نے میرے خلاف ایک چھوٹی سی کتاب لکھی ہے۔ آپ نے میری بہت زیادہ عزت افزائی فرمائی ہے .... جب آپ نظم یا نثر میں یہ ثابت کر دیں گے کہ ممکنہ عالموں میں سے بہترین عالم میں اتنے بہت سے آدمی کیوں ایک دوسرے کے گلے کاٹتے ہیں تو میں بہت ہی ممنوں ہوں گا۔ میں آپ کے دلائل آپ کے اشعار اور آپ کی گالیوں کا منتظر ہوں، اور نہ دل سے آپ کو اس امر کا یقین دلاتا ہوں، کہ اس معاملے کے متعلق ہم دونوں میں سے کوئی بھی کچھ نہیں جانتا میں ہوں جناب آپ کا" وغیرہ۔

تعذیر اور رفع ادہام نے اس کے یقین حیات کو فرسودہ کر دیا تھا، اور برلن اور فرینکفورٹ میں جو اس کو تجربات ہوئے تھے انھوں نے اس کی امید کو کند کر دیا تھا۔ لیکن نومبر ۱۷۵۵ء جب لزبن کے زلزلے کی خوفناک خبر آئی جس میں ۳۰۰۰۰ ہزار آدمی مر گئے تھے، تو یقین و امید دونوں کو سخت نقصان پہنچا، زلزلہ آل سینٹس کے دن ہوا تھا، گرجا عبادت گزاروں سے بھرے ہوئے تھے، ۲۴۷
اور موت نے اپنے دشمنوں کو جو یکجا مجتمع دیکھا تو خوب قتل عام کیا۔ والٹیر کو یہ خبر سن کر بہت صدمہ ہوا، اور جب اس نے سنا کہ فرانسیسی پادری اس کو لزبن کے باشندوں کے گناہوں کی سزا بتا رہے ہیں تو بہت بگڑا اور ایک بہت جوشیلی نظم میں اپنے جذبات کا اظہار کیا، جس میں اس ذوالجہتین کو نہایت شدت کے ساتھ پیش کیا۔ یا تو خدا شر کو روک سکتا ہے اور روکتا نہیں ہے یا وہ روکنا چاہتا ہے اور روک نہیں سکتا۔ وہ اسپی نوزا کے اس جواب سے مطمئن نہ تھا کہ خیر و شر انسانی اصطلاحات ہیں، جن کا کائنات پر اطلاق نہیں ہو سکتا، اور یہ کہ ہمارے حزنیۂ ابد کے تناظر میں بالکل حقیر سی چیزیں ہوتے ہیں۔

میں ایک عظیم کل کا بہت چھوٹا جزو ہوں۔
ہاں۔ لیکن تمام جاندار جن کو زندگی کی سزا دی گئی ہے
تمام ذی حس چیزیں، جو اسی سخت قانون سے عالم وجود میں آتی ہیں
میری طرح سے تکلیف اٹھاتی اور میری ہی طرح سے مرتی ہیں
گدھ اپنے ڈرپوک شکار پر حملہ آور ہوتا ہے،
اور اپنی خونی چونچ اس کے کانپتے ہوئے اعضا میں بھونک دیتا ہے
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو مزے میں رہا، مگر تھوڑی دیر میں
ایک عقاب گدھ کو پارہ پارہ کر دیتا ہے
عقاب آدمی کے تیر کا شکار ہوتا ہے،
آدمی میدان جنگ کی خاک پر گر کر
اپنا خون اپنے ساتھیوں کے خون کے ساتھ ملاتا ہے
اور اپنی باری میں مردار خوار پرندوں کی غذا بن جاتا ہے۔
اس طرح سے دنیا کے ہر فرد سے یہی صدا نکلتی ہے کہ
سب کے سب تکلیف یا باہمی موت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں
اور اس خوفناک ابتری کے متعلق تم یہ کہو گے کہ
ہر ایک کی تکلیفوں سے مل کر سب کی خیر بنتی ہے۔
کیسی رحمت ہے! اور گویا کانپتی ہوئی آواز ہے
تم جو فانی اور قابل رحم ہو چلاتے ہو کہ سب ٹھیک ہے
کائنات تمھیں جھٹلاتی ہے، اور تمھارا قلب ہزار مرتبہ
تمھارے ذہن کے دھوکے کی تردید کرتا ہے ....
وسیع ترین ذہن کا کیا فیصلہ ہے؟
خاموش! کتاب تقدیر ہمارے لیے بند ہے
انسان خود اپنی تحقیق سے ناواقف ہے۔
نہ وہ یہ جانتا ہے کہ وہ کدھر سے آتا ہے اور نہ یہ کدھر جاتا ہے
کیچڑ کے اندر ستائے ہوئے سالمات

جن کو موت کھاتی اور جن پہ تقدیر تمسخر کرتی ہے۔
مگر یہ سالمات ذی فکر بھی ہیں جن کی دوربین آنکھوں،
سے افکار کی رہبری میں دھندلے ستاروں کو بھی ناپا ہے، ۳۴۸
ہمارا وجود ذات لامحدود کے ساتھ مل جاتا ہے،
خود اپنے آپ کو نہ ہم کبھی دیکھتے ہیں اور نہ کبھی جانتے ہیں،
یہ دنیا یہ تماشاگاہ غرور وظلم،
بیمار احمقوں سے بھری پڑی ہے جو مسرت کا ذکر کرتے ہیں ......
کسی زمانے میں میں نے کمتر غمگین آواز میں،
لذت کے عام اصول کے پرمسرت طریقوں کو گایا ہے،
مگر زمانہ بدل چکا ہے اور عمر کے بڑھنے اور نوع انسان کی نزاکت،
میں حصہ دار ہونے کی وجہ سے،
گہری ہوتی ہوئی تاریکی میں، ایک روشنی کو تلاش کرتے ہوئے،
یہ سیکھا ہے کہ میں تکلیف تو اٹھا سکتا ہوں مگر ہائے ہائے نہ کروں گا

چند ماہ کے بعد جنگ ہفت سالہ کا آغاز ہو گیا۔ والٹیر نے اس کو دیوانگی، اور محض اس کا تصفیہ کرنے کے لیے یورپ کی بربادی خیال کیا کہ آیا کنیڈا میں چند ایکڑ فرانس کو حاصل ہو، یا انگلستان کو۔ اس پر مستزاد یہ کہ لزبن والی نظم کا جین جیکس روسو نے جواب دیا۔ روسو نے کہا کہ اس تباہی کا الزام خود انسان پر وارد ہوتا ہے۔ اگر ہم میدانوں میں رہتے اور شہروں میں نہ رہتے تو اتنی بڑی تعداد میں نہ مارے جاتے۔ اگر ہم آسمان کے نیچے رہتے اور گھروں کے اندر نہ رہتے تو ہم پر گھر نہ گرے ہوتے۔ والٹیر کو تقدیر الہٰی کی اس حمایت کو جو مقبولیت حاصل ہوئی اس پر بہت تعجب ہوا۔ اور اس پر ناراض ہو کر کہ اس کے نام کو ایسا مسخرا خاک میں ملائے اس نے روسو کے خلاف وہ خوفناک علمی ہتھیار استعمال کئے جو کبھی کسی انسان نے استعمال کئے ہیں یعنے مضحکہ والٹیر، ۱۷۵۹ء میں تین دن کے اندر اس نے کینڈڈے لکھا۔

قنوطیت پر اس قدر دلچسپ بحث کبھی نہ ہوئی تھی انسان یہ جانتے ہوئے

یہ دنیا دار المحن ہے کبھی اس قدر ہنسا تھا اور بہت کم کوئی کہانی اس قدر سادہ مگر مخفی ہنر کے ساتھ کہی گئی ہوگی۔ یہ خالص تذکرہ اور مکالمہ ہے۔ اس میں مناظر وغیرہ کا بیان مطلق نہیں ہے۔ اناطول فرانس کہتا ہے کہ والٹیر کی انگلیوں میں قلم ہنستا ہوا دوڑتا ہے' شاید دنیا کے ادب میں یہ سب سے عمدہ مختصر افسانہ ہے۔

۲۴۹ کینڈڈ جیسا کہ اس کے نام سے پتا چلتا ہے ایک سادہ اور ایماندار لڑکا ہے وہ ویسٹ فیلیا کے ایک بڑے نواب بیرن تھنڈرٹین ٹراک کا بیٹا اور فاضل پنگلاس کا شاگرد ہے۔

پنگلاس مابعد الطبیعیاتی دینیاتی کونیات کا پروفیسر تھا۔ وہ کہتا ہے کہ "یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ بہتر غایت کے لیے ہوتا ہے۔ دیکھو ناک عینک کے لیے اور ٹانگیں لمبے موزوں کے لیے بنائی گئی ہیں اور پتھر قلعے تعمیر کرنے کے لیے.......... اور بکرے تمام سال دستر خوان کے لیے گوشت مہیا کرنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ لہذا جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ سب ٹھیک ہے وہ ایک احمقانہ بات کہتے ہیں، بلکہ ان کو یہ کہنا چاہیے کہ سب کچھ بہترین غایت کے لیے ہے۔"

پنگلاس جس وقت یہ تقریر کر رہا تھا قلعے پر بلغاری فوج حملہ کر دیتی ہے۔ اور کینڈڈ گرفتار ہو کر ایک سپاہی بنا دیا جاتا ہے۔
اس سے دائیں بائیں پیا چلانے توپ کا گز کھینچنے اور دبانے حاضر ہونے فیر کرنے فوجی طریق پر چلنے کا کام لیا گیا.......... بہار کے زمانے میں ایک سہلانے دن اس نے ٹہلنے کا ارادہ کیا۔ اور یہ خیال کرکے سیدھا چلے گیا کہ انسانی اور نیز حیوانی نوع کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنی ٹانگوں سے جس طرح چاہے کام لے۔ وہ تقریباً ۲ میل گیا ہوگا کہ چار بہادروں نے جو چھ چھ فٹ لمبے تھے اس کو آلیا اور اس کو باندھ کر حوالات میں لے گئے۔ اس سے دریافت کیا گیا' کہ ان دو صورتوں میں سے وہ کونسی صورت کو ترجیح دے گا' کل رجمنٹ کے سامنے چھتیس کوڑے کھانا' یا ایک ہی دفعہ میں سیسے کی دو گولیاں اپنے دماغ کے اندر داخل کرالینا۔ اس نے کہا کہ انسان صاحب اختیار ہے، اور میں نہ ایک

صورت کو اختیار کرتا ہوں اور نہ دوسری کو، مگر بے سود۔ وہ ان دو صورتوں میں سے ایک کے انتخاب پر مجبور کیا گیا۔ اس نے خدا کے اس عطیے کی بدولت جس کو آزادی کہتے ہیں، چھتیس بار کوڑے کھانے کا خطرہ گوارا کر لیا۔

کینڈڈ بچ نکلتا ہے اور ایک جہاز پر سوار ہو کر لزبن کا رخ کرتا ہے، جہاز پر وہ پروفیسر پینگلاس سے ملتا ہے جو اس کو خبر دیتا ہے کہ تمھارے ماں باپ قتل ہو چکے ہیں اور قلعہ برباد ہو چکا ہے۔ یہ سب لازمی تھا، کیونکہ انفرادی تکالیف سے مل کر اجتماعی خیر بنتی ہے، جتنی انفرادی مصیبت زیادہ
ہوگی اتنی ہی اجتماعی خیر زیادہ ہوگی۔" وہ لزبن ٹھیک اس وقت پہنچتے ہیں کہ ۲۵۰
آتے ہی زلزلے کی مصیبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔" زلزلے کے بعد یہ ایک دوسرے سے اپنا اپنا حال اور مصیبتیں بیان کرتے ہیں، اس پر ایک بوڑھی خادمہ ان کو یقین دلاتی ہے کہ تمھاری مصیبتیں میری مصیبت کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ "سو بار میں خودکشی کرتے کرتے رہ گئی مگر نہ کر سکی کیونکہ میں جان کو عزیز رکھتی تھی، شاید یہ مضحکہ خیز کمزوری ہماری سب سے مہلک خصوصیات میں سے ہے، کیونکہ کیا اس سے زیادہ مہمل کوئی بات ہو سکتی ہے کہ انسان ایسے بار کو اٹھائے پھرے جس کو وہ ہر وقت پھینک سکتا ہو" یا جیسا کہ ایک دوسرا شخص اسی بات کو ظاہر کرتا ہے، اگر سب باتوں کا لحاظ کیا جائے تو وینس کے کشتی راں کی زندگی وینس کے مجسٹریٹ کی زندگی کے مقابلے میں قابل ترجیح ہے۔ مگر میرے خیال میں ان دونوں زندگیوں میں فرق اس قدر کم ہے کہ یہ غور کرنے کی تکلیف گوارا کرنے کے لائق نہیں ہے۔"

کینڈڈ مذہبی عدالت سے بھاگ کر پیراگوئے چلا جاتا ہے۔ وہاں معقولیت وانصاف کا یہ شاہکار دیکھنے میں آتا ہے کہ جیسوئیٹ فادرس کو سب اقتدار حاصل ہے اور عوام کو کچھ بھی نہیں۔ ایک ولندیزی نوآبادی میں اسے ایک حبشی ملتا ہے جس کے ایک ہاتھ اور ایک پاؤں ہے اور کپڑے کے عوض ایک دھجی لپیٹے ہوئے ہے۔ غلام نے اس کی وجہ یہ بیان کی کہ "جب ہم گنوں میں کام کرتے ہیں، اور مشین میں انگلی آجاتی ہے، تو لوگ ہاتھ کاٹ ڈالتے ہیں، اور جب ہم

بھاگ جانے کی کوشش کرتے ہیں تو لوگ پاؤں کاٹ ڈالتے ہیں۔ اس قیمت پر تم لوگ یورپ میں شکر کھاتے ہو۔ کینڈڈے اندرونی علاقے میں جہاں ابھی کسی کا گزر نہیں ہوا بہت سا سونا پاتا ہے وہ ساحل پر واپس آتا ہے اور ایک جہاز کرایہ کرتا ہے لیکن جہاز کا کپتان سب سونے کے بار ہو جانے کے بعد روانہ ہو جاتا ہے اور کینڈڈے کو بندرگاہ پر فلسفہ آرائی کرنے کے لیے چھوڑ جاتا ہے۔ جو کچھ ذرا اور اسا اس کے پاس رہ جاتا ہے اس سے کینڈڈے ایک جہاز پر بورڈو کا ٹکٹ لیتا ہے اور جہاز پر ایک بوڑھے دانا مارٹن سے یہ گفتگو کرتا ہے۔

کینڈڈے نے کہا کیا آپ کی رائے میں انسانوں نے ہمیشہ ایک دوسرے کو اسی طرح قتل کیا ہے جس طرح سے وہ آج کرتے ہیں کیا وہ ہمیشہ سے جھوٹے فریبی غدار احسان فراموش لٹیرے، مخبوط، چور، بدمعاش۔ پیٹو، شرابی بخیل حاسد، حریص، خونخوار، بدگو، عیاش، متعصب مکار اور احمق ہیں؟

مارٹن نے جواب دیا کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ شکروں کو جب کبھی کبوتر مل گئے ہیں انھوں نے ہمیشہ ان کو کھالیا ہے۔

"بلاشبہہ" کینڈڈے نے کہا۔

۲۵۱ مارٹن نے کہا کہ اچھا اگر شکرے کی سیرت ہمیشہ سے وہی ہے تو انسانوں کی سیرت میں کیوں تغیر ہو جائے؟"

کینڈڈے نے جواب دیا مگر انسانوں اور شکروں میں تو بہت بڑا فرق ہے کیونکہ اختیار۔

اس طرح سے بحث کرتے ہوئے وہ بورڈو پہنچے۔

کینڈڈے کے باقی حالات بیان نہیں کر سکتے، جو قرون وسطیٰ کی دینیات اور لائبنزی رجائیت پر ایک مزاحیہ تبصرہ ہے، مختلف قسم کے آدمیوں میں مختلف قسم کی تکالیف کا شکار ہونے کے بعد کینڈڈے آخر کار کاشتکار کی حیثیت سے ترکی میں آباد ہو جاتا ہے اور کہانی استاد اور شاگرد کے مابین ایک آخری مکالمے کے ساتھ ختم ہوتی ہے۔

پنگلاس بعض اوقات کینڈڈے سے کہتا ہے کہ

"اس بہترین عالم میں واقعات ایک سلسلے کے اندر ہوتے ہیں۔ کیونکہ اگر تم شاندار قلعے سے نہ نکالے گئے ہوتے .... اگر تم مذہبی عدالت کے سامنے نہ پیش کئے گئے ہوتے، اگر تم امریکہ نہ گئے ہوتے، .... اگر تمھارا سب سونا ضائع نہ ہو گیا ہوتا، تو تم یہاں محفوظ کئے ہوئے سنگترے اور پستے نہ کھاتے ہوتے۔

کینڈڈ نے جواب دیا کہ یہ تو سب ٹھیک ہے مگر ہم کو اپنے باغ میں کام کرنا چاہیے۔

ف۔ انسائیکلوپیڈیا اور فلسفے کا لغت

کینڈڈ جیسی گستاخانہ کتاب کی مقبولیت سے ہم کو زمانے کے جذبے کا کچھ احساس ہوتا ہے۔ لوئی چہار دہم کی امیرانہ شائستگی باوجود اپنے بھاری بھرکم اسقفوں کے جنھوں نے اس میں بہت کافی حصہ لیا تھا، عقیدے اور روایت پر مضحکہ کرنا سیکھ چکی تھی۔ اصلاح کی ناکامی نے فرانسیسیوں کے لیے معصومیت اور بغاوت کے مابین کوئی درمیانی صورت باقی نہ چھوڑی تھی۔ اور جب کہ جرمنی اور انگلستان اطمینان کے ساتھ مذہبی ارتقا کے دور میں سے گزر رہے تھے، فرانس کے ذہن نے ایسے گرم ایمان سے جس نے ہیوجنٹس کا قتل عام کیا تھا، اس سرد عناد پر آگیا جس سے لامیٹرے ہیلوٹیس ألباک ڈیڈرو نے اپنے آبا کے مذہب پر حملہ ۲۵۲
کیا۔ آؤ ذرا اس ماحول پر نظر ڈالیں جس میں بعد کو والٹیر رہا سہا ہے۔

لامیٹرے (۱۷۰۹ء۔ ۱۷۵۱ء) ایک فوجی طبیب تھا اور روح کی طبیعی تاریخ لکھنے پر برخاست ہو گیا تھا۔ اور ایک اور تصنیف "انسان ایک مشین ہے" سے جلاوطنی کا انعام حاصل کیا تھا، اس نے فریڈرک کے دربار میں پناہ لی تھی جو خود کسی حد تک ترقی یافتہ مفکر تھا، اور اس نے تہیا کر رکھا تھا کہ پیرس کی جدید تہذیب و شائستگی کو اپنے پاس مہیا کرے گا۔ لامیٹرے نے میکانیت کو اختیار کیا جس کو ڈیکارٹ نے اس لڑکے کی طرح سے چھوڑ دیا تھا جس کی انگلیاں جل گئی ہوں۔

اور اس نے جرأت کے ساتھ کہا کہ تمام عالم جس سے انسان بھی مستثنیٰ نہیں ہے مشین ہے۔ روح مادی ہے اور مادہ پر از روح ہے لیکن یہ جو کچھ بھی ہوں یہ ایک دوسرے پر عمل کرتے ہیں، اور اس طرح سے ایک دوسرے کے ساتھ بڑھتے اور زوال پذیر ہوتے ہیں، کہ ان کی اساسی یکسانی اور باہمی متابعت میں شبہے کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ اگر ذہن خالص روح ہے، تو جوش سے جسم میں حرارت کیوں پیدا ہو جاتی اور بخار سے ذہنی اعمال میں کیوں خلل پیدا ہو جاتا ہے۔ تمام عضویوں کا ایک ابتدائی جرثومہ سے عضویہ اور ماحول کے باہمی عمل سے نشو ونما ہوا ہے۔ حیوانات میں ذہانت کیوں ہوتی ہے اور نباتات میں کیوں نہیں ہوتی اس کی وجہ یہ ہے کہ حیوانات کو اپنی غذا کے لیے ادھر ادھر حرکت کرنی پڑتی ہے اور نباتات کے پاس جو کچھ آتا ہے وہ اسی پر اکتفا کر لیتی ہیں۔ انسان سب سے بلند پایہ ذہانت رکھتا ہے کیونکہ اس کی احتیاجات سب سے زیادہ ہوتی ہیں، اور اس کے اندر وسیع ترین حرکت کی قابلیت ہوتی ہے۔ "جن چیزوں میں احتیاج نہیں ہوتی وہ ذہن سے بھی عاری ہوتی ہیں"۔

اگرچہ لامیٹرے کو ان آرا کی بنا پر فرانس سے جلا وطن کر دیا گیا مگر ہیلوٹیس جس نے انھیں آرا کو اپنی کتاب "انسان" کی بنیاد بنایا فرانس کے دولتمند ترین انسانوں میں سے ہو گیا اور عزت و منزلت میں بہت بلند مرتبے پر پہنچ گیا، یہاں ہمیں الحاد کی اخلاقیات نظر آتی ہے جس طرح سے لامیٹرے کے یہاں الحاد کی مابعد الطبیعیات تھی۔ ہر قسم کا عمل انانیت اور محبت نفس کی بنا پر ہوتا ہے بطل تک اس احساس کی پیروی کرتا جو اس کو بڑی سے بڑی لذت سے وابستہ معلوم ہوتا ہے۔ فضیلت ایسی انانیت ہے جس کے اندر دوربین لگی ہوئی ہے۔ ضمیر خدا کی آواز نہیں ہے بلکہ پولیس کا خوف ہے۔ یہ وہ تہ نشین ربت ہے جو ممانعتوں کا دریا جو ہمارے نشو و نما پانے والے ذہن پر والدین اساتذہ اور کتابوں کی طرف سے گرتا ہے، اپنے بعد چھوڑ جاتا ہے۔ اخلاق کی بنیاد دینیات پر نہیں بلکہ عمرانیات پر ہونی چاہیے۔ خیر کا تعین معاشرے کی تغیر پذیر ضروریات سے ہونا چاہیے اور کسی غیر متغیر وحی یا اعتقاد سے نہ ہونا چاہیے۔ ۲۵۳

اس گروہ میں سب سے بڑی شخصیت ڈینس ڈیڈرو کی ہے۔ اس کے خیالات اسی کے قلم کے مختلف رسالوں اور بیرن ڈالباک (Baron d' Holbach) ۱۷۲۳-۸۹- کی کتاب نظام فطرت میں شائع ہوئے ہیں جس کا دیوان خانہ ڈیڈرو کے دائرے کا مرکز تھا۔ ہالباک کہتا ہے کہ اگر ہم ابتدا کی طرف لوٹیں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ دیوتاؤں کی تخلیق جہالت اور خوف کی وجہ سے ہوئی ہے۔ تخیل جوش یا مکاری سے ان کی شکلیں بنتی اور بگڑتی تھیں۔ کمزوری ان کی پرستش کرتی ہے ضعیف الاعتقادی ان کو باقی رکھتی ہے، رواج ان کا احترام کرتا ہے ظلم ان کی حمایت کرتا ہے تاکہ لوگوں کا اندھاپن اپنی اغراض پوری کرے" ڈیڈرو کہتا ہے کہ خدا کا عقیدہ مطلق العنان بادشاہ کی اطاعت سے وابستہ ہے۔ دونوں کا عروج و زوال ساتھ ساتھ ہوتا ہے، اور لوگ اس وقت تک آزاد نہیں ہو سکتے جب تک آخری پادری کی انتڑیوں سے آخری بادشاہ کو پھانسی نہ دیدی جائے گی" زمین اپنی اصلی حیثیت اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتی جب تک جنت کو برباد نہ کر دیا جائیگا ممکن ہے کہ مادیت عالم کے ضرورت سے زیادہ سادہ کر دینے پر مشتمل ہو۔ غالباً کل ذی حیات مادہ جبلت ہوتا ہے، اور وحدت شعور کو مادے اور حرکت میں تحویل کرنا ناممکن ہے۔ لیکن مادیت کلیسا کے خلاف ایک اچھا حربہ ہے، اور اس کو اس وقت تک استعمال کرنا چاہیے جب تک اس سے بہتر حربہ نہ مل جائے فی الحال علم کی اشاعت اور صنعت و حرفت کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے صنعت و حرفت سے امن و اطمینان حاصل ہوگا اور علم ایک جدید اور فطری اخلاق کے عالم وجود میں آنے کا باعث ہوگا۔

یہ وہ تصورات ہیں جن کے پھیلانے کی ڈیڈرو اور ڈی المبرٹ نے اپنے مجموعۂ علوم کے ذریعے سے کوشش کی جس کی جلدیں وہ ایک ایک کر کے ۱۷۵۲ء سے ۱۷۶۲ء تک شائع کرتے رہے۔ کلیسا نے پہلی جلدوں کو ضبط کرا دیا۔ اور جب مخالفت بڑھی تو ڈیڈرو کے ساتھیوں نے اس کو چھوڑ دیا۔ مگر وہ غصے میں بھرا ہوا کام کرتا رہا۔ غصے نے اس کی قوت عمل کو اور بھی بڑھا دیا۔ وہ کہتا ہے کہ میرے نزدیک اس سے زیادہ غیر مہذب اور کوئی شے نہیں ہے جس قدر اہل مذہب کی

عقل کے خلاف مبہم بجواس ہوتی ہے۔ اس کے شجرے سے انسان اس پر غور کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ لوگ عیسائیت کے آغوش میں صرف اس طرح سے آسکتے ہیں جس طرح مویشی کا گلہ اصطبل میں داخل ہوتا ہے۔ یہ بقول پائنے عقل کا دور تھا۔ اس زمانے کے لوگوں کو اس ۲۵۴
بارے میں کبھی شبہ نہ ہوا تھا کہ ہر قسم کی حقیقت اور ہر قسم کی خیر کی آخری انسانی کسوٹی عقل ہی ہے۔ ان کا قول تھا کہ عقل کو آزاد ہو جانے دو، یہ چند نسلوں کے اندر یوٹوپیا تیار کر دے گی۔ ڈیڈرو کو شبہ تک نہ تھا کہ عاشق مزاج و حساس جین جیکس روسو (۱۷۱۲-۱۷۷۸) جس کو اس نے ابھی پیرس سے روشناس کرایا تھا اپنے قلب و دماغ میں عقل کی اس تخت نشینی کے خلاف انقلاب کے تخم لیے پھرتا ہے، ایسا انقلاب جو ایمنویل کانٹ کے پر اثر دقائق کے اسلحہ سے مسلح ہو کر جلد ہی فلسفے کے ہر قلعے کو تسخیر کر لے گا۔

والٹیر جس کو ہر چیز سے دلچسپی تھی، اور جس کو ہر قضیے میں دخل تھا، کچھ عرصے کے لیے مجموعۂ علمی کے حلقے کے اندر پھنس گیا۔ انھوں نے بخوشی اس کو اپنا قائد کہا، اور اسے بھی ان کی یہ تعریف ناپسند نہ ہوئی، اگرچہ اس کے نزدیک ان کے بعض خیالات کی اصلاح کی ضرورت تھی۔ انھوں نے اس سے اپنی عظیم الشان مہم کے لیے مضامین کی فرمائش کی، اور اس پر اس نے اس خوبی اور کثرت سے مضامین لکھنے شروع کیے کہ وہ خوش ہو گئے۔ جب وہ یہ کام ختم کر چکا تو اس نے خود اپنا مخزن علوم لکھنا شروع کر دیا جس کا نام لغت فلسفہ تھا۔ اس نے حروف تہجی کے اعتبار سے ایک ایک موضوع کو لیا، اور بے نظیر جرأت کے ساتھ ہر عنوان کے تحت اپنے علم و حکمت کے بے پایاں خزانے لٹاتا ہے۔ خیال کرو کہ ایک شخص ہر چیز پر لکھتا ہے، اور ساتھ ہی مستند ادب بھی پیدا کرتا جاتا ہے۔ یہ کتاب اس کے رومانی افسانوں کو چھوڑ کر باقی تمام تصانیف میں سب سے زیادہ دلچسپ و دل آویز ہے۔ ہر مضمون اختصار صفائی اور ظرافت کا نمونہ ہے۔ "بعض اشخاص ایک کتاب کے اندر طوالت سے کام لے سکتے ہیں، مگر والٹیر نے سو جلدوں کے اندر اختصار سے کام لیا ہے"[۱] یہاں آکر آخر کار والٹیر ثابت کرتا ہے کہ وہ فلسفی ہے۔

[۱] رابرٹسن صفحہ ۲۸۱۔

وہ بیکن ڈیکارٹ اور لاک اور دور جدید کے ارباب فکر کی طرح سے شک اور (مفروضۃً) صفحہ سادہ سے آغاز کرتا ہے۔ وہ کہتا کہ "میں نے اپنے لیے سینٹ تھامس ساکن ڈیڈمس کو اپنا معیار قرار دیا ہے، جو ہمیشہ اپنے ہاتھوں سے جانچ لینے پر اصرار کیا کرتے تھے[1]"۔ وہ فلسفے کے تمام نظاموں کو مسترد کر دیتا ہے، اور یہ شبہہ کرتا ہے کہ فلسفے میں ہر مذہب کا بانی ایک حد تک عطائی ضرور تھا۔ جس قدر میں آگے بڑھتا جاتا ہوں ۲۵۵
اسی قدر میرے ذہن میں یہ خیال راسخ ہوتا جاتا ہے، کہ فلسفی نظام فلاسفہ سے وہی نسبت رکھتے ہیں جو ناولوں کو عورتوں سے ہوتی ہے۔ وثوق محض عطائیوں کو ہوتا ہے۔ ہمیں اولین اصولوں کا کچھ بھی علم نہیں ہے۔ جب ہم یہ تک نہیں جانتے کہ ہم اپنے بازو کو جب چاہتے ہیں کیوں اور کس طرح سے حرکت دیتے ہیں۔ تو خدا فرشتوں اور ذہنوں کی تعریف کرنا اور یہ جاننا کہ خدا نے اس دنیا کو کیوں پیدا کیا ہے کیا معنے رکھتا ہے۔ شک کوئی بہت خوشگوار حالت نہیں ہے لیکن یقین بالکل مضحکہ خیز شے ہے، میں نہیں جانتا کہ میں کیوں بنایا گیا اور کس طرح سے پیدا ہوا اپنی زندگی کے ایک چوتھائی حصے میں مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ جو کچھ میں دیکھتا سنتا یا محسوس کرتا ہوں اس کے اسباب کیا ہیں .... میں نے اس چیز کو دیکھا ہے جس کو مادہ کہتے ہیں اس کو میں نے ستارے سائرئیس اور خفیف ترین ذرے کی صورت میں دیکھا ہے جس کو خوردبین کے ذریعے سے دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن میں نہیں جانتا کہ یہ مادہ کیا چیز ہے"۔

وہ ایک اچھے برہمن کا قصہ بیان کرتا ہے، جو یہ کہتا ہے "کاش! میں پیدا نہ ہوا ہوتا"۔

میں نے اس سے پوچھا کہ تم ایسا کیوں کہتے ہو۔

اس نے جواب دیا کہ بیالیس سال سے مطالعے میں مصروف ہوں، اور میں دیکھتا ہوں کہ میں نے یہ وقت بالکل ضائع کیا .... مجھے یقین ہے کہ میں مادے کا بنا ہوا ہوں، مگر میں خود کو اس بارے میں کبھی مطمئن نہیں کر سکا کہ وہ

[1] فلسفی لغت طبع نیویارک صفحہ ۱۹۸ جلد نہم ایضاً صفحہ ۲۰۱۔

کیا چیز ہے جو فکر کو پیدا کرتی ہے۔ مجھے اس کا بھی علم نہیں ہے کہ آیا میرا فہم ایک سادہ استعداد ہے، جیسے چلنا یا ہضم کرنا ہے، یا میں اپنے دماغ سے اسی طرح سے سوچتا ہوں جس طرح سے میں ایک شے کو اپنے ہاتھ سے پکڑتا ہوں............ میں بہت کچھ باتیں کرتا ہوں اور جب میں باتیں کر چکتا ہوں تو میں جو کچھ کہہ چکتا ہوں اس پر حیران اور شرمندہ رہ جاتا ہوں"

اسی روز میری اس کی ہمسایہ ایک بڑھیا سے گفتگو ہوئی۔ میں نے اس سے دریافت کیا کیا تم کبھی یہ نہ سمجھ سکنے پر افسردہ رہی ہو کہ تمھاری روح کس طرح سے بنی ہے وہ میرے سوال کو سمجھی بھی نہیں۔ اسے اپنی زندگی میں مختصر ترین لمحے کے لیے ۲۵۶
بھی ان چیزوں کا خیال نہ آیا تھا، جن کے متعلق اچھے برہمن نے خود کو اس قدر تکلیف میں مبتلا کر رکھا تھا۔ وہ تہ دل سے وشنو کے تناسخ کی قائل تھی، اور اگر گنگا کا مقدس پانی منہ ہاتھ دھونے کے لیے روزانہ میسر آجایا کرے تو وہ اپنے آپ کو سب سے خوش قسمت عورت خیال کرے۔ اس کی مسرت سے متاثر ہو کر میں اپنے فلسفی کی طرف لوٹا جس سے میں اس طرح سے مخاطب ہوا۔

کیا تمھیں اپنی بدبختی اور زبون حالی پر شرم نہیں آتی، حالانکہ تم سے پچاس گز سے بھی کم فاصلے پر ایک بڑھیا رہتی ہے جو کسی بات کا خیال نہیں کرتی اور مطمئن ہے۔

اس نے کہا کہ تمھارا خیال صحیح ہے۔ میں نے خود سے ہزاروں مرتبہ کہا ہے کہ میں مطمئن و خوش ہوتا، اگر میں اتنا بے علم ہوتا جتنی کہ میری بوڑھی ہمسائی ہے۔ مگر یہ ایسی خوشی ہے جس کی مجھے خواہش نہیں ہے۔

برہمن کے اس جواب نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔

اگر فلسفے کو مانٹالے (Montagine) کے اس مکمل شک پر بھی ختم ہونا ہے کہ میں کیا جانتا ہوں، پھر بھی یہ انسان کی سب سے بڑی اور سب سے شریف مہم ہے۔ ہمیں علم کی چھوٹی چھوٹی اپنے جھوٹے تخیل سے ہمیشہ نئے نئے فلسفے تراشنے کے بجائے ترقیوں پر ہی اکتفا کرنا چاہیئے۔

وہ ہمیں یہ نہیں کہنا چاہیئے کہ آؤ ایسے اصول ایجاد کریں جن کے ذریعے سے ہم

ہر چیز کی توجیہ کرسکیں۔ بلکہ ہم کو یہ کہنا چاہیے کہ صورت حال کی پوری تحلیل کریں اور اس وقت ہم نہایت انکساری کے ساتھ دیکھیں کہ آیا یہ کسی اصول کے مطابق ہوتی ہے۔ چانسلر بیکن نے وہ شاہراہ دکھادی تھی جو حکمت اختیار کرسکتی ہے۔ مگر بعد میں ڈیکارٹ ظاہر ہوا اور اس نے ٹھیک اس کا الٹا کیا جو اس کو کرنا چاہیے تھا۔ فطرت کا مطالعہ کرنے کے بجائے اس نے اس کے متعلق قیاس اور انداز کرنے شروع کردیے۔ اس بہترین ریاضیاتی نے فلسفے میں صرف افسانے تصنیف کیے۔ حساب سے معلوم کرنا جانچنا تولنا مشاہدہ کرنا ہمارے اختیار میں ہے۔ یہ طبیعی فلسفہ ہے۔ اس کے علاوہ باقی سب دھوکا ہے۔

۵۔ "مکاری کو کچل ڈالو"

٢٥٧ معمولی حالات میں اغلب یہ ہے کہ والٹیر اس مہذب ارتیابیت کے فلسفی سکون سے کبھی باہر نہ آیا ہوتا، اور اپنی بعد کی زندگی کے صبر آزما مباحثوں میں نہ پڑا ہوتا۔ جن اشرافی حلقوں میں اس کی نشست و برخاست تھی، اس کے نقطۂ نظر سے بہت جلد متفق ہوجایا کرتے تھے، اور بحث و مباحثے کے لیے کوئی محرک ہی نہ ملتا تھا۔ مذہب کی مشکلات پر پادری تک بھی اس کے ساتھ ہنستے تھے اور کارڈنل (اسقف) تک بھی یہ خیال کرتے تھے کہ کیا وہ اب بھی اس کو اچھا (Capuchin) نہیں بنا سکتے۔ وہ کون سے اسباب ہیں جنھوں نے اس کو لااوریت کے مہذب ٹنک سے اہل کلیسا کی شدید مخالفت پر آمادہ کردیا جس سے مصالحت کی مطلق گنجائش نہ تھی، اور وہ کلیسائیت کی برائی دور کرنے کے لیے نہ ختم ہونے والی جنگ پر کمربستہ ہوگیا۔

فرنے کے قریب ہی ٹولوز واقع ہے جو اس زمانے میں فرانس کا ساتواں شہر تھا، والٹیر کے زمانے میں کیتھولک پادری اس شہر پر مطلق العنان فرمانروائی کرتے تھے اس شہر میں قانون نانٹیز (Edict of Nantes) کی تنسیخ پر (جس کی رو سے پراٹسٹنٹوں کو عبادت کی آزادی مل گئی تھی) تصاویر کے ذریعے سے یادگار منائی جاتی تھی سینٹ بارتھیلومیو کے قتل عام پر ایک جشن منایا جاتا تھا۔ ٹولوز میں کوئی پراٹسٹنٹ نہ تو وکیل ہو سکتا تھا نہ طبیب

ہو سکتا تھا نہ دوا فروش، پرچونی کتب فروش یا طابع ہو سکتا تھا۔ نہ کوئی کیتھولک کسی پراٹسٹنٹ کو ملازم یا محرر مقرر کر سکتا تھا۔ ۱۷۴۹ء میں ایک عورت پر ۳۰۰۰ فرانک اس خطا پر جرمانہ کیا گیا کہ اس نے ایک پروٹسٹنٹ دائی سے کام لیا تھا۔

اتفاق یہ ہوا کہ جین کالاز ٹولوز کے ایک پراٹسٹنٹ کے ایک لڑکی تھی، جس نے کیتھولک مذہب اختیار کر لیا، اور ایک لڑکا تھا، جس نے غالباً کاروبار میں ناکامی کی وجہ سے خودکشی کر لی۔ ٹولوز میں ایک قانون تھا جس کی رو سے ہر خودکشی کرنے والے کو ٹکٹی پر الٹا برہنہ رکھ کر تمام بازاروں میں گشت کرایا جاتا تھا، اور پھر پھانسی دیدی جاتی تھی۔ اس بے حرمتی سے بیٹے کی لاش کو بچانے کے لیے باپ نے عزیزوں اور دوستوں سے یہ خواہش کی قدرتی موت کی تصدیق کر دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ شہرت ہو گئی کہ باپ نے بیٹے کو کیتھولک ہو جانے سے روکنے کے لیے قتل کر دیا۔ کالاز کو گرفتار کر کے تعذیر کی گئی اور وہ اس کے بعد جلد ہی مر گیا (۱۷۶۱ء)۔ اس کا تباہ حال اور ستم رسیدہ خاندان فرنے کو بھاگ گیا،
۲۵۸ اور والٹیر سے امداد کا خواستگار ہوا۔ اس نے ان کو اپنے گھر میں ٹھیرایا، ان کو تسلی دی اور اسے عقوبت کی قرون وسطی کی سی کہانی سننے پر بہت تعجب ہوا۔

اسی زمانے میں (۱۷۶۲ء) الزبتھ سروینس کی موت واقع ہوئی اور پھر یہ شہرت ہو گئی کہ جیسے ہی وہ اپنے کیتھولک مذہب کے قبول کرنے کا اعلان کرنے والی تھی، اس کو کنوئیں میں دھکیل دیا گیا۔ یہ امر کہ پراٹسٹنٹوں کی ایک کمزور اور مغلوب اقلیت اس طرح سے عمل کرنے کی کس طرح سے جرأت کر سکتی تھی ایک معقول اور قابل لحاظ بات تھی، اور اسی وجہ سے یہ افواہ کے احاطے سے باہر تھی۔ ۱۷۶۵ء میں ایک نوجوان جس کا نام لا بیری تھا اور جس کی عمر صرف سولہ سال تھی، صلیبوں کی شکل بگاڑنے کے جرم میں گرفتار کیا گیا۔ عقوبت کے ذریعے سے اس سے اقبال جرم کرا لیا گیا، اس کا سر کاٹا گیا اور اس کے جسم کو جلایا گیا اور مجمع تحسین و آفریں کرتا رہا۔ والٹیر کی کتاب لغت فلسفہ کا ایک نسخہ لڑکے کے پاس ملا اس کو بھی لڑکے کے ساتھ جلا دیا گیا۔

اپنی عمر میں پہلی مرتبہ والٹیر بالکل سنجیدہ انسان بن گیا۔ ڈی المبرٹ نے مملکت کلیسا اور قوم سب سے بیزار ہو کر لکھا کہ آیندہ سے میں ہر چیز کا مضحکہ اڑایا کروں گا تو والٹیر نے جواب میں لکھا کہ یہ وقت مذاق کا نہیں ہے۔ ظرافت قتل عام کے ساتھ بھلی نہیں معلوم ہوتی۔ کیا یہ فلسفے اور عشرت کا ملک ہے۔ بلکہ یہ تو سینٹ بارتھولومیو کے قتل عام کا ملک ہے۔ زولا اور اناطول فرانس کی طرح سے والٹیر کو اس سفاکانہ بے انصافی نے اٹھا دیا، وہ محض ادیب ہی نہیں رہا، بلکہ میدان عمل میں بھی اتر آیا۔ اس نے فلسفے کو جنگ کی خاطر چھوڑ دیا، بلکہ فلسفے کو بے خطا ڈائنامیٹ میں بدل دیا۔ "اس زمانے میں میرے منہ پر جب کبھی ہنسی آئی میں نے خود کو اس طرح سے ملامت کی۔ جیسے مجھ سے کوئی بہت بڑا جرم سرزد ہو گیا ہو" اسی زمانے میں اس نے اپنا مشہور اصول مکاری کو کچل ڈالو اختیار کیا۔ اور فرانس کی روح کو کلیسا کی خرابیوں کی طرف متوجہ کیا۔ اس نے ایسی علمی آگ برسانی شروع کی جس سے لبادے اور عصا جل گئے، فرانس کے پادریوں کی قوت ٹوٹ گئی اور تخت کے الٹنے کا باعث ہوئی۔ اس نے اپنے دوستوں اور متبعین کو بلایا اور لڑائی کی دعوت دی۔ بہادر ڈیڈرو جری ڈی المبرٹ آؤ متحد ہو جاؤ اور مذہبی مجنونوں اور بدمعاشوں پہ نرغہ کرو، بے مزہ تقریروں منحوس مغالطوں اور جھوٹی تاریخ .... اور لاتعداد لغویات کا خاتمہ کر دو۔ جو لوگ عقل و فہم رکھتے ہیں انھیں لوگوں کا ماتحت نہ بننے دو جو عقل سے بے بہرہ ہیں۔ آنے والی نسل اپنی عقل اور آزادی کے لیے ہماری مرہون منت ہوگی۔ ۲۵۹

ٹھیک اسی موقع پر اسے رشوت دیکر الگ کر لینے کی کوشش کی گئی یا موزل ڈی پمپاڈور کے قبیلے سے اس سے کہلایا گیا کہ اگر وہ کلیسا سے مصالحت کرلے تو اسے کارڈنل کا عہدہ دیدیا جائے گا۔ گویا چند زبان بند۔ پادریوں پر حکومت کرنے سے ایسے شخص کو دلچسپی ہوسکتی تھی جو علم و حکمت کے عالم کا مسلمہ تاجدار تھا۔ والٹیر نے انکار کر دیا اور دوسرے کیٹو کی طرح سے اس نے اپنے تمام خط "مکاری اور بدمعاشی کو کچل ڈالو" سے شروع کیے۔ اس نے اپنی کتاب (Treatise on Toleration) (رسالۂ بے تعصبی) شائع کی۔ اس میں اس نے لکھا کہ میں

اعتقادی لغویات کو برداشت بھی کر لیتا، اگر اہل مذہب نے اپنے وعظ و نصیحت ہی سے
کام رکھا ہوتا اور اختلاف رائے کو گوارا کر لیا ہوتا۔ لیکن ایسے دقائق جن کا کتاب مقدس
میں کہیں پتا تک نہیں ہے، عیسائی تاریخ میں خونی جھگڑوں کا باعث ہیں۔" جو
شخص مجھ سے یہ کہتا ہے کہ جو عقیدہ میرا ہے وہی تم بھی اختیار کرو ورنہ خدا تم کو جہنم کا
کندہ بنائے گا، وہ یہ بھی کہہ دے گا کہ جو عقیدہ میرا ہے وہی تم بھی اختیار کرو نہیں تو
میں تم کو مار ڈالوں گا۔ جو وجود آزاد پیدا کیا گیا ہے وہ کس حق سے دوسرے کو اپنے
جیسے خیال پر مجبور کر سکتا ہے ضعیف الاعتقادی اور جہالت سے جو تعصبی خبط پیدا
ہوتا ہے وہ تمام صدیوں بمنزلہ ایک مرض کے رہا ہے۔ ایسی دائمی مصالحت جس کی
ابی ڈسینٹ پیری نے دعوت دی تھی اس وقت عالم وجود میں نہیں آسکتی
جب تک لوگ ایک دوسرے کے فلسفی سیاسی اور مذہبی اختلافات کو رواداری
سے گوارا کرنے کے لیے تیار نہ ہوں۔ معاشرتی تندرستی کے لیے پہلا قدم یہ ہے کہ پادریوں
کی قوت کو توڑ دیا جائے، جس میں بے تعصبی اپنی جڑیں رکھتی ہے۔

رسائل بے تعصبی کے بعد رسالوں تاریخوں مکالموں خطوں لطیفوں وعظوں
نظموں کہانیوں قصوں تنقیدوں اور مضمونوں کا ایک طوفان آگیا۔ یہ والٹیر کے ۲۶۰
نام سے بھی شائع ہوئے اور سیکڑوں فرضی ناموں سے بھی۔ "یہ پروپیگنڈے کا
حیرت انگیز ہجوم تھا جس کو ایک شخص نے برپا کیا تھا" فلسفہ ایسے واضح اور ایسے
زور کے ساتھ کبھی نہ لکھا گیا تھا۔ والٹیر اس خوبی کے ساتھ لکھتا ہے کہ انسان کو
یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ فلسفے پر خامہ فرسائی کر رہا ہے۔ اس نے انکساری سے
اپنے متعلق کہا ہے کہ میں اپنے خیالات کافی وضاحت کے ساتھ ظاہر کرتا ہوں میری
مثال چھوٹے نالوں کی سی ہے جو اس وجہ سے شفاف معلوم ہوتے ہیں کہ گہرے نہیں
ہوتے" اس کی کتابیں پڑھی گئیں۔ جلد ہی ہر شخص حتیٰ کہ پادریوں کے پاس تک
اس کے رسالے پہنچ گئے۔ ان میں سے بعض تین تین لاکھ بکے، اگرچہ پڑھنے والوں
کی تعداد اب کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ تاریخ ادب میں ایسی کوئی چیز اس سے پہلے
دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ اس نے کہا کہ بڑی کتابوں کا تو اب رواج نہیں رہا ہے"
اس طرح سے ہر ہفتے اور ہر مہینے وہ اپنے چھوٹے سپاہیوں کو میدان جنگ میں

بھیجتا رہا۔ اس کی مستقل مزاجی اور چستی اس کے فکر کی زرخیزی اور ستر سال کی عمر میں اس کا جوش و خروش دنیا کو جتلائے حیرت کر رہا تھا۔ بقول ہیلوشیس والٹیر روبی کون پر سے گزر چکا تھا اور اس وقت وہ روم کے سامنے کھڑا تھا۔

اس نے کتاب مقدس کی صحت و استناد کے متعلق بلند تر انتقاد کا آغاز کیا۔ اس بارے میں وہ اپنے مواد کا کچھ حصہ اسپی نوزا سے اس سے زیادہ انگریز الٰہیہ سے اور سب سے زیادہ باسٹلے (۱۶۴۷-۱۷۰۶) کی انتقادی لغت سے لیا۔ مگر دیکھنے کے لائق بات یہ ہے کہ ان کے مواد کو وہ کس قدر شاندار اور پرجوش بنا دیتا ہے۔ ایک رسالے کا نام ہے "سوالات زپاٹا" زپاٹا جو پادری بننے کا امیدوار ہے معصومیت کے ساتھ پوچھتا ہے یہ ہم کس طرح سے ثابت کریں کہ یہودی جن کو اب ہم سینکڑوں کی تعداد میں جلاتے ہیں چار ہزار برس تک خدا کی برگزیدہ قوم تھے۔ اور وہ ایسے سوالات کا سلسلہ جاری رکھتا ہے جو عہد نامۂ قدیم کے بیان اور تاریخوں کے تضاد کو ظاہر کر دیتے ہیں۔ جب دو مجلسیں ایک دوسرے پر لعنت کرتی ہیں تو ان میں سے کون سی ناقابل خطا ہے۔ آخر کار جب زپاٹا کو کوئی جواب نہ ملا تو اس نے سادگی کے ساتھ خدا کی تلقین شروع کر دی۔ اس نے کہنا شروع کیا کہ خدا سب کا باپ ہے سب کو جزا سزا اور معافی دیتا ہے اس نے صداقت کو جھوٹ سے علیحدہ کیا اور مذہب کو تعصب سے پاک کیا اور نیکی کی تعلیم دینی شروع کی اور خود بھی نیکی پر عامل ہو گیا۔ وہ نیک دل، نیک خو اور منکسر المزاج تھا۔ اور اس کو ۱۶۳۱ء میں ڈالیاڈولد میں جلا دیا گیا۔ ۲۶۱

نبوت کے عنوان کے ذیل میں لغت فلسفہ میں وہ ربین اسحاق کی کتاب (Bulwarke of Faith) (قلعۂ مذہب) سے عبرانی پیشین گوئیوں کے مسیحؑ پر منطبق کرنے کی مخالفت کا اقتباس کرتا ہے، اور پھر طنزاً کہتا ہے کہ اس طرح سے اپنی زبان اور اپنے مذہب کے ان اندھے مفسروں نے کلیسا کی مخالفت کی اور بہ ضد اس امر کے مدعی ہوئے کہ یہ پیشین گوئیاں مسیحؑ سے متعلق نہیں ہو سکتیں۔ وہ خطرناک دن تھے جن میں انسان کو بغیر اس کے کہ اس نے کہا ہو، اس پر مجبور کیا جاتا تھا کہ بتائے اس کی مراد کیا ہے۔ اس زمانے میں انسان کے مقصد و مدعا کا راستہ اور جو کچھ بھی ہو مگر

سیدھا نہ تھا۔ والٹیر عیسائی اعتقادات اور مذہبی رسوم کی اصل کا پتا یونان مصر اور ہندوستان کے اعتقادات اور مذہبی رسوم میں چلاتا ہے، اور اس کے نزدیک قدیم دنیا میں جو عیسائیت کو کامیابی ہوئی اس کا باعث یہ مطابقت نہ تھی۔ مذہب پر جو اس نے مضمون لکھا ہے اس میں وہ عیاری کے ساتھ یہ دریافت کرتا ہے کہ ہمارے مقدس مذہب کے بعد جو بلاشبہہ سب سے بہتر ہے، کونسا مذہب سب سے کم قابل اعتراض ہے۔ اس کے بعد وہ ایسے مذہب اور ایسے طریق عبادت کو پیش کرتا ہے، جو اس کے زمانے کے مذہب کیتھولک کے بالکل مخالف ہے۔ ایک جگہ وہ اپنی غیر معمولی بلند پروازی میں کہتا ہے کہ عیسائیت ضرور خدائی مذہب ہے کیونکہ باوجود اس کے کہ یہ مکاری اور خرافات سے اس قدر بھرا ہوا ہے پھر بھی سترہ سو سال تک باقی رہا ہے۔ وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ تقریباً تمام قدیم اقوام ایسی ہی خرافات کی حامل تھیں، اور جلدی سے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خرافاتی افسانوں کو پادریوں نے اختراع کیا ہے۔ "پہلا مذہبی شخص پہلا بدمعاش تھا جو پہلے احمق سے ملا۔" تاہم جس چیز کو وہ پادریوں سے منسوب کرتا ہے وہ مذہب نہیں بلکہ دینیات ہے۔ دینیات کے خفیف خفیف اختلافات اس قدر تلخ مناقشوں اور مذہبی لڑائیوں کا باعث ہوئے ہیں۔ ان مضحکہ خیز اور مہلک جھگڑوں کا باعث معمولی لوگ نہیں ہوئے ہیں جو اس قدر خوفناک مصائب کا باعث ہیں .... ان لوگوں نے جن کو تمھاری محنتیں کھلاتی پلاتی ہیں آرام و آسائش کے ساتھ رکھتی، جو تمھاری عرق ریزی اور زبون حالی کی بنا پر دولتمند
۲۶۲ بنے بیٹھے ہیں، حامیوں اور غلاموں کی تلاش میں کشمکش کی۔ انھوں نے تم میں مہلک تعصب پیدا کردیا تاکہ وہ تمھارے آقا اور فرمانروا بن سکیں۔ انھوں نے تم کو توہم پرست بنادیا نہ اس لیے کہ تم خدا سے ڈرو بلکہ اس لیے کہ تم ان سے ڈرا کرو۔"

اس سب سے یہ نہ فرض کرلینا چاہئے، کہ والٹیر کا بالکل کوئی مذہب نہ تھا۔ وہ الحاد سے قطعاً منکر ہے، یہاں تک کہ بعض مخزن العلوم اس کے مخالف ہوگئے اور کہنے لگے کہ والٹیر متعصب شخص ہے، وہ خدا کا قائل ہے۔ "جاہل فلسفی" (Ignorant Philosopher) میں وہ ایسی نوزائی وحدت الوجود کی طرف

جاتا ہے، مگر پھر اس سے اس طرح سے بھاگتا ہے کہ جیسے یہ بھی تقریباً الحاد ہی ہو۔ وہ ڈیڈرو کو لکھتا ہے۔

"مجھے اعتراف ہے کہ میں سانڈرسن سے متفق نہیں جو خدا کا اس لیے انکار کرتا ہے کہ وہ اندھا پیدا ہوا تھا۔ شاید مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ لیکن اگر میں اس کی جگہ پر ہوتا تو میں اس عظیم الشان عقل کا اور بھی زیادہ قائل ہوتا جس نے نظر کے عوض میں مجھے اتنے بہت سے بدل دیئے ہیں۔ اور غور کرنے پر جب مجھے ان علایق کا علم ہوتا جو تمام چیزوں کے مابین ہیں، تو مجھے یہی شبہہ ہوتا کہ یہ بہت ہی بڑے کاریگر کا کام ہے۔ اگر اس بات کا پتا چلانے کی کوشش کرنا کہ وہ کیا ہے اور جتنی چیزیں موجود ہیں ان کو اس نے کیوں بنایا ہے، گستاخی ہے تو مجھے اس کے وجود سے انکار کرنا اور بھی بڑی گستاخی معلوم ہوتا ہے۔ مجھے آپ سے ملنے اور باتیں کرنے کا بہت اشتیاق ہے خواہ آپ خود کو اس کی صنعت خیال کریں، یا ایسا ذرہ خیال کریں جو اپنی فطرت کے تقاضے کی بنا پر ابدی اور اٹل مادے سے نکلا ہے۔ آپ جو کچھ بھی ہوں، مگر اس عظیم الشان کل کے ایک قابل قدر جز ہیں جس کے سمجھنے سے میں قاصر ہوں۔

ادلباک کو وہ بتاتا ہے کہ تمھاری کتاب نظام فطرت کا نام ہی یہ بتاتا ہے کہ ایک نظم پیدا کرنے والی الٰہی عقل کا وجود ہے۔ دوسری طرف وہ معجزات اور دعا کی فوق الفطری تاثیر سے شدت سے انکار کرتا ہے۔

"میں ایک خانقاہ کے دروازے پر کھڑا تھا کہ میں نے سنا کہ سسٹر فیسو سسٹر کا نفائٹ سے کہہ رہی ہے کہ قدرت میری خاص نگرانی رکھتی ہے تم جانتی ہو کہ میں چڑیا کو کس قدر عزیز رکھتی ہوں، وہ مر گئی ہوتی اگر میں نے نو مرتبہ اوی میریا کا وظیفہ نہ پڑھا ہوتا .... ایک مابعد الطبیعیاتی نے اس سے کہا کہ بہن ۲۶۳

اوی میریا سے اچھی تو کوئی چیز نہیں ہے خصوصاً جب اس کو ایک لڑکی نواح پیرس میں پڑھتی ہو مگر میری یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اگرچہ تمھاری چڑیا خوبصورت ہے پھر بھی خدا کیوں اس میں مشغول و منہمک رہا ہوگا۔ میری رائے میں تو تمھیں اس پر بھی یقین کرنا چاہیئے کہ اسے اور چیزوں کی طرف بھی توجہ کرنی پڑتی ہوگی ....

سسٹر فیسو نے جواب دیا کہ جناب آپ کی اس تقریر سے بدعت کی بو آ رہی ہے۔

میرا اعتراف گناہ کرانے والا...... اس سے یہ نتیجہ نکالے گا کہ آپ خدا کی قدرت کے قائل نہیں ہیں' مابعد الطبیعیاتی نے جواب دیا پیاری بہن میں عام تقدیر کا قائل ہوں جس نے ابدالآباد سے وہ قانون مقرر کردیا ہے جو تمام اشیا پر اسی طرح جاری و ساری ہے جس طرح سے کہ سورج سے روشنی نکلتی ہے۔ لیکن مجھے اس بات کا یقین نہیں آتا کہ ایک خاص تقدیر تمہاری چڑیا کی خاطر سے اقتضائے عالم میں تغیر پیدا کرتی ہے۔

تقدس مآب جناب اتفاق ہر چیز کا فیصلہ کرتے ہیں۔ اصل عبادت اور دعا اس پر مشتمل نہیں ہے کہ ہم قانون فطرت کی خلاف ورزی کے طالب ہوں' بلکہ اصل عبادت اور دعا اس پر مشتمل ہے کہ ہم قانون فطرت کو خدا کا اٹل حکم سمجھ کر قبول کریں' اسی طرح سے وہ اختیار کا بھی منکر ہے۔ روح کے متعلق وہ لاادریہ میں سے ہے۔ "مابعد الطبیعیات کی چار ہزار کتابیں بھی ہم کو یہ نہیں بتا سکتیں کہ روح کیا ہے۔ ایک بوڑھا انسان ہونے کی بنا پر وہ بقائے روح پر عقیدہ رکھنا چاہتا ہے' مگر وہ اس کو دشوار پاتا ہے۔

کوئی شخص پسو کی بقائے روح کا قائل نہیں ہے' تو پھر ہاتھی بندریا میرے خادم کی روح کے باقی رہنے کو کس طرح سے تسلیم کرلیا جائے۔ ایک بچہ بطن مادر میں ٹھیک اس وقت مرجاتا ہے جب اس کو روح ملتی ہے۔ کیا یہ پھر جنین کی شکل میں آئے گا یا لڑکے کی شکل میں یا پورے انسان کی صورت میں۔ دوبارہ زندہ ہونے کے لیے یعنے اس شخص کی صورت میں ہونے کے لیے جو کہ تم تھے ضرورت اس امر کی ہے کہ تمہارا حافظہ بالکل تازہ اور حاضر ہو۔ کیونکہ تمہاری عینیت صرف تمہارے حافظے سے بنتی ہے۔ اگر تمہاری یاد فنا ہو جائے تو پھر تم کس طرح سے وہی شخص ہو سکتے ہو۔ بنی نوع انسان یہ کیوں سمجھتی ہے کہ صرف اس میں روحی اور لافانی اصول موجود ہے ...... شاید اس کا باعث اس کا غرور ہے۔ مجھے
۲۶۴ یقین ہے اگر مور کو قوت گویائی حاصل ہو جائے تو وہ بھی اپنی روح کی ڈینگ مارے اور یہ کہے کہ میری روح میری دم کے اندر رہتی ہے۔

اور اس ابتدائی مخالفت کے زور میں وہ اس نظریے کو بھی مسترد کر دیتا ہے کہ بقائے روح کا عقیدہ اخلاق کے لیے ضروری ہے۔ قدیم عبرانی جب وہ

برگزیدہ قوم تھے یہ عقیدہ نہیں رکھتے تھے۔ اور ایسی نوع اخلاق کا نمونہ تھا۔
بعد کو اس کی رائے بدل گئی۔ وہ یہ محسوس کرنے لگا کہ خدا کے ماننے میں اس وقت تک کوئی اخلاقی قیمت نہیں ہے جب تک اس کے ساتھ بقا اور جزا و سزا کا عقیدہ نہ ہو۔ شاید عوام کے لیے جزا و سزا دینے والا خدا ضروری ہے۔ بائلے نے سوال کیا تھا کیا ملحدوں کا معاشرہ باقی رہ سکتا ہے؟ والٹیر جواب میں کہتا ہے کہ ہاں اگر وہ فلسفی بھی ہوں لیکن لوگ فلسفی بہت کم ہوا کرتے ہیں۔ اگر ایک گاؤں بھی ہو تو اچھا ہونے کے لیے اس کا ایک مذہب ہونا چاہئے۔ "اے بی سی" میں اے کہتا ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ میرا وکیل میرا درزی اور میری بیوی خدا کی قائل ہو۔ اس طرح سے مجھے خیال ہے کہ میں کم لوٹا جاؤں گا اور کم دھوکا کھاؤں گا۔ اگر خدا کا وجود نہ ہو تو اس کے اختراع کرنے کی ضرورت ہو گی۔ میں زندگی اور مسرت کو صداقت کے مقابلے میں زیادہ اہم سمجھنے لگا ہوں۔ یہ نئی روشنی کے اندر ٹھیک اس نظریے کی حیرت انگیز پیش بینی ہے جس سے ایمینوئیل کانٹ نئی روشنی کا مقابلہ کرنے والا تھا۔ وہ اپنے ملحد دوستوں کے مقابلے میں اپنی نرمی سے مدافعت کرتا ہے۔ لغت میں خدا پر جو مضمون ہے اس میں وہ اولباک سے خطاب کرتا ہے۔

"تم خود کہتے ہو کہ خدا کے عقیدے نے بعض اشخاص کو جرائم سے باز رکھا ہے میرے لیے یہی کافی ہے۔ اگر یہ عقیدہ صرف دس قتلوں اور دس برائیوں کو بھی روکتا ہو تو میری رائے میں تمام دنیا کو اسے اختیار کر لینا چاہئے۔ تم کہتے ہو کہ مذہب بے شمار مصائب کا باعث ہوا ہے۔ ایسا نہیں بلکہ تو ہم ہزارہا مصیبتوں کا باعث ہوا ہے جس کی ہمارے کرّے پر فرمانروائی ہے۔ یہ اس خالص عبادت کا سب سے بے رحم دشمن ہے جو باری تعالیٰ کی ہم پر واجب ہے۔ ہمیں اس عفریت سے نفرت کرنی چاہئے جس نے ہمیشہ اپنی ماں کے سینے میں زخم ڈالے ہیں۔ جو اس کی مخالفت کرتے ہیں وہ نوع انسانی کے محسن ہیں۔ یہ وہ سانپ ہے جو اپنے آغوش میں لے کر مذہب کا دم گھوٹتا ہے۔ ہمیں ماں کو زخمی کیے بغیر اس کا سر کچل ڈالنا چاہئے جس کو یہ کھائے جا رہا ہے۔" ۲۶۵

اس کے نزدیک توہم اور مذہب میں یہ امتیاز اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ وعظ جبل کی دینیات کو بخوشی قبول کر لیتا ہے، اور مسیحؑ کی وہ تعریفیں کرتا ہے جس کا اولیا کے صفحات بھی بمشکل ہی مقابلہ کر سکتے ہیں۔ وہ مسیحؑ کو روشن ضمیروں کے حلقہ میں اشکبار تصور کرتا ہے، جس کا باعث وہ گناہ ہیں جو ان کا نام لے کر کئے گئے ہیں۔ آخر کار وہ اپنا علیحدہ گرجا تعمیر کرتا ہے اور اس پر (Deo erexit Voltaire) لکھواتا ہے وہ کہتا ہے یورپ میں صرف یہی ایسا گرجا ہے جو خدا کے نام پر تعمیر کیا گیا ہے۔ وہ خدا سے ایک نہایت ہی عمدہ دعا کرتا ہے اور (theist) (موحد) کے مضمون میں وہ اپنے مذہب کو آخری تبرہ صاف طور پر بیان کرتا ہے۔

"موحد وہ شخص جس کو خدا کے وجود کا پورا یقین ہوتا ہے" ایسا خدا جو جس قدر قادر و توانا ہے اسی قدر اچھا بھی ہے جس نے تمام چیزوں کو بنایا ہے........ جو بیرحمی کے بغیر تمام جرائم کی سزا دیتا ہے، اور تمام نیک اعمال کی نیکی کے ساتھ جزا دیتا ہے،........ اس اصول کے ساتھ دوبارہ متحد ہو کر، وہ ایسے فرقوں میں سے کسی فرقے سے نہیں ملتا جو ایک دوسرے کی تردید کرتے ہیں۔ اس کا مذہب سب سے قدیم اور سب سے عام ہے۔ کیونکہ خدائے واحد کی سادہ پرستش دنیا کے سب نظاموں سے پہلے سے ہے۔ وہ ایسی زبان بولتا ہے جس کو سب سمجھتے ہیں حالانکہ لوگ ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھتے۔ پیکن سے لے کر کاینے تک اس کے بھائی ہی بھائی ہیں اور وہ تمام اہل حکمت کو اپنے ساتھی سمجھتا ہے۔ اس کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ مذہب نہ تو ناقابل فہم ما بعد الطبیعیات کی رایوں کے اندر ہے اور نہ بیسود مظاہروں اور نمائشوں کے اندر ہے بلکہ مذہب صرف عبادت اور انصاف کے اندر ہے نیکی کرنا اس کی عبادت ہے اور خدا کا تابع و فرمانبردار رہنا اس کا مسلک ہے۔ مسلمان اس سے کہتا ہے دیکھو مکے کا حج نہ چھوٹنے پائے پادری اس سے کہتا ہے، اگر تم نے ناٹرے ڈامے ڈی لارٹیے نہیں دیکھا تو تم پر لعنت ہے۔ وہ لارٹیے اور مکے پر ہنستا ہے، مگر غریبوں کی مدد کرتا ہے اور مظلوموں کی حمایت کرتا ہے۔

۲۶۶

۹۔ والٹیر اور روسو

والٹیر اہل کلیسا کے ظلم کے خلاف جد و جہد کرنے میں اس قدر منہمک تھا کہ اس نے اپنی عمر کے آخری برسوں میں سیاسی خرابی اور ظلم کے خلاف جنگ سے ہاتھ اٹھا لیا تھا۔ "سیاسیات کا مجھ سے تعلق نہیں ہے۔ میں نے ہمیشہ لوگوں کو کم بیوقوف اور زیادہ باعزت بنانے کی کوشش کی ہے۔" وہ جانتا تھا کہ سیاسی فلسفہ کس قدر پیچیدہ معاملہ بن سکتا ہے۔ اس لیے جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی وہ اپنے یقینیات کو ترک کرتا گیا۔ "میں ان لوگوں سے تنگ آگیا ہوں جو کمروں میں بیٹھے ہوئے مملکتوں پر حکومت کرتے ہیں۔ یہ مقننن جو دنیا پر دو پیسے صفحے کے حساب سے حکومت کرتے ہیں ..... اپنی بیویوں اور اپنے گھر پر تو ان سے حکومت ہو نہیں سکتی دنیا کے انتظام سے ان کو بہت دلچسپی ہوتی ہے۔ ان معاملات کا سادہ اور عام ضوابط سے یا ایک طرف تو تمام لوگوں کو بدمعاشوں اور احمقوں میں تقسیم کرکے اور دوسری طرف خود کو رکھ کر فیصلہ کرنا ناممکن ہے۔ وہ ودنیارگس کو لکھتا ہے کہ "صداقت کسی فریق یا جماعت کا نام نہیں ہے۔ تمھارے جیسے انسان کا فرض یہ ہے ترجیح تو دو مگر ترک و خارج نہ کرو۔"

دولتمند ہونے کی وجہ سے وہ تنگ خیالی کی طرف مائل ہے اور اس کی وجہ اس شوق تغیر کے علاوہ کچھ نہیں ہے جو ایک بھوکے کو ہوتا ہے۔ اس خلفشار کا علاج اس کے نزدیک یہ ہے کہ ملکیت کو عام کردیا جائے۔ ملکیت سے شخصیت اور ایک بلند کن فخر حاصل ہوتا ہے۔ احساس ملکیت انسان کی قوت کو دوگونہ کر دیتا ہے۔ یہ یقینی ہے کہ ایک جائداد کا مالک اپنی زمین میں دوسرے کی زمین کی نسبت بہتر طریق پر کاشت کرے گا۔

وہ حکومت کی اشکال کے جھگڑے میں پڑنا نہیں چاہتا۔ نظری طور پر تو وہ جمہوریت کو ترجیح دیتا ہے۔ مگر وہ اس کے نقائص سے واقف ہے۔ اِس میں

دھڑے بندی کا موقع ہوتا ہے، جو اگر خانہ جنگی کا باعث نہ بھی ہو تو بھی قومی وحدت کو برباد کر دیتی ہے۔ یہ صرف چھوٹے ممالک کے لیے موزوں ہے۔ جو اپنے جغرافیائی محل وقوع کی بنا پر محفوظ ہوتی ہیں، اور دولت کی افراط سے خراب اور پارہ پارہ نہیں ہو چکی ہوتیں۔ عام طور پر لوگ شاذ و نادر ہی خود پر حکومت کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ جمہوریتیں اکثر اوقات آنی ہوتی ہیں۔ یہ معاشرے کی اولین صورت
۲۶۷ ہیں جو خاندانوں کے اتحاد سے پیدا ہوتا ہے۔ امریکہ کے قدیم باشندے قبیلہ داری جمہوریتوں کی صورت میں رہتے تھے، اور افریقہ ایسی جمہوریتوں سے بھرا پڑا ہے، لیکن معاشی حیثیت کا امتیاز مساواتی حکومتوں کا خاتمہ کر دیتا ہے، اور امتیاز ترقی کا لازمی جزو ہوتا ہے۔ جمہوریت اور شخصی بادشاہی میں کونسی بہتر ہے، اور اس کا وہ جواب دیتا ہے کہ چار ہزار برس سے یہ مسئلہ معرض بحث میں ہے۔ امیروں سے پوچھو تو وہ اشرافیہ کی رائے دیں گے، عوام سے پوچھو وہ عمومیہ کی رائے دیں گے۔ صرف بادشاہ اور سلاطین شخصی بادشاہی چاہتے ہیں۔ پھر یہ کس طرح سے ہو گیا کہ تقریباً تمام زمین پر بادشاہوں کی حکومت ہے، ان چوہوں سے پوچھو جنھوں نے بلّی کی گردن میں گھنٹی باندھنی چاہی تھی۔ لیکن جب ایک سائل یہ کہتا ہے کہ بادشاہی حکومت کی بہترین شکل ہے تو اس کا وہ یہ جواب دیتا ہے کہ بشرطیکہ مارکس اریلس بادشاہ ہو۔ ورنہ ایک غریب آدمی کے لیے اس سے کیا فرق ہوتا ہے کہ اس کو ایک شیر کھا جاتا ہے یا سو چوہے؟"

اسی طرح سے وہ ایک سیاح کی طرح سے قومیتوں کے بارے میں بے پروا ہے۔ وہ حب وطن کے جو عام معنے ہیں اس میں مشکل سے یہ جذبہ رکھتا ہے۔ حبِ وطن کے عام طور پر یہ معنے ہیں کہ انسان اپنے ملک کے علاوہ اور تمام ممالک سے نفرت کرتا ہو۔ اگر ایک شخص اپنے ملک کی خوشحالی کا طالب ہو اور اس کے ساتھ ہی وہ دوسرے ممالک کو نقصان پہنچانا نہ چاہتا ہو، تو وہ ایک ہوشمند محب وطن بھی ہو گا، اور کائنات کا شہری بھی۔ ایک اچھے یورپین کی طرح سے وہ انگلستان کے ادب اور پروشیا کے بادشاہ کی تعریف کرتا ہے حالانکہ فرانس اس وقت

انگلستان اور پروشیا دونوں سے برسرِ جنگ ہے۔ جب تک دنیا کی قومیں جنگ کی مشق جاری رکھیں گی اس وقت یہ کہنے کا موقع نہیں ہے کہ ان میں سے کونسی بہتر ہے۔

کیونکہ وہ سب سے زیادہ جنگ سے نفرت کرتا ہے۔ جنگ سب جرموں میں سب سے بڑا جرم ہے اس کے باوجود کوئی غاصب اور حملہ آور ایسا نہیں ہے جو اپنے جرم کو انصاف کے حیلے سے نہ چھپاتا ہو۔ قتل کی ممانعت ہے۔ لہٰذا تمام قاتلوں کو سزا دی جاتی ہے، سوائے اس صورت کے کہ وہ بڑی تعداد میں ڈنکے کی چوٹ قتل کریں۔ لغت میں انسان کے مضمون کے ختم پر وہ انسان پر ایک عام
تبصرہ کرتا ہے۔ ۲۶۸

انسان کو پودے کی حالت سے جس میں کہ وہ بطنِ مادر میں ہوتا ہے، اور حیوان کی حالت سے جو کہ بچپن میں اس کی کیفیت ہوتی ہے، اس حالت تک لانے میں بیس سال کی ضرورت ہوتی ہے جس میں عقل کی پختگی خود کو محسوس کرانے لگتی ہے۔ اس کی ساخت کے متعلق خفیف معلومات کے لیے تیس صدیوں کی ضرورت ہوئی ہے۔ اس کی روح کے متعلق کچھ نہ کچھ معلوم کرنے کے لیے ابدی مدت کی ضرورت ہوگی۔ لیکن اس کے قتل کرنے کے لیے ایک لمحہ کافی ہے۔

کیا وہ انقلاب کو علاج خیال کرتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ کیونکہ اول تو اسے عوام پر بھروسا نہیں۔ جب عوام استدلال و حجت کرنے لگیں تو پھر خیر نہیں۔ ان میں سے بڑی تعداد تو ہمیشہ اس قدر مصروف رہتی ہے کہ اس کو تو اس وقت تک حقیقت کا احساس نہ ہوگا جب تک تبدیلی حقیقت کو غلطی نہ بنا دے۔ اور ان کی علمی تاریخ محض یہ ہوتی ہے کہ افسانے کی جگہ وہ دوسرے افسانے کو دیدیتے ہیں۔ جب ایک قدیم غلطی راسخ ہو جاتی ہے تو سیاسیات اس سے نوالے کا کام لیتی ہے جس کو عوام اپنے منہ میں رکھ چکے ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک اور وہم آتا ہے اور اس کو برباد کر دیتا ہے اور سیاسیات دوسری غلطی سے بھی اسی طرح فائدہ اٹھاتی ہے جس طرح اس نے پہلی غلطی سے فائدہ اٹھایا تھا"۔ اور پھر عدم مساوات تو معاشرے کی ساخت ہی میں لکھی ہوئی ہے، اور اس کو اس وقت تک مشکل سے اکھاڑ کر پھینکا جا سکتا ہے،

جب تک انسان انسان ہیں اور زندگی کشمکش ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ تمام انسان مساوی ہیں، اگر اس سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ تمام انسانوں کو آزادی سے اپنے سامان کے قبضے اور اپنے قوانین کی حفاظت کا مساوی حق ہوتا ہے تو وہ سب سے بڑی حقیقت کا دعوی کرتے ہیں۔ لیکن دنیا میں مساوات سب سے قدرتی اور سب سے پرفریب چیز ہے۔ یہ قدرتی اس وقت ہوتی ہے جب یہ حقوق تک محدود ہوتی ہے، اور غیر فطری اس وقت ہوتی ہے جب یہ سامان اور قوتوں کو مساوی کر دینا چاہتی ہے۔ تمام شہری یکساں قوت کے نہیں ہو سکتے لیکن وہ سب مساوی طور پر آزاد ہو سکتے ہیں۔ یہی چیز ہے جو انگریزوں نے حاصل کر لی ہے .... آزاد ہونے کے معنے قوانین کے علاوہ اور کسی چیز کے تابع نہ ہونے کے ہیں۔ آزاد خیالوں یعنے ٹرگاٹ کانڈورسے مرابو اور والٹیر کے دوسرے متبعین جو پر امن انقلاب کی امید کرتے تھے، ان کا مقولہ یہی تھا۔ اس سے مظلوموں کی تشفی نہیں ہو سکتی تھی، جو اس قدر آزادی کے طالب نہ تھے جس قدر مساوات کے طلبگار تھے اور مساوات بھی آزادی کی قیمت پر۔ روسو عام آدمی کی زبان تھا اس کو طبقاتی امتیازات کا بے حد احساس تھا جو ہر موڑ پر ملتے تھے۔ وہ مساوات کا طالب تھا۔ اور جب انقلاب اس کے متبعین میراٹ اور روبسپیر کے ہاتھ میں آیا، تو مساوات کو موقع ملا اور آزادی کو ذبح کر دیا گیا۔ 276

والٹیر کو شک تھا کہ انسانی مقننن یوٹوپیا بنا سکتے ہیں یعنے اپنے تخیل سے ایک بالکل نئی دنیا عالم وجود میں لا سکتے ہیں۔ معاشرے کا نشوونما زمانے کے اندر ہوتا ہے یہ کوئی منطقی قیاس نہیں ہے۔ اور جب ماضی کو دروازے کے راستے سے باہر نکال دیا جاتا ہے تو یہ کھڑکی کے راستے سے پھر اندر آتا ہے۔ مسئلہ ٹھیک یہ ہے کہ جس دنیا میں ہم فی الحقیقت رہتے ہیں، اس کے اندر ہم کن تبدیلیوں سے بد حالی اور ظلم کو کم کر سکتے ہیں۔ "عقل کی تاریخی مدح" میں صداقت جو عقل کی بیٹی ہے، لوئی شانزدہم کی تخت نشینی پر اظہار خوشی کرتی ہے اور بڑی اصلاحات کی توقع ظاہر کرتی ہے، جس کا عقل اس طرح سے جواب دیتی ہے کہ بیٹی تم خوب جانتی ہو کہ مجھے بھی ان چیزوں کی خواہش ہے؛

اور تم سے زیادہ ہے۔ مگر ان سب باتوں کے لیے وقت اور سوچ بچار کی ضرورت ہے۔ جب بہت ناکامیوں کے ساتھ مجھے اس اصلاح کا کچھ جزو بھی مل جاتا ہے جس کی مجھے آرزو تھی تو میں ہمیشہ خوش ہو جاتی ہوں۔ اس کے باوجود جب ٹرگاٹ برسر اقتدار ہوا تو والٹیر بھی خوش ہوا اور اس نے لکھا کہ " ہم گردن تک عہد زرین میں ہیں"۔ اب وہ اصلاحات ہونگی جن کا وہ حامی تھا۔ پنچایتوں tithe کا خاتمہ، غریبوں کا تمام محصولات سے استثنا وغیرہ۔ اور اگر اس نے یہ مشہور خط نہ لکھا ہوتا۔

" ہر چیز جو میں دیکھ رہا ہوں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انقلاب کے بیج بکھیر رہی ہے جو کسی نہ کسی دن لازمی طور پر ہوگا مگر جس کے دیکھنے کی خوشی مجھ کو حاصل نہ ہوگی۔ فرانسیسی حقیقت پر ہمیشہ دیر سے پہنچتے ہیں مگر پہنچ ضرور جاتے ہیں۔ روشنی ایک پڑوسی سے دوسرے پڑوسی تک اس طرح سے پھیل رہی ہے کہ پہلے موقع پر تو ایک شاندار منظاہر ہوگا اور عدیم المثال ابتری ہوگی۔ نوجوان خوش قسمت ہیں وہ عجیب و غریب چیزیں دیکھیں گے"۔

۲۷۰ لیکن اس کو پورا اندازہ نہ تھا، کہ اس کے گرد و پیش کیا ہو رہا تھا۔ اور اس نے ایک لمحے کے لیے بھی کبھی یہ فرض نہ کیا تھا کہ اس شاندار منظاہرے میں تمام فرانس جوش و خروش کے ساتھ اس عجیب و غریب شخص یعنے جین جیکس روسو کے فلسفے کو قبول کرے گا، جو جنیوا اور پیرس سے اپنے عواطفی افسانوں اور انقلابی رسالوں سے دنیا میں تہلکہ مچا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرانس کی پیچیدہ روح نے خود کو ان دو آدمیوں پر تقسیم کر لیا تھا، جو ایک دوسرے سے اس قدر مختلف تھے اور اس قدر فرانسیسی تھے۔ نیٹشے (la gaya scienza) کا ذکر کرتا ہے یعنے ہلکے قدم ظرافت آتش بیانی نازک خیالی شدید قوت استدلال پر فخر علمیت و ذہانت ستاروں کا رقص یقیناً وہ والٹیر کا خیال کر رہا تھا۔ اب والٹیر کے برابر روسو کو لاؤ محض حرارت و تخیل، شریف مگر خالی تخیلوں کا انسان، عوام کا بت، پاسکل کی طرح سے اس امر کا اعلان کرنے والا کہ قلب کے پاس بھی ایسے دلائل ہیں جن کو دماغ کبھی نہیں سمجھ سکتا۔

ان دو آدمیوں میں ہم عقل و جبلت کا تصادم پھر دیکھتے ہیں۔ والٹیر عقل کا معتقد تھا۔ ہم تقریر و تحریر سے لوگوں کو زیادہ روشن خیال اور بہتر بنا سکتے ہیں۔ روسو کو عقل پر مطلق عقیدہ نہ تھا۔ وہ عمل کا طلبگار تھا۔ انقلاب کے خطرات سے وہ خائف نہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ اخوت کی عاطفت ان معاشری عناصر کو پھر متحد کر دے گی جو ہنگامے اور قدیم عادات کی بیخ کنی کی بنا پر منتشر ہو جائیں گے۔ قوانین ہٹا لیے جائیں تو لوگ مساوات اور عدل کی حکومت کی طرف لوٹ آئیں گے۔ جب اس نے اپنی کتاب Discourse on the origin of Inequatity (ابنائے عدم مساوات) والٹیر کے پاس بھیجی جس میں تمدن ادب و حکمت کے خلاف دلائل تھے، اور اس فطری حالت کی طرف لوٹنے کی دعوت تھی جو وحشیوں اور حیوانات میں پائی جاتی ہے تو اس نے جواب دیا "مجھے نوع انسان کے خلاف آپ کی نئی کتاب ملی، میں اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں .... ہمیں بہائم کی صورت میں بدلنے کی کوشش میں کسی نے کبھی اس قدر ظرافت سے کام نہیں لیا۔ آپ کی کتاب پڑھنے کے بعد چاروں ہاتھوں کے بل پر چلنے کی آرزو ہونے لگتی ہے، مگر تقریباً ساٹھ برس ہو چکے ہیں کہ میں یہ عادت چھوڑ چکا ہوں اس لیے بدقسمتی سے اب میرے لیے اس کا اختیار کرنا ناممکن ہے۔ اسے روسو کے شوق وحشت کو
۲۷۱ پیمان معاشری (Social contract) کی صورت میں جاری ہوتا ہوا دیکھ کر اور بھی غصہ آیا۔ وہ ایم بورڈے کو لکھتا ہے، کہ آپ دیکھتے ہیں کہ جین جیکس فلسفی سے اسی قدر مشابہ ہے جس قدر کہ بندر انسان سے۔ لیکن سوس حکام نے جو اس کتاب کو جلا دیا، اس کی اس نے اپنے اس اصول کے مطابق شدید مخالفت کی کہ میں جو کچھ تم کہتے ہو اس کے ایک لفظ سے بھی متفق نہیں ہوں، مگر تمھیں اس کے کہنے کا حق حاصل ہے، اس بارے میں تمھارے ساتھ ہوں خواہ اس میں جان ہی چلی جائے"۔ اور جب روسو اپنے سیکڑوں دشمنوں کی وجہ سے بھاگ رہا تھا تو والٹیر نے نہایت محبت کے ساتھ اسے اپنے پاس آنے اور لیس ڈیلکیز میں ٹھہرنے کی دعوت دی۔ وہ کیسا منظر ہوتا۔

والٹیر کو یقین تھا کہ وہ تمدن کی جو مذمت کرتا ہے وہ محض لڑکپن کی بیہودگی ہے۔

انسان وحشت کی حالت کی نسبت تمدن کی حالت میں بہت ہی بہتر ہے۔ وہ روسو کو لکھتا ہے کہ انسان فطرۃً درندہ ہے، اور متمدن معاشرے کے معنے اس حیوان کے پا بہ زنجیر کرنے اس کی درندگی کے کم کرنے، اور معاشری نظام کے ذریعے سے اس کی عقل اور خوشیوں کی ترقی کے ہیں۔ اسے اس بارے میں اتفاق ہے کہ صورت بُری ہے۔ ”جس حکومت میں یہ جائز رکھا جاتا ہو کہ جو لوگ کام کرتے ہوں وہ محصول ادا کریں، اور ہمیں محصول نہیں دینا چاہئے کیونکہ ہم کام نہیں کرتے، وہ ہوٹینٹاٹوں کی حکومت سے بہتر نہیں ہے۔ پیرس اپنی خرابیوں کے باوجود ایسی خوبیاں بھی رکھتا ہے جن سے ان کی تلافی ہو جاتی ہے۔ اپنی کتاب دنیا جیسی کہ یہ ہے The Warld as It Goes میں والٹیر ایک قصہ بیان کرتا ہے جس میں ایک فرشتہ بابوک کو یہ دریافت کرنے کے لیے بھیجتا ہے کہ آیا شہر پرسی پولس کو برباد کر دیا جائے؟ بابوک جاتا ہے، اور وہاں کی خرابیوں کو دیکھ کر بہت متنفر ہوتا ہے۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد وہ اس شہر سے محبت کرنے لگتا ہے جس کے باشندے متلون مزاج بہتان اٹھانے والے اور مغرور مگر شائستہ خوش مزاج اور سخی بھی ہیں۔ وہ ڈرا کہ کہیں پرسی پولس برباد نہ ہو جائے۔ وہ اپنا بیان پیش کرنے سے بھی ڈرا۔ مگر بہ اس نے اس طرح سے پیش کیا۔ اس نے مٹی پتھروں اور مختلف دھاتوں سے (جن میں سب سے قیمتی اور سب سے ادنی دونوں داخل تھیں) شہر کے بہترین بت ساز سے ڈھلوایا اور اسے فرشتے کے پاس لے گیا۔ اور کہا کیا تو اس خوبصورت بت کو محض اس لیے توڑ دے گا کہ یہ صرف سونے اور
۲۷۳ ہیرے کا بنا ہوا نہیں ہے“ فرشتہ پرسی پولس کے برباد کر دینے کے ارادے سے درگذرا اور دنیا جس حالت میں ہے اس کو اسی حالت پر چھوڑ دیا۔ بہرحال جب کوئی شخص انسانوں کی فطرت کو بدلے بغیر معابد کے بدلنے کی کوشش کرتا ہے، تو غیر متغیر فطرت جلد ہی ان معابد کو زندہ کر لیتی ہے۔

یہاں پر پھر وہی پرانا دور تھا۔ انسان معابد سے، اور معابد انسانوں سے۔ تبدیلی اس حلقے کے اندر کیسے داخل ہو سکتی تھی۔ والٹیر اور آزاد خیالوں کا خیال تھا، کہ عقل لوگوں کو تعلیم دے کر اور آہستہ آہستہ بدل کر تو

اس حلقے کو توڑ سکتی ہے۔ روسو اور انتہا پسند کہتے تھے کہ یہ حلقہ صرف ایسے جبلی اور پر جوش عمل سے ٹوٹ سکتا ہے جو قدیم معاہد کو توڑ دے گا اور قلب کے مطالبات پر نئے معاہد تیار کرے گا جن کے تحت آزادی مساوات اور اخوت کا دور دورہ ہو گا۔ شاید صداقت ان اختلافات سے ماوراتھی۔ جبلت کا قدیم معاہد کو برباد کر دینا ضروری تھا، لیکن نئے معاہد کو صرف عقل بنا سکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انقلاب کے بیج روسو کی انتہا پسندی میں نشو و نما پا رہے تھے۔ کیونکہ جبلت و عاطفت آخر کار اپنے قدیم ماضی سے وفاداری برتتے ہیں جس سے یہ عالم وجود میں آتے ہیں اور جس کے یہ مقررہ تطابق ہوتے ہیں۔ انقلاب کی فصد کے بعد قلب کی ضروریات فوق الفطری مذہب اور معمول اور امن کے اچھے قدیم ایام کو یاد دلائیں گی۔ روسو کے بعد شاتو بریان ڈی انسٹیل ڈی میسٹر اور کانٹ آئیں گے۔

فنا۔ انجام

اس اثنا میں ضاحک فلسفی فرنے میں اپنا باغ لگاتا رہا۔ یہ بہترین کام ہے جو ہم زمین پر کر سکتے ہیں۔ اس نے طویل زندگی کی خواہش کی تھی۔ مجھے ڈر ہے کہ میں خدمت انجام دینے سے پہلے مر جاؤں گا۔ مگر اب یقیناً وہ اپنے حصے کا کام کر چکا تھا۔ اس کی سخاوت کے قصے بہت سے ہیں۔ ہر شخص دور ہو یا نزدیک، اس کی عنایت کا حقدار تھا۔ لوگ اس سے مشورہ کرتے تھے۔ اپنی تکالیف کا حال اس سے بیان کیا کرتے تھے۔ اور اس کے قلم اور جیب سے امداد کے طلبگار ہوا کرتے تھے۔ غریب لوگ جن سے کوئی بدعنوانی ہو جاتی تھی۔ ان پر اس کی خاص نظر کرم پڑتی تھی۔ ۲۷۳
وہ ان کو معافی دلوا دیا کرتا تھا، اور پھر ان کو کسی شریف مشغلے میں لگا دیتا تھا، اور جب تک ان کا کام اچھی طرح جم نہیں جاتا تھا ان کی نگرانی کرتا تھا اور مشورے دیا کرتا تھا۔ ایک میاں بی بی نے اس کے ہاں چوری کرلی۔ لیکن جب

گھٹنوں کے بل گر کے اس سے معافی کے خواستگار ہوئے تو وہ ان کو اٹھانے کے لیے جھکا۔ اور ان سے کہا کہ میں بخوشی تمہیں معاف کرتا ہوں، مگر تمہیں صرف خدا سے معافی کا طالب ہونا چاہئے۔ اس کا ایک مخصوص کارنامہ یہ تھا کہ کارنیلی مفلس بھتیجی کو پرورش کیا تعلیم دی اور جہیز کا انتظام کیا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ چھوٹی سی نیکی جو میں نے کی ہے میرا بہترین کام ہے .... جب مجھ پر حملہ کیا جاتا ہے، تو میں شیطان کی طرح سے لڑتا ہوں میں کسی سے ہار نہیں مانتا۔ مگر دل سے میں اچھا شیطان ہوں، اور میں ہنس کر بات ختم کر دیتا ہوں۔"

۱۷۷۰ء میں اس کے دوستوں نے اس کے نصف حصے کا بت تیار کرنے کے لیے چندہ جمع کرنا شروع کیا۔ امیروں کو منع کرنا پڑا کہ حقیر رقم سے زیادہ نہ دیں کیونکہ ہزارہا آدمی اس اعزاز میں حصہ لینے کے آرزومند تھے۔ فریڈرک نے دریافت کیا کہ مجھے کس قدر دینا چاہیئے۔ اس سے کہا گیا کہ جناب صرف ایک کراؤن اور اپنا نام۔ والٹیر نے اس کو مبارک باد دی کہ جہاں آپ دیگر علوم و فنون کی خدمت کرتے ہیں وہاں ایک ڈھانچے کے بت تیار کرنے میں شرکت کر کے علم تشریح کو بھی ترقی دے رہے ہیں، اسے اس کل مہم سے اختلاف تھا، اور اس بنیاد پر اختلاف تھا کہ میرا چہرہ ہی کہاں باقی رہا ہے جو نمونہ بن سکے۔ تم مشکل سے قیاس کر سکو گے کہ یہ کہاں ہونا چاہئے۔ میری آنکھیں تین انچ اندر دھنس چکی ہیں، میرے گال پرانے کاغذ کے مانند ہو گئے ہیں۔ چند دانت جو باقی تھے وہ بھی رخصت ہو چکے ہیں۔ ڈالابیر نے اس کا یہ جواب دیا کہ طباع کا ہمیشہ ایسا چہرہ ہوتا ہے جیسے اس کا بھائی طباع ہمیشہ آسانی سے پہچان لے گا۔ جب اس کی چہیتی بیلیبٹ بو نے اس کو پیار کیا تو اس نے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی موت کو پیار کر رہی ہے۔

اب اس کا سن تراسی برس کا تھا، اور اسے مرنے سے پہلے پیرس کے دیکھنے کی آرزو ہوئی۔ ڈاکٹروں نے اس قدر دشوار گزار سفر کرنے سے منع کیا۔ اس نے جواب دیا کہ اگر میں حماقت کرنا بھی چاہوں تو مجھے کوئی شخص اس سے روک نہیں سکتا۔ وہ اتنے عرصے زندہ رہ چکا تھا، اور اتنا سخت کام کر چکا تھا کہ شاید اس نے

۲۷۴ محسوس کیا کہ مجھے اپنے طریق پر مرنے کا حق ہے اور اس برق آسا پیرس میں جس سے وہ اتنے عرصے سے جلا وطن تھا۔ اس طرح سے اس نے میل بہ میل فرانس کو طے کیا۔ اور جب اس کی گاڑی دارالسلطنت میں داخل ہوئی تو اس کا جوڑ جوڑ ہل گیا تھا۔ وہ فوراً ہی اپنی جوانی کے دوست ڈار جنٹل کے یہاں گیا۔ میں نے یہاں آنے اور تم سے ملنے کے لیے اپنا مرنا ملتوی کر دیا ہے۔ اگلے روز اس کے کمرے پر تین سو ملاقاتیوں نے ہجوم کیا جنھوں نے اس کو بادشاہ کی طرح سے خوش آمدید کہا۔ لوئی شانز دہم حسد کی وجہ سے بہت ہی جلا۔ ملنے والوں میں سے بنجمن فرنکلین بھی تھا اور اپنے ساتھ اپنے پوتے کو بھی والٹیر سے دست شفقت رکھوانے کے لیے لایا تھا۔ بوڑھے شخص نے اپنے پتلے سوکھے ہاتھ نوجوان کے سر پر رکھے اور اس سے کہا کہ خود کو خدا اور آزادی کی خدمت کے لیے وقف کر دے۔

اس وقت وہ اس قدر بیمار تھا کہ ایک پادری اس کو پاک کرنے کے لیے آیا۔ والٹیر نے پوچھا پادری صاحب آپ کس کے پاس سے آ رہے ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ خود خدا کے پاس سے۔ والٹیر نے کہا کہ جناب آپ کی اسناد کہاں ہیں۔ پادری اپنے شکار کے بغیر ہی واپس چلا گیا۔ بعد کو والٹیر نے دوسرے پادری کو اپنا اعتراف سننے کے لیے بلایا۔ لیکن اس نے گناہوں سے اس وقت تک پاک کرنے سے انکار کیا جب تک والٹیر کیتھولک مذہب کا کامل طور پر اقرار نہ کرے۔ والٹیر نے پھر بغاوت کر دی۔ اس کے بجائے اس نے بیان لکھا جس کو اپنے سکریٹری واگنر کو دے دیا۔ میں خدا کی پرستش اور اپنے دوستوں سے محبت کرتا ہوا مرتا ہوں، مجھے اپنے دشمنوں سے نفرت نہیں مگر توہم پرستی سے سخت نفرت ہے۔ دستخط والٹیر ۲۸۔ فروری ۱۷۷۸ء۔

اگرچہ وہ بیمار تھا قدم ڈگمگا رہے تھے، لیکن نہایت ہی عظیم الشان ہجوم کے ساتھ اس کو اکیڈمی لے جایا گیا۔ مجمع کے لوگ اس گاڑی پر چڑھ گئے جس پر وہ سوار تھا اور قیمتی شال کو جو کیتھرائن ملکۂ روس نے اس کو عطا کی تھی پارہ پارہ کر کے یادگار کے طور پر تقسیم کر لیا۔ یہ صدی کا تاریخی واقعہ ہے کسی بڑے سردار کا جو طویل دشوار اور پرخطر معرکے سے کامیاب ہو کر لوٹا ہو،

اور نہایت ہی شاندار فتح حاصل کی ہو، اس قدر شاندار اور پر شور استقبال نہ ہوا ہوگا۔ اکیڈمی میں اس نے فرانسیسی لغت کی نظر ثانی کی تجویز پیش کی۔ اس موقع پر اس نے جوانی کے جوش و خروش کے ساتھ تقریر کی، اور کہا کہ حرف (A) کے متعلق جتنا کام ہوگا وہ میں انجام دیدوں گا۔ جلسے کے بعد اس نے کہا کہ حضرات! میں آپ کا الف بے تے کا نام لے کر شکریہ ادا کرتا ہوں صدر جلسہ شاتلو نے جواب دیا، اور ہم آپ کا حروف تہجی کی جانب سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔

اس اثنا میں اس کی تمثیل آئرینے میں دکھائی جا رہی تھی، طبیبوں کے مشورے کے خلاف وہ اس میں بھی موجود رہنے پر مصر ہوا، تمثیل معمولی تھی لیکن لوگوں کو اس امر پر تعجب نہ تھا کہ تراسی برس کا بوڑھا معمولی تمثیل لکھے ان کو تعجب اس بات پر تھا کہ تراسی برس کے بوڑھے نے تمثیل لکھی ہی کیونکر ہے۔ انھوں نے اداکاروں کی آواز کو مصنف کے اعزاز کے پیہم مظاہروں سے دبا دیا۔ ایک اجنبی تماشا گاہ میں جو داخل ہوا تو اس نے یہ خیال کیا کہ میں کہیں پاگل خانے میں تو نہیں آگیا اور وہ ڈر کر واپس چلا گیا۔

جب ادب کا بوڑھا بطریق اس شام کو مکان لوٹا تو وہ مرنے کے اوپر تقریباً راضی ہو چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں اب تھک چکا ہوں، اور اس بے قابو اور حیرت انگیز توانائی سے جو فطرت نے مجھے اس قدر عطا کی تھی جو شاید مجھ سے پہلے کسی کو عطا نہ کی ہو، میں نے پوری طرح سے بلکہ اس سے بھی زیادہ کام لے لیا ہے۔ اس نے جب جان کو تن سے جدا ہوتے دیکھا تو کشمکش کی مگر موت والٹیر کو بھی شکست دے سکتی تھی۔ انجام ۳۰۔ مئی ۱۷۷۸ء کو ہو گیا۔

پیرس میں اس کو عیسائی تدفین کی اجازت نہ دی گئی۔ مگر اس کے دوستوں نے اس کو گاڑی میں بٹھایا اور یہ کہہ کر شہر سے باہر لے گئے، وہ ابھی زندہ ہے۔ اسکیلریز میں ان کو ایک ایسا پادری مل گیا جو سمجھتا تھا کہ قواعد طباعوں کے لیے نہیں ہیں اور لاش مقدس زمین میں دفن کر دی گئی۔ ۱۷۹۱ء کا میاب انقلاب کی قومی مجلس نے لوئی شانزدہم کو مجبور کیا کہ والٹیر کی لاش کو

طلب کر کے پانتھیوں میں دفن کرائے۔ جب اس بڑے شعلے کی ٹھنڈی راکھ پیرس میں لائی گئی تو ایک لاکھ مرد و عورت ساتھ تھے اور چھ لاکھ قطاریں باندھے سڑکوں پر کھڑے تھے۔ جنازہ لانے والی گاڑی پر صرف یہ جملہ لکھا ہوا تھا ''اس نے ذہن انسانی کو بہت تقویت پہنچائی ہے۔ اس کے لوح مزار پر صرف تین لفظ ہیں یا'' یہاں والٹیر دفن ہے۔

باب ۶

ایمینویل کانٹ اور جرمن تصوریت ۲۷۶

۱۔ کانٹ کی جانب شاہراہیں

کسی عہد پر کوئی نظام فکر اس درجے مستولی نہیں ہوا جس قدر کہ انیسویں صدی پر ایمینویل کانٹ کا فلسفہ مستولی رہا ہے۔ تقریباً ساٹھ برس کی خاموش اور الگ تھلگ رہکر ترقی کرنے کے بعد کونگسبرگ کے پر اسرار اسکاٹی نے ۱۷۸۱ء میں اپنے مشہور انتقاد عقل خالص سے دنیا کو اعتقادی نیند سے بیدار کر دیا۔ اور اس دن سے آج تک انتقادی فلسفے نے یورپ کے فکری اڈے پر حکومت کی ہے۔ شوپنہائر کے فلسفے کو رومانی لہر کی وجہ سے جو ۱۸۴۸ء میں اٹھی تھی، کچھ عرصے کے لیے اقتدار حاصل ہو گیا تھا۔ ۱۸۵۹ء کے بعد نظریۂ ارتقا ہر چیز کو اپنی رو میں بہا لے گیا، اور نیٹشے کی پر جوش بت شکنی نے صدی کے ختم کے قریب فلسفی تماشا گاہ کے مرکز پر قبضہ کر لیا۔ مگر یہ ثانوی اور سطحی نشو و نما تھے۔ ان کے نیچے کانٹی تحریک کی قوی اور مستقل موج جاری رہی، جو ہمیشہ عمیق تر اور وسیع تر ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ آج اس کے اساسی مقالے پختہ فلسفے کے مسلمات میں داخل ہیں۔ نیٹشے کانٹ کے فلسفے کو تسلیم کر کے آگے بڑھتا ہے۔ شوپنہائر انتقاد کو جرمن ادب میں سب سے اہم تصنیف کہتا ہے۔ اس کے نزدیک جب تک انسان کانٹ کے فلسفے کو نہ سمجھ لے اس وقت تک

وہ محض طفلِ مکتب رہتا ہے۔ اسپنسر کانٹ کو نہیں سمجھ سکا اور شاید محض اس وجہ سے وہ مکمل ترین فلسفی کے قد وقامت کو نہیں پہنچا۔ اگر ہیگل کے اس فقرے کو جو اس نے اسپی نوزا کے متعلق کہا تھا کانٹ کے متعلق استعمال کیا جائے تو بالکل درست اور بجا ہے کہ "فلسفی ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ پہلے انسان کانٹی ہو۔"

277 لہٰذا ہمیں فوراً کانٹی بن جانا چاہیئے۔ مگر ظاہر ہے کہ ہم آن واحد میں کانٹی نہیں بن سکتے۔ کیونکہ سیاسیات کی طرح سے فلسفے میں بھی دو نقطوں کے مابین طویل ترین فاصلہ خطِ مستقیم ہوتا ہے۔ دنیا میں کانٹ سب سے آخری شخص ہے جس کا ہمیں کانٹ کے متعلق مطالعہ کرنا چاہیئے۔ ہمارا فلسفی یہوواہ سے مشابہ اور غیر مشابہ ہے۔ وہ بادلوں میں سے تو بولتا ہے مگر بجلی کی چمک کے بغیر بولتا ہے۔ امثلہ اور حقیقی واقعات سے وہ گریز کرتا ہے، کیونکہ ان سے بقول اس کے اس کی کتاب بہت بڑی ہو جاتی۔ (اس طرح مختصر ہونے کے باوجود بھی اس میں ۸۰۰ صفحات ہیں) صرف پیشہ ور فلسفیوں سے اس کے مطالعے کی توقع تھی۔ لیکن اس کے باوجود جب کانٹ "انتقاد" کا مسودہ اپنے دوست ہرس کو دیا جو تفلسف میں ید طولیٰ رکھتا تھا تو اس نے آدھا پڑھ کر یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ اگر میں اسے پڑھتا رہا تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں میں مجنون نہ ہو جاؤں۔ ایسے فلسفی سے ہم کیونکر نبٹ سکتے ہیں۔

ہمیں احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ اس کے قریب آنا چاہیئے۔ اور ابتدا ادب کے ساتھ دور ہی سے کرنی چاہیے۔ ہمیں موضوع کے محیط پر مختلف نقطوں سے آغاز کرنا چاہیئے اور پھر اس دقیق مرکز کی طرف ٹٹول ٹٹول کر اپنا راستہ تلاش کرنا چاہیئے جہاں ادق ترین فلسفہ اپنا راز اور اپنا خزانہ مخفی رکھتا ہے۔

ا۔ والٹیر سے کانٹ کی جانب

یہاں پہ راستہ عقل نظری بلا عقیدۂ مذہبی سے عقیدۂ مذہبی بلا عقل نظری کی طرف گیا ہے۔ والٹیر کے معنے علمی روشنی مجموعۂ علوم اور عہدِ عقلی کے ہیں۔ فرینسس بیکن

کے جوش و سرگرمی نے حکمت و منطق کی طاقت کی نسبت یہ مستحکم اعتقاد پیدا کر دیا تھا کہ یہ آخر کار تمام مسائل کو حل کر سکتی ہے، اور انسان کے مکمل بننے کی غیر محدود قابلیت کی مثال پیش کر سکتی ہے۔ کانڈورسے نے قید خانے میں روح انسانی کی ترقی کا تاریخی جدول لکھا (۱۷۹۳ء) جس میں اٹھارھویں صدی کے اس انتہائی اعتماد کا ذکر تھا جو اس کو علم و عقل پر تھا اور اس میں یوٹوپیا کی عام تعلیم کے علاوہ اور کسی کنجی کی خواہش نہ کی تھی۔ مستقل مزاج جرمن اپنی نئی روشنی اپنا
معقولی کریچین وولف اور رجائی لیسنگ رکھتے تھے۔ عہد انقلاب کے پر جوش ۲۷۸
پیریسیوں نے عقل کی خدائی تمثیل بنالی اور عقل کی دیوی کی پرستش شروع کر دی جس کو سڑکوں پر پھرنے والی ایک خوبصورت خاتون کی صورت میں ظاہر کیا گیا تھا۔

اسپی نوزا کے یہاں اس ایمان علی العقل نے ہندسہ اور منطق کی ایک شاندار عمارت تیار کر دی تھی۔ اس کے نزدیک کائنات ایک ریاضیاتی نظام ہے، جس کو مسلمہ ضوابط سے خالص استخراج کے ذریعے سے اولی طور پر ثابت کیا جا سکتا ہے۔ ہابس کے یہاں بیکن کی عقلیت مطلق الحاد اور مادیت بن گئی تھی بجز سالمات اور خلا کے علاوہ کوئی چیز قدیم نہ تھی۔ اسپی نوزا سے ڈیڈروٹ تک مذہب کے ٹوٹے پھوٹے ٹکڑے آگے بڑھتی ہوئی عقل سے پیچھے رہ گئے۔ پرانے اعتقادات ایک ایک کر کے مٹ گئے۔ قرون وسطیٰ کے مذہب کا گاتھی گرجا اپنی دلچسپ تفصیلات اور بدنمائیوں کے ساتھ بیٹھ گیا۔ پرانے زمانے کا خدا خاندان بوربون کے ساتھ اپنے تخت پر سے گر پڑا۔ بہشت محض آسمان بن کر رہ گیا۔ اور دوزخ صرف ایک جذبی مظہر ہو گیا۔ ہیلوٹئس اور ہولباخ نے الحاد کو فرانس کے دیوان خانوں میں اس قدر رائج کر دیا کہ مذہبی لوگوں نے بھی اس کو اختیار کر لیا۔ اور لامیٹرے شاہ پروشیا کی حمایت میں اس کو جرمنی میں رائج کرنے کے لیے گیا۔ جب ۱۷۸۴ء میں لیسنگ نے جاکوبی کو یہ کہہ کر حیران کر دیا کہ وہ اسپی نوزا کا متبع ہے تو یہ اس امر کی علامت تھی کہ مذہب اپنی انتہائی پستی پر پہنچ گیا ہے اور عقل اپنے انتہائی عروج پر ہے۔

ڈیوڈ ہیوم جس نے فوق الفطری اعتقاد پر عقل کی جانب سے حملہ کرنے میں اس قدر نمایاں حصہ لیا ہے، کہتا ہے کہ جب عقل ایک شخص کے خلاف ہوتی ہے تو وہ جلد ہی عقل کے خلاف ہو جائے گا۔ مذہبی یقین اور امید جن کی آواز سرزمین یورپ کے لاکھوں کلیساؤں سے بلند ہو رہی تھی معاشرے کے معاہد اور انسان کے قلب میں اس قدر گہری جڑیں رکھتے تھے کہ وہ عقل کے معاندانہ فیصلے پر آسانی کے ساتھ سر تسلیم خم کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ یہ بات لازمی تھی کہ یقین و امید جن کو اس طرح سے رد کیا جا رہا تھا، حاکم کی اہلیت اور اقتدار کے متعلق سوال کریں، اور عقل و مذہب دونوں کی جانچ کے طالب ہوں۔ یہ عقل کیا ہے جو ایک قیاس کے ذریعے سے ہزارہا برس اور کروروں اشخاص کے اعتقادات کو برباد کر دینا چاہتی ہے۔ کیا یہ ناقابل خطا ہے؟ یا یہ دوسرے انسانی اعضا کی طرح سے ایک
۲۷۹ عضو ہے، جس کے وظائف اور جس کی قوتیں نہایت ہی متعین حدود رکھتی ہیں۔ وقت آگیا تھا کہ اس حاکم پر حکم لگایا جائے اس بے رحم انقلابی عدالت کو جانچا جائے جو اس قدر سخاوت کے ساتھ ہر قدیم امید کو سزائے موت کے حکم سنا رہی ہے۔ انتقاد عقل کا وقت آگیا تھا۔

۲۔ لاک سے کانٹ کی جانب

لاک برکلے اور ہیوم نے اسی کی جانچ کے لیے راستہ تیار کر دیا تھا، لیکن اس کے باوجود ان کے نتائج بظاہر مذہب کے مخالف تھے۔

جان لاک (۱۶۳۲-۱۷۰۴) نے فرینسیس بیکن کے استقرائی معیارات اور طریقوں کو نفسیات پر عاید کرنا چاہا تھا۔ اس کی مشہور کتاب "مضمون بر فہم انسانی یعنی (Essay on Human Undertanding) میں عقل نے پہلی مرتبہ جدید فکر میں اپنی جانب توجہ کی تھی، اور فلسفے نے اس آلے کو جانچنا شروع کیا تھا، جس پہ یہ بڑی مدت سے بھروسا کرتا آیا تھا۔ فلسفے میں یہ تاملی تحریک ایک ایک قدم کر کے تاملی ناول

کے ساتھ بڑھی جس کو رچرڈسن اور روسو نے ترقی دی تھی جس طرح سے کلیرزہارلوادر لاناول ہیلوزی کے عواطفی اور جذباتی رنگ کا دوسرا رخ فہم و عقل پر جبلت اور احساس کی برتری تھی۔

علم کس طرح سے پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً کیا ہمارے اندر صواب و خطا اور ذات باری کے خلقی تصورات ہیں جیسا کہ بعض اچھے لوگ فرض کرتے ہیں۔ یعنی کیا یہ تصورات پیدائش کے وقت ہر قسم کے تجربے سے پہلے مضمر ہیں۔ اہل مذہب کو فکر تھی کہ کہیں ذات باری کا عقیدہ معدوم نہ ہو جائے کیونکہ خدا ابھی کسی دوربین کے اندر نظر نہیں آیا تھا۔ اس لیے ان کی رائے تھی کہ اگر مذہب و اخلاق کے مرکزی اور بنیادی تصورات کو ہر اوسط درجے کی روح میں خلقی ثابت کر دیا جائے تو اس سے ان کو تقویت پہنچ سکتی ہے۔ مگر لاک ایک اچھا عیسائی ہونے کے اور عیسائیت کی معقولیت ثابت کرنے کے لیے ہر وقت تیار ہونے کے باوجود ان مروضات کو تسلیم نہ کر سکا۔ اس نے خاموشی کے ساتھ اعلان کر دیا کہ تمام علم تجربے اور حواس کے ذریعے سے ہوتا ہے، اور ذہن میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو پہلے حواس میں نہ رہ چکی ہو۔ ذہن پیدائش کے وقت صفحۂ سادہ ہوتا ہے اور تجربۂ حسی اس پر ہزار طریق پر لکھتا ہے یہاں تک حس سے حافظہ اور حافظے سے تصورات پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ تمام باتیں اس چونکا دینے والے نتیجے تک لے جاتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں کہ چونکہ صرف مادی چیزیں ہمارے حاسے کو متاثر کر سکتی ہیں اس لیے ہم مادے کے علاوہ اور کسی چیز کو نہیں جانتے، اور ہم مادیتی فلسفے کے تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ جلد بازوں نے یہ نتیجہ نکال لیا کہ اگر حسیں فکر کا مواد ہیں تو ذہن مادے کا بنا ہوا ہونا چاہیے۔ ۲۸۰

بشپ جارج برکلے (۱۶۸۴-۱۷۵۳) نے کہا کہ ہرگز نہیں۔ علم کی اس لاک کی تحلیل سے تو صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ مادے کا ذہن کی صورت کے علاوہ اور کسی طرح وجود ہی نہیں ہے۔ یہ ایک شاندار تصور تھا۔ اور مادیت کی محض یہ ثابت کر دینے سے تردید ہو جاتی تھی کہ ہم مادے جیسی شے سے واقف ہی نہیں ہیں۔ تمام یورپ میں صرف اسکاٹستانی تمثل اس مابعد الطبیعیاتی طلسم کا تخیل

کر سکتا تھا۔ "مگر دیکھو" بشپ نے کہا کہ یہ کس قدر صریح ہے، کیا لاک نے ہم سے یہ نہیں کہا ہے کہ ہمارا تمام علم جس سے ماخوذ ہے۔ اس لیے کسی شے کے متعلق، ہمارا تمام علم محض اس کی حسوں اور اس سے ماخوذ تصورات پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایک شے محض ادراکات کا پلندہ ہوتی ہے، یعنی مرتب اور تعبیر شدہ حسوں کا۔ تم کہتے ہو کہ تمھارا ناشتہ ادراکات کے پلندے سے بہت زیادہ حقیقی ہے، اور یہ کہ وہ ہتوڑی جو تمھیں تمھارے انگوٹھے کے ذریعے سے نجاری سکھاتی ہے، نہایت ہی شاندار مادیت رکھتی ہے۔ اگر تم حواس نہ رکھتے تو ہتوڑی کا تمھارے لیے وجود ہی نہ ہوتا لیکن اولاً تمھارا ناشتہ بصارت بو اور حرارت کی حسوں کے علاوہ نہیں، پھر ذائقے اور پھر اندرونی آرام و حرارت کے علاوہ نہیں ہے۔ اسی طرح سے ہتوڑی رنگ قدوقامت شکل وزن لمس وغیرہ کی حسوں کا پلندہ ہے۔ اس کی حقیقت تمھارے لیے اس کی مادیت میں نہیں بلکہ ان حسوں کے اندر ہے جو تمھیں اپنے انگوٹھے سے ہوتی ہیں، اگر تم حواس نہ رکھتے تو ہتوڑی کا وجود تمھارے لیے ہوتا ہی نہیں۔ یہ تمھارے مردہ انگوٹھے پر اگر ہمیشہ بھی لگتا رہے تب بھی تم سے خفیف ترین توجہ حاصل نہیں کر سکتا یہ صرف حسوں یا یادوں کا پلندہ ہے۔ یہ ذہن کی ایک حالت ہے۔ ہر قسم کا مادہ جس حد تک ہم اس کو جانتے ہیں، ایک ذہنی حالت ہے، اور جس حقیقت کو ہم براہ راست جانتے ہیں وہ ذہن ہے۔

۲۸۱ مگر آیرستانی بشپ نے انگلستانی ارتیابی کا خیال نہ کیا تھا۔ ڈیوڈ ہیوم (۱۷۷۶-۱۷۱۱) نے چھبیس سال کے سن میں اپنے نہایت ہی بدعتی مقالۂ فطرت انسانی (Treatise on Human Nature) سے کل عالم عیسوی کو مبتلائے حیرت و استعجاب کر دیا جو جدید فلسفے کی مستند اور حیرت انگیز کارناموں میں سے ہے۔ ہیوم نے کہا کہ ہم ذہن کو اسی طرح سے جانتے ہیں جس طرح سے مادے کو جانتے ہیں یعنی صرف ادراک کے ذریعے سے جو اس صورت میں داخلی ہوتا ہے۔ ہمیں کسی ایسے مکمل وجود کا کبھی ادراک نہیں ہوتا جیسا کہ ذہن ہے۔ ہم کو صرف علیحدہ علیحدہ تصوروں یادوں اور احساسات وغیرہ کا ادراک ہوتا ہے۔

ذہن کوئی جوہر یا ایسا عضو نہیں ہے، جو تصورات رکھتا ہو۔ یہ تصورات کے سلسلوں کے لیے صرف ایک مجرد نام ہے اور ادراکات حافظے اور احساسات ہی ذہن ہیں۔ اعمال فکر کی تہ میں کوئی ایسی روح نہیں ہے جس کا مشاہدہ ہو سکتا ہو۔ نتیجہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہیوم نے ذہن کو اسی طرح سے قرار واقعی طور پر برباد کر دیا ہے جس طرح سے برکلے نے مادے کو برباد کر دیا تھا۔ کچھ باقی نہ رہا۔ اور فلسفہ اپنی بنائی ہوئی عمارتوں کے کھنڈروں میں رہ گیا۔ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے اگر کسی ظریف نے یہ کہہ کر بحث کے ختم کرنے کا مشورہ دیا ہو، "نہ مادے کا وجود ہے اور نہ ہی ذہن کا ہے"۔

لیکن ہیوم نے روح کے تصور کی تردید ہی پر بس نہ کی، اس نے قانون کے تصور کو مٹا کر حکمت کو بھی فنا کر دینا چاہا۔ برونو اور گلیلو کے زمانے سے حکمت اور فلسفہ دونوں قانون قدرت علت و معلول کے سلسلے میں "لزوم" کو بہت کچھ اہمیت دے رہے تھے۔ اسپی نوزا نے اپنی شاندار مابعد الطبیعیات کو اس مہتم بالشان تصور پر قائم کیا تھا۔ مگر ہیوم نے کہا دیکھو ہمیں علتوں یا قانونوں کا کبھی ادراک نہیں ہوتا۔ ہم کو حادثات اور تسلسلات کا ادراک ہوتا ہے اور ہم تعلیل و لزوم کا اس سے استنباط کرتے ہیں۔ قانون کوئی ابدی اور لازمی فیصلہ نہیں ہوتا جس کے مطابق واقعات ہوتے ہیں، بلکہ صرف ایک ذہنی خلاصہ یا ہمارے گوناگوں تجربات کا اختصار ہوتا ہے۔ ہمارے پاس اس امر کی کوئی ضمانت نہیں ہوتی کہ جن تسلسلات کا اب تک مشاہدہ ہوا ہے، وہ آیندہ تجربے میں بغیر کسی تغیر کے پھر ظاہر ہوں گے۔ قانون واقعات کے تسلسل کا ایک مشاہدے میں آیا ہوا دستور ہوتا ہے، لیکن دستور کے اندر کوئی لزوم نہیں ہوتا۔

صرف ریاضیاتی ضابطوں میں لزوم ہوتا ہے۔ صرف یہی اپنی فطرت کے اعتبار سے اٹل طور پر صحیح ہوتے ہیں۔ اور اس کی وجہ محض یہ ہے کہ اس قسم کے ضابطے تکرار محض ہیں یعنے محمول موضوع کے اندر پہلے سے موجود ہوتا ہے جیسے "۳ × ۳ = ۹" ہے۔ یہ صرف اس وجہ سے ابدی اور لازمی طور پر

حقیقت ہے کہ ۳ x ۳ اور ۹ ایک ہی چیز ہیں جن کو مختلف طور پہ ظاہر کیا گیا ہے۔ محمول موضوع میں کسی قسم کا اضافہ نہیں کرتا۔ لہٰذا حکمت کو ریاضیات اور براہِ راست اختبار تک خود کو محدود رکھنا چاہیئے۔ یہ قوانین سے غیر مصدقہ استخراجات پر بھروسا نہیں کر سکتا۔ ہمارا اکشرار تیابی لکھتا ہے کہ اگر ہم ان اصول پہ یقین کر کے کتب خانوں پہ نظر ڈالیں تو ہم کو کس قدر تباہی نہ پھیلانی پڑے گی۔ مثلاً اگر ہم اپنے ہاتھ میں مابعد الطبیعیات کی کوئی درسی کتاب لیں تو ہمیں یہ سوال کرنا چاہیئے کیا اس میں مقدار یا عدد کے متعلق کوئی مجرد استدلال ہے۔ نہیں۔ کیا اس میں واقعۂ نفس الامری اور وجود کے متعلق کوئی اختباری استدلال ہے۔ نہیں۔ تو پھر اس کو جلا ڈالو۔ کیونکہ اس میں دھوکا اور فریب کے سوائے کچھ بھی نہیں ہے۔ ۲۸۲

خیال کرو کہ راسخ العقیدہ لوگوں کے کانوں میں ان الفاظ نے کیسی کھلبلی مچائی ہوگی۔ یہاں پر علمیاتی روایت (یعنے علم کی ماہیت اس کے ذرائع اور اس صداقت کی تحقیق) مذہب کا سہارا نہ رہی۔ جس تلوار سے بشپ برکلے نے مادیت کے عفریت کو قتل کیا تھا وہ غیر مادی ذہن اور لافانی روح کی طرف پلٹ پڑی۔ اور کشمکش میں خود حکمت کو بھی سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کہ جب ۱۷۷۵ء میں کانٹ نے ہیوم کی تصانیف کا جرمن ترجمہ پڑھا تو وہ ان نتائج سے مبہوت ہو کر رہ گیا۔ اور جیسا کہ وہ کہتا ہے اس اعتقادی خواب خرگوش سے بیدار ہوا جس میں اس نے مذہب اور حکمت کی اساسیات کو بے چون و چرا تسلیم کر رکھا تھا۔ کیا حکمت اور مذہب دونوں کو تباہی کے حوالے کر دیا جائے؟ ان کے بچانے کے لیے کیا کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ روسو سے کانٹ کی طرف

روشن خیالی کے اس استدلال کا کہ عقل مادیت کی طرف لے جاتی ہے

برکلے نے اس طرح سے جواب دینے کی کوشش کی تھی کہ مادے کا وجود ہی نہیں ہے۔ مگر ہیوم نے اس کا یہ جواب دیا کہ جس طرح سے مادے کا وجود نہیں ہے اسی طرح سے ذہن کا بھی وجود نہیں ہے۔ ایک اور جواب ممکن تھا، اور وہ یہ کہ عقل کوئی قطعی معیار نہیں ہے۔ بعض فطری نتائج ایسے ہیں جن کے خلاف ہمارا کل وجود بغاوت کرتا ہے۔ ہمیں یہ فرض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے کہ اپنی فطرت کے ان مطالبات کا ایسی منطق کی فرمائش پر جو بہر حال ہمارے ایک کمزور اور پرفریب حصے کی حالیہ تعمیر ہے، گلا گھونٹ دینا چاہیے۔ ہماری جبلتیں اور احساسات کس قدر کثرت سے ان چھوٹے چھوٹے قیاسات کو پرے ڈھکیل دیتے ہیں، جو ہم سے ہندسی اشکال کی طرح سے عمل کرانے اور ریاضیاتی صحت کو دوست رکھنے کے طالب تھے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض اوقات (اور خصوصاً شہری زندگی کی عجیب و غریب پیچیدگیوں اور مصنوعی باتوں میں) عقل بہتر رہبر ہوتی ہے، مگر زندگی کے غیر معمولی نازک اوقات میں اور کردار و یقین کے بڑے مسائل میں ہم اپنی اشکال پر نہیں بلکہ اپنے احساسات پر بھروسا کرتے ہیں۔ اگر عقل مذہب کے خلاف ہے، تو عقل ہی کی خرابی ہے۔ ۲۸۳

علمی طور پر جین جیکس روسو (۱۷۱۲۔ ۱۷۷۸) کا یہی استدلال تھا، جو فرانس میں تقریباً تنہا نئی روشنی کی مادیت اور الحاد سے لڑا۔ ایک نازک اندام اور عصبی مزاج کے شخص کا مخزن العلومیوں کی مضبوط عقلیت اور تقریباً وحشیانہ لذتیت میں گھر جانا عجیب قسمت کی بات تھی۔ روسو ایک روگیلا نوجوان تھا، جو اپنی جسمانی کمزوری اور اپنے والدین اور اساتذہ کی بے مہری کی وجہ سے پژمردگی اور سوچ میں مبتلا رہا کرتا تھا۔ وہ حقیقت کی تکلیف سے بچ کر عالم رویا کے گرم گھر میں نکل آیا تھا، جہاں وہ کامیابیاں جو اس کو زندگی اور محبت میں حاصل نہ ہو سکتی تھیں، تخیل میں حاصل ہو رہی تھیں۔ اس کی کتاب اعترافات نہایت ہی مہذب وجدانیت اور شائستگی اور عزت کی کند حس کا ایسا مرکب ہے، جس کے اجزا میں ہم آہنگی نہیں ہے۔

اور اس سبب سے اس کی اخلاقی برتری کے بے داغ یقین کا پتا چلتا ہے۔
۱۷۴۹ء ڈیجون کی اکیڈیمی نے اس مسئلے پر بہترین مضمون کے لیے انعام کا اعلان کیا، کہ کیا علوم و فنون کی ترقی نے اخلاق کو خراب کیا ہے یا پاکیزہ۔ روسو کے مضمون نے انعام حاصل کیا۔ اس کا استدلال ہے کہ تہذیب اس قدر خیر نہیں ہے، جس قدر کہ شر ہے۔ اور اس کے اندر ایسے شخص کا پورا جوش اور اخلاص موجود تھا، جس نے یہ دیکھ کر کہ تہذیب و شائستگی اس کی دسترس سے باہر ہے، اس کو ناکارہ ثابت کرنا چاہا ہے۔ اس خوفناک ابتری پر غور کرو جو یورپ میں چھاپے سے پیدا ہو گئی ہے۔ جہاں کہیں فلسفہ پیدا ہوتا ہے قوم کی اخلاقی صحت معرض زوال میں آجاتی ہے۔ "خود فلاسفہ تک میں یہ بات
۲۸۴ ضرب المثل تھی، کہ جب سے ذی علم آدمی پیدا ہوئے ہیں ایماندار لوگ ملتے ہی نہیں"۔ "میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں حالت تفکر و تدبر فطرت کے خلاف ہے، اور ذی فکر انسان (جس کو اب ہمیں "عقلی" کہنا چاہیے) ایک خراب شدہ حیوان ہے"۔ بہتر ہے کہ ہم عقل کی ضرورت سے زیادہ سریع ترقی کو روک دیں اور اس کے بجائے قلب اور تاثرات کی تربیت کریں۔ تعلیم انسان کو نیک نہیں بناتی، یہ اس کو صرف ہوشیار بنا دیتی، اور پھر ہوشیاری عموماً برائی میں کام کرتی ہے۔ جبلت اور احساس عقل کے مقابلے میں زیادہ قابل اعتبار ہیں۔
اپنے مشہور ناول (la Nouvelle Heloise) (۱۷۶۱ء) روسو نے تفصیل کے ساتھ عقل پر احساس کی برتری کو ثابت کیا ہے۔ وجدانیت امرا کی خواتین اور بعض مردوں میں داخل فیشن ہو گئی۔ فرانس سو برس تک پہلے ادبی اور پھر حقیقی آنسو بہاتا رہا۔ اور اٹھارویں صدی میں یورپی عقل کی عظیم الشان تحریک کی جگہ رومانی اور جذبی ادب نے لے لی (۱۷۸۹ء۔ ۱۸۴۸ء)۔ اس موج کے ساتھ مذہبی احیا کا بھی نہایت ہی قوی احساس تھا۔ شاتو بریان کی (Genie du christianisme) کی مدہوشیاں، محض ساوویا ویکار کے اعتراف مذہب کی محض صدائے بازگشت تھیں جس کو روسو نے اپنی تعلیم کے عصر آفریں مضمون کے ساتھ شامل کر دیا تھا، جس کا نام

ایمیلے Emile ہے۔ اعتراف کا استدلال مختصراً یہ ہے کہ اگرچہ عقل خدا اور بقائے روح کے عقیدے کے خلاف ہو، مگر احساس نہایت شدت کے ساتھ ان کی تائید میں ہے۔ اس لیے ہم یہاں بنجر ارتیابیت میں پڑنے کے بجائے جبلت پر کیوں نہ بھروسا کرلیں۔

کانٹ نے جس وقت ایمیلے کو پڑھا، تو اس نے کتاب کو فوراً ختم کرنے کے لیے صنوبر کے درختوں کے نیچے اپنی روزانہ کی سیر کو ملتوی کر دیا۔ یہ بھی اس کی زندگی کا ایک یادگار واقعہ تھا، کہ اس کو ایک اور شخص ایسا مل گیا تھا جو الحاد کی تاریکی میں راستے کو ٹٹول ٹٹول کر باہر آنا چاہتا تھا، اور جو ان فوق الحسی معاملات میں نہایت جرأت کے ساتھ نظری عقل پر احساس کے مقدم ہونے کا مدعی تھا۔ کم از کم یہاں لامذہبی کے دوسرے نصف حصے کا تو جواب تھا۔ اب آخر کار تمام مضحکہ اور شک کرنے والے منتشر ہو جائیں گے۔ استدلال کے ان تاروں کو اکٹھا کر نا برکلے اور ہیوم کے تصورات کو روسو کے احساسات سے متحد کرنا، مذہب کو عقل اور اس کے ساتھ ہی حکمت کو ارتیابیت سے بچانا ایمینوئیل کانٹ کا مقصد تھا۔ ۲۸۵

لیکن ایمینوئیل کانٹ کون تھا؟

ف۲۔ خود کانٹ

وہ پروشیا میں بمقام کونگسبرگ ۱۷۲۴ء میں پیدا ہوا۔ قریب کے گاؤں میں کچھ دن معلمی کرنے کے علاوہ اس خاموش کوتاہ قامت پروفیسر نے جسے دور دراز ممالک کے جغرافیے اور رسم و رواج پر تقریر کرنے کا بہت شوق تھا کبھی اپنے شہر پیدائش کو نہیں چھوڑا۔ وہ ایک غریب خاندان سے تھا جس نے ایمینوئیل کی پیدائش سے تقریباً سو برس پہلے ترک وطن کیا تھا اس کی ماں (Pietist) (متقی) یعنے ایسے مذہبی فرقے کی فرد تھی جو انگلستان کے میتھوڈسٹوں کی طرح سے مذہبی اعمال و اعتقاد کی پوری شدت پر اصرار کرتے ہیں۔ ہمارا فلسفی

صبح سے شام تک مذہب میں اس قدر ڈوبا رہتا تھا کہ ایک طرف تو اس میں ایسا ردعمل ہوا جس کی بدولت بڑے ہو کر وہ تمام عمر گرجا نہ گیا، اور دوسری طرف اس پر جرمن پیورٹن مذہب کا آخر عمر تک اس قدر گہرا اثر رہا کہ جب بوڑھا ہوا تو اُسے اپنے اور دنیا کے لیے کم از کم مذہب کے لوازم کے محفوظ رکھنے کی نہایت ہی شدید خواہش پیدا ہوئی جس کا ماں کی طرف سے اس پر بہت گہرا اثر پڑا تھا۔

لیکن ایک نوجوان جو فریڈرک اور والٹیر کے عہد میں سن شعور کو پہنچا ہو، وہ خود کو زمانے کی ارتیابی رو سے نہیں بچا سکتا تھا۔ کانٹ ان لوگوں سے بھی بہت ہی متاثر ہوا، جن کی وہ بعد کو تردید کرنا چاہتا تھا، اور شاید سب سے زیادہ اپنے عزیز دشمن ہیوم سے۔ بعد کو ہم ایک فلسفی کے اپنے پختگی کے عہد کی تنگ خیالی سے تجاوز کرنے اور تقریباً آخری تصنیف اور ستر سال کی عمر میں ایسی شدید آزاد خیالی کی طرف لوٹنے کا حیرت انگیز منظر دیکھیں گے، جس کی بنا پر اگر اس کی شہرت اور زمانے نے حفاظت نہ کی ہوتی تو ضرور دار پر تشریف لے جانا پڑتا۔ مذہبی احیا کے کام میں بھی ہم حیرت انگیز کثرت سے ایک دوسرے کانٹ کی آواز سنتے ہیں جس پر والٹیر کا شبہ ہوتا ہے۔ شوپنہائر فریڈرک اعظم کے لیے یہ کچھ کم تعریف کی بات خیال نہیں کرتا کہ اس کے عہد حکومت میں کانٹ اپنا نشوونما اور انتقاد عقل کے چھاپنے کی جرأت کر سکا۔ کسی دوسری ۲۸۶
حکومت میں مشکل ہی سے ایک تنخواہ یاب پروفیسر (جو جرمنی میں ملازم سرکار ہوتا ہے) ایسی جرأت کرتا ہے۔ فریڈرک اعظم کے جانشین سے کانٹ یہ وعدہ کرنے پر مجبور ہوا کہ میں آیندہ کچھ نہ لکھوں گا۔ اس آزادی کی داد کے طور پر کانٹ نے انتقاد کو سیڈلٹز یعنی فریڈرک کے دوربین اور ترقی پسند وزیر تعلیم کے نام پر معنون کیا۔

۱۷۵۵ء کانٹ نے اپنا کام ایک غیر سرکاری لکچرار کی حیثیت سے جامعۂ کونگسبرگ میں شروع کیا۔ پندرہ برس تک وہ اس معمولی خدمت پر رہا۔ دوبار اس کی پروفیسری کی درخواست کو رد کیا گیا۔ آخر کار ۱۷۷۰ء میں

وہ منطق اور مابعد الطبیعیات کا پروفیسر بنا دیا گیا۔ سلی کے مدتوں کے تجربے کے بعد اس نے ایک کتاب تدریسیات پر لکھی جس کے متعلق کہ اس میں بہت سے اعلیٰ درجے کے اصول ہیں، جن میں سے اس نے ایک کو بھی کبھی استعمال نہیں کیا تھا۔ تاہم وہ مصنف کی نسبت معلم بہتر تھا۔ طالب علموں کی دو پشتیں اس کو عزیز رکھتی تھیں۔ اس کا ایک اصول یہ تھا کہ درمیانی قابلیت کے طالب علموں کی طرف زیادہ توجہ کرنی چاہیے۔ کیونکہ غبی لڑکوں کی مدد سے تو فائدہ نہیں اور ذہین اپنی مدد اپنے آپ کرلیں گے۔

کسی کو یہ توقع نہ تھی کہ یہ دنیا کو نئے مابعد الطبیعیاتی نظام سے چونکا دے گا۔ کسی شخص کو بھی چونکا دینا غالباً آخری جرم ہوتا، جس کا اس شرمیلے اور منکسر المزاج پروفیسر سے وقوع میں آنے کا امکان تھا۔ خود اس کو اس سلسلے میں کوئی توقع نہ تھی۔ بیالیس سال کی عمر میں اس نے لکھا کہ خوش قسمتی سے میں مابعد الطبیعیات کا عاشق ہوں، مگر میری محبوبہ نے ابھی تک میری طرف کوئی التفات نہیں کیا ہے۔ ان دنوں وہ مابعد الطبیعیات کو بحر بیکراں اور ایسے تاریک سمندر سے تشبیہ دیا کرتا تھا جس کا نہ کوئی ساحل ہے اور نہ جس میں کوئی روشنی کا مینارہ ہے، جہاں بہت سے فلسفی جہازوں کے برباد شدہ ٹکڑے بکھرے ہوئے ہیں۔ وہ ان مابعد الطبیعیاتیوں پر بھی حملہ کیا کرتا تھا جو نظریہ سازی کے اونچے گنبد پر رہتے ہیں جہاں عموماً ہوا بہت ہوتی ہے۔ وہ اس امر کی پیش بینی نہیں کرسکتا تھا کہ سب سے بڑا مابعد الطبیعیاتی طوفان خود اس کا اٹھایا ہوا ہوگا۔

اس خاموشی کے زمانے میں اس کو مابعد الطبیعیات سے نہیں بلکہ طبیعیات
سے دلچسپی تھی۔ وہ سیاروں زلزلوں آگ ہواؤں اثیر آتش فشانوں جغرافیے ۲۸۷
رسمیات اور اس قسم کی سیکڑوں دوسری چیزوں پر خامہ فرسائی کیا کرتا تھا جن کو مابعد الطبیعیات میں داخل نہیں سمجھا جاتا۔ اس کا نظریۂ سماوی (Theory of the Heavens) (۱۷۵۵ء) کوئی ایسی چیز پیش کرتا ہے، جو لاپلاس کے سحابی مفروضے کے بہت مشابہ ہے؛ اور اس میں ہر قسم سیاری حرکت اور ارتقا کی میکانیکی توجیہ کی کوشش کی گئی ہے۔ کانٹ کا خیال تھا کہ تمام سیارے

یا تو آباد رہ چکے ہیں یا آباد ہوں گے۔ اور جو سیارے سورج سے سب سے زیادہ دور ہیں، چونکہ ان کو نشو و نما کا سب سے طویل زمانہ ملتا ہے، وہ غالباً ذی عقل عضویوں اور ہم سے بلند نوع رکھتے ہیں جو اب تک ہمارے سیارے میں پیدا ہوئی ہے۔ اس کی انسانیات (جس کو اس کی زندگی بھر کی تقریروں سے ۱۷۹۸ء میں جمع کیا گیا ہے) اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ممکن ہے کہ انسان نے حیوان ہی کے درجے سے ترقی کی ہو۔ کانٹ کہتا ہے کہ اگر دنیا میں آنے پر انسانی بچہ قدیم ایام میں جب انسان زیادہ تر جنگلی جانوروں کے رحم و کرم پر تھا اس طرح سے چیختا جس طرح سے اب چیختا ہے تو اس کا جنگلی جانوروں کو پتا چل جاتا اور وہ اس کو کھا جایا کرتے۔ لہذا اغلب یہ ہے کہ ابتداً انسان اس سے بہت مختلف تھا جیسا کہ یہ اب تمدن کے دور میں ہو گیا ہے۔ اور پھر کانٹ نہایت ہی باریک بات کہتا ہے "کس طرح سے فطرت اس نشو و نما کو عمل میں لائی اور کن اسباب سے اس کو مدد ملی یہ ہم نہیں جانتے۔ یہ بات بہت ہی دور رس ہے۔ اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ آیا تاریخ کے موجودہ دور کے بعد کسی عظیم الشان طبیعی انقلاب کے موقع پر تیسرا دور شروع نہ ہو جائے گا، جب اورنگ اوٹانگ یا چمپنزی میں ایسے آلات پیدا ہو جائیں گے جو انسان کی مرتب ساخت میں چلنے چھونے اور بولنے کا کام دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ایک مرکزی عضو فہم کا پیدا نہ ہو جائے گا، اور رفتہ رفتہ تربیت اور معاشری معاہدے کے تحت ترقی نہ کر جائے گا۔ کیسا کانٹ بہ لحاظ احتیاط فعل مستقبل سے کام لے کر بالواسطہ طور پہ اس امر کے متعلق اپنا خیال ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ انسان نے درحقیقت حیوان سے ترقی کی ہے!

اس طرح سے ہم اس سادہ کوتاہ قامت انسان کی نشو و نما کو دیکھتے ہیں جس کا قد مشکل سے پانچ فٹ تھا اور جو شرمیلے اور منکسر المزاج ہونے کے باوجود اپنے دماغ میں جدید فلسفے میں نہایت ہی دور رس انقلاب رکھتا تھا، یا اس کے اندر اس کے انقلاب کی تخلیق کیا کرتا تھا۔ ایک سوانح نگار لکھتا ہے، کہ کانٹ کی زندگی باقاعدہ افعال میں سے بھی سب سے زیادہ باقاعدہ فعل کے مطابق

گزری ہے۔ ہائنے کہتا ہے، اٹھنے کافی پینے لکھنے درس دینے کھانے ٹہلنے میں سے ہر ایک کے مقررہ اوقات تھے۔ اور جب ایمینوئل کانٹ بھورا کوٹ پہنے ہوئے بید ہاتھ میں لیے ہوئے صنوبر کے درختوں کے چھوٹے سے کنج جس کو اب تک فلسفی کی تفرج گاہ کہتے ہیں، کی طرف ٹہلتا ہوا نکلتا تھا، تو پڑوسی جان لیتے تھے کہ اس وقت ٹھیک ساڑھے تین بجے ہیں۔ سیر کا یہ سلسلہ تمام موسموں میں جاری رہا جب مطلع ابر آلود ہوتا یا بارش کا اندیشہ ہوتا تو اس کا بوڑھا خادم لامپے اس کے پیچھے ایک بڑی چھتری بغل میں لیے ہوئے دور اندیشی کی علامت کے طور پر چلتا ہوا دکھائی دیتا۔

جسمانی اعتبار سے وہ اس قدر دبلا پتلا کمزور تھا کہ اسے اپنی غذا میں پرہیز کا خاص اہتمام رکھنا پڑتا تھا۔ اس کے نزدیک ڈاکٹر سے کام لینے کے بجائے یہ بہتر تھا۔ اس طرح سے وہ تقریباً اسی برس تک زندہ رہا۔ ستر برس کی عمر میں اس نے ذہن کی قوت پر ایک مضمون لکھا ہے کہ کس طرح سے یہ قوت عزم کے ذریعے سے بیماری کے احساس پر غالب آسکتی ہے۔ اس کا ایک پسندیدہ اصول یہ تھا کہ وہ صرف ناک سے سانس لیا کرتا تھا، خصوصاً جب گھر کے باہر ہوتا تھا۔ اس لیے خزاں بہار اور جاڑے میں وہ ٹہلنے کے وقت کسی کو اپنے سے بات چیت نہیں کرنے دیا کرتا تھا۔ وہ اپنی جرابوں کے اوپر رکھنے تک میں فلسفے سے کام لیا کرتا تھا، ان کو وہ فیتوں سے باندھے رکھتا تھا جو اس کے پاجامے کی جیبوں میں چلے جاتے تھے جہاں وہ اسپرنگوں پر ختم ہوتے تھے جو چھوٹی چھوٹی ڈبیوں میں رہتے تھے۔ وہ عمل کرنے سے پہلے ہر چیز پر بہت احتیاط سے غور کر لیا کرتا تھا" اسی لیے تمام عمر کنوارا رہا۔ دو مرتبہ اس نے شادی کرنی چاہی، لیکن غور و فکر میں اس نے اتنی دیر لگادی، کہ ایک صورت میں تو اس خاتون نے جن سے یہ حضرت شادی کرنے کا ارادہ رکھتے تھے زیادہ باہمت آدمی سے شادی کر لی، اور دوسری صورت میں اس سے پہلے کہ فلسفی کوئی فیصلہ کر سکے وہ کونگسبرگ سے چلی گئی۔ شاید نیٹشے کی طرح سے اس نے بھی یہ محسوس کیا کہ شادی تلاش حقیقت دیانتدارانہ مشغلے میں حائل ہو گی۔ ٹالے رینڈ کہا کرتا تھا کہ شادی شدہ آدمی روپے کی خاطر کام کر سکتا ہے۔ اور کانٹ نے